McGill University Library
3 103 289 622 8

[illegible]یاں میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز میری خلوت و انجمن کا گداز

یعنی

سلیم کے نام

خطوط

پرویز

جلد سوم

شائع کردہ
ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی-گلبرگ- لاہور

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷-بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

MH1 .P276sn
INSTITUTE
OF
ISLAMIC
STUDIES
50904 ★ v.3
McGILL
UNIVERSITY

مرے دیدۂ تر کی بیخوابیاں   مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز   مری خلوت و انجمن کا گداز

خطوط

سلیم کے نام

جلد سوم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میرے دیدۂ تر کی بیخوابیاں   میرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز   میری خلوت و انجمن کا گداز

یعنی

سلیم کے نام

خطوط

Salim ke nām

v. 3

پرویز

جلد سوم

شائع کردہ
ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔ گل برگ۔ لاہور

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷۔بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

Parvez

2630172
islm
v.3

اِنتساب

MH1
.P2769n
v.3

اُس کے نام

مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۲۶:۸۹)

جو اللہ (کے قانون) کی طرف قلبِ سلیم لے کر آئے۔

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مُشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

مشمولات صفحہ
فہرست مشمولات ۔ ۱
پیش آہنگ ۔ ذ

تیسواں خط

(علماء کون ہیں ؟) ۱
حکمت یونان ۱
تصوف ۲
قرآن کا چیلنج ۳
علم کی قرآنی تعریف ۴
سمع و بصر سے کام نہ لینے والے ۵
خدا کا ذکر کرنے والے ۷
کائنات میں آیات اللہ ۸
لقاء رب ۱۰
متقی کون ہے؟ ۱۲
سامان ربوبیت سے محرومی ۱۲
قرآنی صداقت کی شہادت ۱۴
علماء کون ہیں ؟ ۱۶
مشمولات صفحہ
ہمارے علماء ۱۸
ایک شبہ کا ازالہ ۲۱
حرف آخر ۲۳

اکتیسواں خط

(تصوف) ۲۴
فلسفہ تصوف کے مبادیات و خصائص ۲۵
یہودیت اور تصوف ۲۷
عیسائیت ، تصوف کی زد میں ۳۰
اسلام کا ظہور اور دعوت ۳۲
تصوف کے اقنوم ثلاثہ ۳۵
اسلام اور تصوف کی تاریخ ۳۶
علامہ اقبال کا ایک خط ۳۷
وحی کے علاوہ — الہام کا عقیدہ ۳۹
اسلام میں تصوف کا موسس — ابن عربی ۴۱
ابن عربی کا تجدد ۴۲
کرامات کی حقیقت ۴۸

50904

بتیسواں خط

(صوفیائے کرام) ۵۰
صوفیائے کرام کے ملفوظات ۵۱
''انیس الارواح'' سے چند مثالیں ۵۲
''دلیل العارفین'' کے حوالے سے ۵۷
''فوائدالسالکین'' سے اقتباسات ۵۷
''راحت القلوب'' میں سے ۵۹
''راحت المحبین'' پر ایک نظر ۶۴

تینتیسواں خط

(تصوف قرآن کی روشنی میں) ۶۸
علم کے ذرائع ۶۸
وحی ۶۹
ختم نبوت ۷۰
کشف و الہام کا تصور ۷۲
غیب کا علم ۷۳
خدا کو دیکھنا ۷۴
معرفت ۷۵
مرادیں پوری کرنا ۷۶
عصر سحر ۷۷
مردوں کی پرستش ۷۷
اولیاء اللہ ۷۸
کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے ۸۰
اجتماعی زندگی ۸۱
''وسیلہ'' کا مفہوم ۸۲
تمثیلات ۸۳
قرب خداوندی ۸۵
خدا سے محبت کا مفہوم ۸۸
کرامات ۹۱
انسانیت کو نقصانات ۹۴

چونتیسواں خط

(۱) انسانی فطرت کیا ہے ؟ ۱۰۰
(۲) اتفاقات کسے کہتے ہیں ؟
انسانی فطرت کی حقیقت ۱۰۳
ایک مکتب فکر کا خیال ۱۰۳
دوسرے مکتب خیال کی تحقیق ۱۰۴
تیسرے مکتب فکر کا نظریہ ۱۰۵
انسانی فطرت—قرآن کی روشنی میں ۱۰۷
''اتفاقات'' اور ''تقدیر'' ۱۲۰
عالم آفاق میں خدا کا قانون ۱۲۰
انسان—صاحب اختیار و ارادہ ۱۲۰

پینتیسواں خط

(انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما) ۱۲۸
انسان کی طبعی زندگی ۱۲۹
انسانی ذات کا نشو و ارتقاء ۱۳۰
''الدین'' کیا ہے ۱۳۳
''تقویٰ'' کا مفہوم ۱۳۴
''حسن عمل'' کی تعریف ۱۳۶
''خیر'' اور ''شر'' کی کیفیتیں ۱۳۷

چھتیسواں خط

(جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر) ۱۴۵
معاشرتی پابندیاں ۱۴۷

جنسی جذبہ پر پابندیاں ۱۴۸
وحی کی پابندیاں ۱۴۹
ان پابندیوں کی مصلحت ۱۴۹
علمائے مغرب کی تحقیقات ۱۵۱
ڈاکٹر انون کی تحقیق ۱۵۲
تین گروہ ۱۵۵
بہترین تمدن کی حامل قوم ۱۵۷
فرائڈ کی تحقیق ۱۵۷
قرآنی کظامت ۱۵۸
اضمحلال ۱۵۹
قرآنی حد بندی ۱۶۰
وحدت ازدواج ۱۶۱
عربوں کی تاریخ ۱۶۲
جنسیات میں الجھی ہوئی قوم ۱۶۴
ہمارا نوجوان طبقہ ۱۶۶
جنسی آزادی کا نتیجہ ۱۶۷
پس چہ باید کرد ۱۶۸
مرد اور عورت کی مساوی حیثیت ۱۶۸
ایک بنیادی حقیقت ۱۷۰
خیال کا دخل ۱۷۰
ضبط نفس ۱۷۱

سینتیسواں خط

(قوموں کے عروج و زوال کا ابدی قانون) ۱۷۳
سائنس آف ہسٹری ۱۷۳
قوموں کی موت ۱۷۴
ہیگل کا فلسفہ ۱۷۶
مارکس کا فلسفہ ۱۷۷
قرآن کا فلسفہ ۱۷۸
حیوانی سطح کی زندگی ۱۷۹
مترفین کا نظریۂ زندگی ۱۸۲
دولت سمیٹنے والے ۱۸۶
محض باتیں بنانے والے ۱۸۷
فنون لطیفہ ۱۸۹
جد و جہد سے جی چرانے والے ۱۹۰
استخلاف فی الارض ۱۹۱
ہر قوم کی اجل ۱۹۳
بقاء کا محکم اصول ۱۹۵
ہماری باز فرینی کی صورت ۱۹۶

اڑتیسواں خط

(.... فقط ایک بار دیکھا ہے) ۲۰۰
قرن اول کی تاریخ ۲۰۱
آزادی کیا ہے؟ ۲۰۳
آزادی کا قرآنی مفہوم ۲۰۴
رسول اللہ ؐ کا اسوۂ حسنہ ۲۰۵
حضرت زید رض کا واقعہ ۲۱۲
صدیق رض و فاروق رض کے دور میں ۲۱۷
اسکے بعد کیا ہوا؟ ۲۲۶
وہی نتائج پھر پیدا ہوسکتے ہیں ۲۲۷

انتالیسواں خط

(ہماری تاریخ) ۲۲۹
قرآن کا عطا فرمودہ ضابطۂ حیات ۲۲۹
تاریخ—قرآن فہمی میں روک ۲۳۰

تاریخ کی صحیح پوزیشن ۲۳۲
قرآن اور تاریخ کا باھمی تعلق ۲۳۳
قرآن کے غیر متبدل اصول ۲۳۴
اُمت کا فریضه ۲۳۴
صحابہؓ کے فضائل ۲۳۵
خلافت اور حضرت علیؓ ۲۳۸
سقیفه بنی ساعده کا اجتماع ۲۴۰
ایک حدیث—الائمة من قریش ۲۴۴
تاریخ کا ایک اور نقشه—معاذ الله ! ۲۴۶
بخاری کی حدیث؟ ۲۵۳
صحابه کا ارتدار؟ ۲۵۶
تاریخ دین بن گئی ۲۵۷
ایک اور عقیده—حدیث قرآن کو منسوخ کر دیتی ھے ۲۵۸
قرآن اور حدیث میں اختلاف ھوسکتا ھے؟ ۲۵۹
یه ھوا کیسے؟ ۲۶۲
رسول اللهؐ پر الزام؟ (معاذ الله) ۲۶۳
جھوٹ بولنا بھی جائز؟ ۲۶۵
حدیث سے اس کا ثبوت ؟ ۲۶۶
اسلام اور نظام سرمایه داری ۲۶۷
پس چه باید کرد؟ ۲۶۹

چالیسواں خط

(اسلامک آئیڈیالوجی کیا ھے؟) ۲۷۱
آئیڈیا لوجی کے معنی ۲۷۲
مذھب اور دین میں فرق ۲۷۲
قوانین خداوندی ۲۷۴
زندگی کے متعلق دو نظریے ۲۷۷
قرآنی نظریۂ زندگی ۲۷۸
اسلامی مملکت کا فریضه ۲۸۰
اطاعت صرف خدا کی ھو سکتی ھے ۲۸۱
مملکت—صفات خداوندی کی مظھر ۲۸۵
چند مستقل اقدار کا تعارف ۲۸۶

اکتالیسواں خط

(قرآن کا سیاسی نظام) ۲۹۸
حاکم و محکوم کی کشمکش ۲۹۹
خداوندی اختیارات کا عقیده ۳۰۰
جسکی لاٹھی اسکی بھینس ۳۰۱
نظریۂ میثاق ۳۰۱
اقتدار اعلیٰ ۳۰۲
جمھوری نظام ۳۰۲
جمھوری نظام کی ناکامی ۳۰۳
سب سے بڑی ناکامی ۳۰۵
یو - این - او کی تحقیق ۳۰۶
نیشنلزم کی تباه کاریاں ۳۰۸
حب الوطنی کا جذبه ۳۱۰
مفکرین مغرب کیسا نظام چاھتے ھیں؟ ۳۱۲
اس کا معیار کیا ھو؟ ۳۱۳
عیسائیت سے مایوسی ۳۱۵
منشور حقوق انسانیت ۳۱۷
مستقل اقدار کی تلاش ۳۱۸
(خدا نے کیا کہا؟)
انسان کیسا ھے؟ ۳۱۹
کسی انسان کو حکومت کا حق نہیں! ۳۲۰

خدا کی حکومت — کتاب اللہ کی رو سے ۳۲۱
زندہ اتھارٹی ۳۲۲
غیر متبدل اصول اور مشاورتی نظام ۳۲۴
رسول اللہؐ کی وفات کے بعد ۳۲۵
اسلامی جمہوریت اور اس کی ضمانت ۳۲۶
کلمۂ شہادت کے معنی ۳۲۷
مستقل قرآنی اقدار کی تفصیل ۳۲۸
عالمگیر نظام ۳۳۲
اقتدار واحد ۳۳۳
یہی ''توحید'' سے مطلب ہے ۳۳۴

بیالیسواں خط

(اسلام آگے کیوں نہ چلا؟) ۳۳۹
اسلام کسے کہتے ہیں؟ ۳۴۰
حق و باطل کی کشمکش ۳۴۱
حق ہمیشہ غالب رہتا ہے ۳۴۲
اسکی رفتار سست ضرور ہوتی ہے ۳۴۳
یہ رفتار تیز کی جا سکتی ہے ۳۴۵
اسلام کا ظہور ۳۴۷
قوانین خداوندی کی تیز رفتاری ۳۴۷
پھر وہی آہستہ خرامی ۳۴۸
قرن اول کے مسلمانوں میں فرق مدارج ۳۵۰
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۳۵۳
یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟ ۳۵۵
حضرت عمرؓ کی بے وقت شہادت ۳۵۶
عجمی سازش ۳۵۹
انسانی ذہن نے اسلامی حقائق کو اپنایا کیوں نہ؟ ۳۶۳
حیرت انگیز انقلاب ۳۶۹
ذہن انسانی کو بلند کیا جا سکتا ہے ۳۷۲
ہنگامی انقلاب سے فائدہ کیا؟ ۳۷۲
اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟ ۳۷۳
اس کا ثبوت — کہ اسلام آگے بڑھ رہا ہے ۳۷۴
نگہ باز گشت ۳۷۷
اسلام اور مسلمان قوم کا فرق ۳۷۸

تینتالیسواں خط

(فرائض رسالت — بسلسلہ اسلام آگے کیوں نہ چلا؟) ۳۸۶
نبی اور رسول ۳۸۷
نبوت اور تصوف ۳۸۸
دین میں زبردستی نہیں ۳۹۱
جماعت کی تشکیل ۳۹۲
مملکت کی تشکیل ۳۹۳
صدر مملکت ۳۹۴
باہمی مشاورت — اجتہادی غلطیاں ۳۹۷
خدائی اختیارات میں دخل نہیں ۳۹۹
رسول اللہؐ کے بعد ۴۰۱
دور ملوکیت میں ۴۰۴
پس چہ باید کرد ۴۰۶

چوالیسواں خط

(ضبط ولادت) ۴۰۷
اس باب میں دو مذہبی گروہ اور ان کی رائے ۴۰۸
اعتراضات اور ان کا جواب ۴۱۰
قرآن کریم کی راہنمائی کیا ہے؟ ۴۱۶
ذرائع کیا اختیار کئے جائیں؟ ۴۱۸
کیا جنسی جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے؟ ۴۱۸
جنسی اختلاط کا جواز اور عدم جواز ۴۱۹
ایک اور سوال اور اس کا جواب ۴۲۳
قرآنی تصور سے روگردانی اور اس کا نتیجہ ۴۲۷
ڈاکٹر انون کی رائے ۴۲۹
خلاصۂ مبحث

طبع کردہ:۔ المیزان پرنٹنگ پریس ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور- زیر نگرانی نظر علی شاہ مینجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

پیش آہنگ

''سلیم کے نام خطوط'' کا تفصیلی تعرف ، اس سلسلۂ زریں کی پہلی کڑی (جلد اول) میں کرایا جا چکا ہے - اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں - جلد اول سترہ خطوط پر مشتمل تھی اور جلد دوم بارہ پر - زیرنظر جلد (سوم) میں پندرہ خطوط ہیں - اس طرح ، اس سلسلہ میں اگست ۱۹۶۰ء تک کے خطوط آ گئے ہیں - ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر اس پورے سلسلہ کو قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو پڑھا دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کے وہ تمام شکوک رفع ہو جائیں گے جو اسلام کے متعلق مروجہ (غلط) نظریات کی وجہ سے ن کے قلب و دماغ کے لئے وجۂ صد اضطراب بن جاتے ہیں بلکہ اس دین کا صحیح تصور بھی ان کے سامنے اجاگر ہو جائے گا جس میں اقوام عالم کی مشکلات کا حل موجود ہے - ان خطوط کا سلسلہ کوئی بیس سال اُدھر شروع ہوا تھا - اس عرصہ میں انہوں نے ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و نگاہ میں جو حسین انقلاب پیدا کیا ہے اس کی زندہ شہادت وہ بے شمار سعادت مند نوجوان ہیں جو مغربی دہریت اور روسی کمیونزم کے آغوش سے نکل کر دین خداندی کے شیدائی بن چکے ہیں - جوں جوں ان خطوط کی اشاعت کا دائرہ وسیع ہوتا جائیگا اس حلقہ میں بھی وسعت پیدا ہرتی جائیگی - و ذالک ہو الفوز العظیم-

(۲) زیر نظر جلد میں خطوط کی ترتیب ، پہلے سے طے کردہ پروگرام کے مطابق عمل میں آئی ہے ، بجز دو خطوط کے . یعنی چونتیسواں خط (انسانی فطرت

کیا ہے) دوسری جلد میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا - اور چوالیسواں خط (ضبط ولادت) جسے چھتیسویں خط کے بعد آنا چاہئے تھا ، آخر میں درج کیا گیا ہے - یہ اس لئے کہ یہ خط شائع ہی جولائی ۱۹۶۰ء میں ہؤا تھا - ان خطوط کے شروع میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے -

(۳) اس جلد کے ابتدائی اسّی صفحات سفید کاغذ پر چھپ چکے تھے کہ مزید کاغذ کی دستیابی میں دشواری ہوگئی اس لئے بقایا حصہ دوسری قسم کے کاغذ پر طبع کرنا پڑا - اس کے لئے ہم قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہیں - اس کا ''کفارہ'' قیمت میں رعایت سے ادا کرنیکی کوشش کی گئی ہے - جلد اول قریب چارسو صفحات پر مشتمل تھی اور قیمت آٹھ روپے تھی - جلد دوم کی ضخامت قریب ساڑھے تین سو صفحات تھی اور قیمت چھ روپے - زیر نظر جلد ۴۳۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن اس کی قیمت چھ روپے ہی مقرر کی گئی ہے -

(۴) ان خطوط کی اشاعت سے فارغ ہو جانے کے بعد ہمارے سامنے محترم پرویز صاحب کے مجموعۂ مضامین ''فردوس گم گشتہ'' کے جدید ایڈیشن کی طباعت کا پروگرام ہے - یہ مجموعہ مدت ہوئی شائع ہوا تھا اور اب عرصہ سے نایاب ہے - صاحب مضامین نے ان پر نظر ثانی کی ہے جس سے ان میں ایک نیا رنگ پیدا ہوگیا ہے - نیز ان میں ، متعدد مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے - ہمیں امید ہے کہ ہم اس اہم تالیف کو بہت جلد منتظرین تک پہنچانے کا انتظام کرسکینگے - وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم -

والسلام

اگست ۱۹۶۰ء

ناظم ادارہ طلوع اسلام
بی/۲۵ - گلبرگ - لاہور -

تیسواں خط

علماء کون ہیں؟

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ علم وجۂ شرفِ انسانیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ علم کہتے کسے ہیں اور علماء کون ہیں؟ قرآن نے اس سوال کا جواب بڑا جامع اور مفصل دیا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں۔ انہیں غور سے سننا۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے اس سے تم واقف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک انسانیت کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آچکی ہے اس میں علم و حکمت کی داستان کا آغاز ہی درسگاہِ یونان سے ہوتا ہے۔ ان میں سقراط (Socrates) کو ابوالاباء اور افلاطون (Plato) کو اس کے بہترین شارح، اور بجائے خویش ایک مکتبِ فکر کے موسّس کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سقراط صرف انسان کو قابلِ مطالعہ سمجھتا ہے۔ کائنات کو نہیں۔ (Know Thyself) اس کے فلسفہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ افلاطون عالمِ محسوس کے وجود پر ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس (Concrete) دکھائی دیتی ہے اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ مثال (World of Ideas) میں ہے اور یہ مرئی (Visible) کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے۔ لہذا اس کائنات کے متعلق جو علم، حواس (Senses) کے ذریعے

تصوف

حاصل کیا جائے یعنی (Perceptual Knowledge) ۔ وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں ۔ یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالمِ تصور میں حاصل کیا جائے ۔ افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی ۔ اس نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی ۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے ۔ یہ سب برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے ۔ یہ ایشور کی لیلا ہے ۔ یعنی ناٹک کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے ۔ نہ بادشاہ، بادشاہ ہوتا ہے ۔ نہ غلام، غلام ۔ نہ دریا، دریا ہوتا ہے ۔ نہ پہاڑ، پہاڑ ۔ یہ سب فریب نگاہ ہوتا ہے ۔ اسی بناء پر ہندو فلسفہ میں خدا کو ”نٹ راجن“ کہا جاتا ہے ۔ یعنی نٹوں (ایکٹروں ۔ کھلاڑیوں) کا بادشاہ ۔ اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کہ کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی نقطۂ نگاہ (Negative Attitude) پیدا ہو جائے ۔ یہی منفیانہ انداز نگاہ تھا جس نے ”خدا پرست“ انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابل نفرت بنا دیا ۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوف کے راستے مسلمانوں میں بھی آ گیا اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر (اور مسموم) کر گیا ۔ ہمارے تصوف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔ کبھی سقراط کے اتباع میں یہ کہا جاتا ہے کہ

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سر و سمن درا
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا (بیدل)

اور کبھی افلاطون کے تتبع میں یہ کہ

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا قابلِ نفرت سمجھی جانے لگی ۔ (یہ الگ موضوع ہے ۔ جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں)

بہر حال سلیم ! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں ۔ یہ محض فریب تخیل ہے ۔ سراب ہے ۔ سایہ ہے ۔ وہم ہے ۔ گمان ہے ۔ اور جب کائنات وہم و فریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی ، در حقیقت علم نہیں ، ظن و گمان ہے ۔ قرآن آیا اور اس نے (ہر باطل تصور کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں ۔

قرآن کا چیلنج

اس نے تصوف اور ویدانت کے نظر فریب تخیلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا ۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ یہ ان لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں ۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں ۔ (اور دنیا کو باطل اور قابل نفرت ٹھرا دیں) تو ان کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں ۔ تم نے غور کیا سلیم ! کہ قرآن نے ایک آیت میں صدیوں کے غلط تصور کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا ۔ اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے؟ پھر اس پر بھی غور کرو کہ قرآن نے ، کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصور رکھنے والوں کو کافر کہہ کر پکارا ہے ۔ تم نے سوچا کہ قرآن کی رو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں؟ اور کافر و مومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ انداز نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی مزرعِ ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے ۔ تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؟ کائنات کے متعلق منفیانہ انداز نگاہ کا مظہر مسلک خانقاہیت ہے ۔ اسی کو ویدانت اور تصوف کہتے ہیں ۔ تم اس مسلک کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس راستہ میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائی ہیں اور صبر طلب ریاضتیں کیں ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا کہ انسان کی عمرانی زندگی کی ہری بھری شاخیں جھلس کو رہ گئیں ۔

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلان جنگ۔ اس کے بعد مثبتانہ انداز میں کہا کہ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ کائنات حقیقت پر مبنی (Real) ہے، فریب تخیل نہیں۔ یہ یکسر تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، تخریبی نتائج کے لئے نہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹/۴۴) اس انکشافِ حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے علم و آگہی کی بہت بڑی نشاں ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھو سلیم! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا تھا۔ زیر نظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے۔ دیکھا تم نے سلیم! کہ قرآن کس طرح اپنے مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

کائنات کو ”ایشور کی لیلا“ قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا لٰعِبِیْنَ (۴۴/۳۸) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیق کائنات ایک نہایت اہم (Serious) پروگرام کا جزو ہے، کھیل تماشہ نہیں۔ اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اس دعوٰی کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و برہان کی رو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے؟ قرآن اپنے ہر دعوٰی کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا اور فکر و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۱۰/۵) ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ سنو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ یاد رکھو! جس بات کا تمہیں علم نہ

ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں - لیکن اس کے بعد کے چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف (Definition) دیدی ہے جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے - فرمایا اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷/۳۶) یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فواد ہر ایک پر ذمہ داری عائید ہوتی ہے۔ تم نے سمجھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن سمع (سننے) اور بصر (دیکھنے) کو انسانی حواس (Senses) کے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور فواد وہ چیز ہے جسے دور حاضر کی اصطلاح میں (Mind) کہا جاتا ہے - انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات (Datta) فراہم کر کے انسانی فواد (Mind) تک پہنچاتے ہیں اور فود ان سے استنباط نتائج کرتا ہے - تم کارتوس کی آواز سنتے ہو تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہو کہ کسی نے بندوق چلائی - اس کے بعد چیخ کی آواز سنتے ہو تو سمجھ لیے ہو کہ کسی کے گولی لگ گئی - اور باہر جا کر دیکھتے ہو کہ جسے گولی لگی ہے وہ تمہارا دوست ہے تو گولی چلانے والے کے خلاف تمہارے دل میں آتش انتقام بھڑک اٹھتی ہے - اس تمام واقعہ میں تمہارے سمع و بصر و فواد کی شہادت موجود ہے - لہذا یہ علم ہے - لیکن اگر تم نہ بندوق کی آواز سنو، نہ کسی کی چیخ - نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھو، نہ کسی گولی چلانے والے کو - اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جاؤ تو تمارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا - کیونکہ اس میں تمہارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں - تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن علم کے بارے میں حواس (Sense Perception) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے؟ یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے - اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے - افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا - قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی ہی نہیں لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فواد بھی - سمع و بصر و قلب کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ھیں - اتنا ھی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ھے - سورۂ اعراف میں ھے وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ - جن و انس (شہری اور صحرائی آبادیوں) میں اکثر وہ لوگ ھیں جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ھیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ھے - لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا - ان کی روش یہ ھے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ھیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے - وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا - وہ آنکھیں رکھتے ھیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے - وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا - وہ کان رکھتے ھیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے - أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ - یہ انسان نہیں، حیوان ھیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ - أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷/۱۷۹) یہ علم و حقیقت سے بے خبر ھوتے ھیں - اس سے بھی واضح ھے کہ علم وھی علم ھے جس کی شہادت سمع و بصر و قلب دیں - ظاھر ھے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث (Theoretical Problems) کے متعلق نہیں ھو سکتا - کیونکہ ایسے امور میں 'سمع و بصر' کا کوئی واسطہ ھی نہیں ھوتا - سمع و بصر کا تعلق مظاھر فطرت کے مشاھدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ھے - یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا - اس عظیم القدر اور محیرالعقول مشینری کے ایک ایک پرزے کا مشاھدہ کرنا - پھر مختلف تجربات کی رو سے یہ دیکھنا کہ ان پرزوں کی ساخت و پرداخت میں کونسا قانون اور ان کی نقل و حرکت میں کونسی اسکیم کار فرما ھے - اسی کو دور حاضرہ کی اصطلاح میں علم سائنس (Scientific Knowledge) کہتے ھیں - اور اسی کو قرآن مومنین کا شعار بتاتا ھے - غور کرو سلیم! کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ھے - سورۂ آل عمران میں ھے إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ - یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبان عقل و شعور کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ھیں - (یہاں ایک بات کا ضمناً سمجھ لینا ضروری ھے - ایک چیز تو ھے

کائنات کا عدم سے وجود میں آنا۔ اسے قرآن نے بدع اور فطر سے تعبیر کیا ھے۔ اور دوسری چیز ھے موجودہ عناصر میں مختلف تراکیب و تناسب سے مختلف چیزیں بناتے چلے جانا۔ اسے عام طور پر تخلیق کہا گیا ھے۔ خلق کے معنی صحیح صحیح تناسب کے ھیں۔ بنابریں تخلیق ارض و سما سے مفہوم یہ ھے کہ کائنات میں مختلف عناصر میں تراکیب نو سے جو مختلف تغیرات رونما ھوتے ھیں اور نئی نئی چیزیں ظہور میں آتی ھیں ان پر غور و فکر کرنے سے کائناتی پروگرام اور قانون فطرت کی بڑی بڑی عظیم نشانیاں سامنے آجاتی ھیں۔ میں نے اس تشریح کو اسلئے ضروری سمجھا ھے کہ انسانی فکر کچھ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی۔ یہ وہ مقام ھے جو فکر انسانی کی حدود سے ماورا ھے۔ لہذا قرآن نے اس مقام کے متعلق فکر و تدبر کی دعوت نہیں دی۔ فکر و تدبر کا مقام وھاں سے شروع ھوتا ھے جہاں اس محسوس کائنات کے تغیرات اور حوادث ھمارے مشاھدہ میں آتے ھیں۔

خدا کا ذکر کرنے والے

بہر حال) قرآن نے کہا یہ ھے کہ تخلیق ارض و سماء اور اختلاف لیل و نہار میں ارباب دانش و بینش کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ھیں۔ کن ارباب دانش کے لئے؟ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ ۔ ان کے لئے جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ھر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ھیں۔ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یعنی تخلیقِ ارض و سماء میں غور و فکر کرتے رھتے ھیں۔ اور اپنے مشاھدات و تجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ھیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔ اے ھمارے نشو و نما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔ غور کیا سلیم! کہ یہ کتنی بڑی بات ھے جو قرآن نے کہی ھے۔ قرآن کا یہ دعوٰی ھے کہ کائنات کی کوئی شے نہ عبث و بیکار ھے اور نہ محض تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ھے۔ ھر شے ایک متعین مقصد رکھتی ھے اور نوع انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ھے۔ لیکن قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ ھم اس کے اس دعوٰی کو یونہی مانتے رھیں۔ وہ کہتا ھے کہ تمہارا فریضہ ھے کہ تم کائنات کی ایک

ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہدات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ سوچو سلیم! یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جو قرآن نے جماعتِ مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے قرآن کو ماننے والوں کا فریضہ (غور کرو کہ اس کے لئے کس وسیع اور عمیق سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کتنی بڑی بڑی معمل (Laboratories) درکار ہیں)۔ سُبْحٰنَكَ۔ تو اس سے بہت دور ہے کہ کسی شے کو محض تخریب کے لئے پیدا کر دے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بہت بعید ہے۔ یہ تو ہماری کم علمی اور سائینٹفک تحقیقات کا فقدان ہے جو ہم ان کے ’نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر، فلہذا ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان کی تحقیقات کی توفیق عطا فرما تا کہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات (Researches) سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں وہ تسخیر فطرت نہیں کرسکتیں۔ لہذا دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ۔ اور پھر ان ظالمین کا دنیا میں کوئی یارو مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ (۳/۱۹۱) تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اس ایک آیت میں کتنی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ بہر حال بات یہ ہورہی تھی کہ قرآن کی رو سے امتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں۔ اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جائیں۔ اسی کو قرآن نے ذکروفکر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا اور ان میں ہر آن غوروتدبر کرتے رہنا۔ یہی مومنین کا شعار تھا۔ إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۵/۳) مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیات خداوندی بکھری پڑی ہیں۔ انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵/۴)۔

کائنات میں آیات اللہ

اور خود تمہاری تخلیق اور دوسرے حیوانات کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ھیں جو قانون خداوندی پر پورا پورا یقین رکھتے ھیں۔ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴۵/۵) اور رات اور دن کی گردش میں اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ھے اور ھر جاندار کے لئے اپنے اندر نشوونما کا سامان رکھتی ھے اور جو زمین مردہ کو از سر نو زندگی عطا کرتی ھے۔ اور ان ھواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں کو چلتی ھیں۔ ان تمام مظاھر فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ھیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ھے۔ ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد قرآن ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ھے جس سے بیک وقت حیرت و بصیرت پیدا ھو جاتی ھے۔ فرمایا تِلْکَ آیَاتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ۔ یہ وہ آیات ھیں جنہیں ھم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رھے ھیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ (۴۵/۶) سو جو لوگ قوانین خداوندی پر غور و فکر اور اٰیات الٰہیہ کے مشاھدہ اور مطالعہ کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کون سی حقیقت ایسی آئیگی جس کی رو سے وہ خدا پر ایمان لائینگے؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ھے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاھر فطرت کا مشاھدہ اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ھوتا تو پھر کوئی اور حقیقت ایسی نہیں رہ جاتی جس سے اسے ایمان نصیب ھو سکے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن مشاھدۂ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ھے؟ وہ کہتا ھے کہ صحیح اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ھی اس سے ھوتا ھے۔ اس سے "خدا بے نقاب ھو کر سامنے آجاتا ھے"۔

میں نے جو یہ کہا ھے کہ اس سے خدا بے نقاب ھو کر سامنے آجاتا ھے، تو یہ محض شاعری نہیں کی۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ھے۔ ایک آیت کا نہیں۔ متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ھوئی ھے۔ ذرا کان کھول کر سنو اور سوچو کہ قرآن نے چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ھے۔

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہوسکتی ہے؟ احکام خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے خدا مل جائے۔

لقاءِ رب

اس کی اپنے رب سے ملاقات ہو جائے۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے۔ سورہ رعد میں ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا، اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کرّوں کو فضا کی بلندیوں میں، بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے، اس حسن و خوبی سے اٹھا رکھا ہے۔ ضمناً اس آیت میں تَرَوْنَھَا کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ کرّے اس فضا میں ''ستونوں،، کے سہارے قائم ہیں۔ لیکن وہ ستون ایسے نہیں جو تمہیں دکھائی دے سکیں۔ وہ (Visible) نہیں ہیں۔ یہ ستون وہ کشش ثقل و انجذاب ہے جس سے یہ کرّے اس طرح فضا میں معلق ہیں اور کشش کی قوت ایسی چیز نہیں جو آنکھوں سے دکھائی دے سکے۔ اس ضمنی تشریح کے بعد پھر اصل آیت کی طرف آؤ۔ اس کا بقایا حصہ یہ ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی۔ اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرر کردہ راستوں پر ایک وقت معین تک کے لئے بلا چون و چرا چلے جا رہے ہیں۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسن تدابیر سے چلائے جا رہا ہے۔ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ (۱۳/۲) تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کر سکو۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظام کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آ جائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے۔ کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظام کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا

انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلہ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اسطرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے جو خدا کے نظام ربوبیت کو سطح بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لوگے کہ اس کا قانون رب العالمینی کس طرح کائنات کی نشو و نما کئے جارہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لوگے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں آسکتا۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ ($\frac{٦}{١٠٣}$) انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے ”لقاء رب،، کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آسکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدے سے خدا کا نظام ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجاتا ہے اور وہ اس کی رب العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت واضح ہے کہ، قرآن کی رو سے ’لقاء رب، کا یقین انہی کو آسکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں۔ لیکن اس کے لئے بڑی جد و جہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کبھی بحر اطلانطک کی گہرائیوں میں اترنا۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے اور کبھی قطب شمالی کے برف پوش میدانوں میں ٹھٹھرنا۔ کبھی شیروں کے منہہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔ کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں وقف فکر و تدبر رہنا پڑتا ہے اور کبھی ایک جرثومہ کی تشریح میں برسوں محو مطالعہ و مشاہدہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ وہی قومیں کرسکتی ہیں جو حاضر و موجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے اِنَّ فِیْ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّہَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ یقیناً دن اور رات کی گردش

متّقی کون ہے؟

اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔ (ضمناً تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا نے متقیوں کی کیا علامت بتائی ہے؟)۔ اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ اس کے برعکس جو لوگ ''ہماری ملاقات،، کی توقع نہیں رکھتے۔ جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی۔ یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفاد، حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا اور جو کچھ سامنے پڑا ہو اسی پرمطئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۱۰/۸-۶) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔

پہلے تو اس بات پر غور کرو سلیم! کہ قرآن کریم نے وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اور وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ دنیا میں قوموں کی نکبت و زبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں جو اس پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں جو انہیں آسانی سے میسر آ رہا ہو وہ ندرت فکر اور قوت عمل سے محروم ہو کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں بلکہ مسلسل محنت و مشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں وہ مصاف زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظام ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی قوتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامان ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔

سامان ربوبیت سے محرومی

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ جو لوگ ان آیات خداوندی اور ملاقات ربی سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامان

نشوو ارتقاء سے محروم رہ جاتے ھیں۔ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ($\frac{۲۹}{۲۳}$) یعنی یہ لوگ ایک درد انگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ھیں۔ تم نے دیکھا سلیم! خدا کے سامان رحمت وربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذاب الیم کہا ھے۔ اسی کو سورہ آل عمران اور سورۂ یونس میں عذاب نار سے تعبیر کیا گیا ھے ($\frac{۳}{۱۹۱}$-$\frac{۱۰}{۸}$)۔ (یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ھیں)۔ ذرا سوچو! کہ حجاز کے بے برگ وگیاہ صحرا کے نیچے ذھب سیال (Liquid Gold) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہ رہے تھے لیکن چونکہ وہ لوگ حاضر وموجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نان شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا (قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ھے۔ فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ ($\frac{۱۶}{۱۱۲}$)۔ اب اقوام مغرب کی نگہہ خاراشگاف نے پگھلے ھوئے سونے کے ان دریاؤں کا سراغ پا لیا اور اپنی مسلسل کوہ کنی سے انہیں کھینچ کر باھر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود ھمارے خطہ زمین پاکستان میں فطرت نے ممکنات (Potentialities) کی ایک دنیا چھپا رکھی ھے۔ لیکن ھم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ھیں اور میسرہ (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ھو جائے) پرشاکر و قانع، اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ھیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ھے۔ لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ پیدا کرتے ھیں کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامان زیست بھیجتے ھیں۔ اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانوں کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مصروف سعی و عمل رہتے ھیں۔ ھم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ھے۔ اس لئے ھم پر ھماری معیشت تنگ ھو رہی ھے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا ($\frac{۲۰}{۱۲۴}$)۔ یہ خدا کا کھلا ھوا فیصلہ ھے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا۔ حتّٰی کہ مدت دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ھے کہ ھماری یہ صلاحیتیں ھی سلب ھو چکی ھیں۔ اور ھمارا شمار ان لوگوں میں ھو چکا ھے جن کے متعلق ارشاد ھے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَسَمْعِھِمْ

وَاَبْصَارِھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغَافِلُوْنَ (۱۶/۱۰۸) یه وه لوگ ھیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پر مہریں لگ چکی ھیں۔ یه لوگ ھماری آیات سے بالکل بے خبر ھیں۔

بعض کے نزدیک ''لِقَاءِ رب'' سے مراد یه ھے که انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے خدا کے سامنے جائے گا۔ اگرچه سیاق و سباق کے پیش نظر یه مفہوم زیاده موزوں نہیں۔ لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یه حقیقت اپنی جگه پر رھتی ھے که قرآن کی رو سے اس ''لقاء رب'' کے یقین کے لئے کائنات میں آیات الله کا مشاھده اور مطالعه ضروری ھے۔

تو نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ھے که

(۱) علم وھی علم ھے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے۔

(۲) حواس سے کام لینے سے مفہوم یه ھے که انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض سے پرده کشائی کرے۔ اشیائے فطرت کا وسیع مشاھده کرے۔ قوانین فطرت کا گہرا مطالعه کرے اور مسلسل تجربات اور پیہم تگ و تاز سے خدا کے نظام و قوانیز ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(۳) قوم مومنین کا یہی شعار ھے۔ گروه متقین کا یہی فریضه ھے۔ یہی خدا کا ذکر ھے۔ اس فکر سے چھپی ھوئی حقیقتیں ابھر کر سامنے آ جاتی ھیں۔ اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علیٰ وجه البصیرت که سکتا ھے که رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا۔

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ھی نہیں بلکه الله تعالیٰ نے بتا دیا ھے که خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی انہی کائناتی آیات سے ملتی ھے۔ سورۃ حٰم سجده میں ھے سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ ھم انہیں اپنی آیات عالم آفاق اور عالم انفس میں دکھائیں گے۔ تا آنکه یه بات ان کے سامنے ابھر کر آ جائے که قرآن فی الواقعه ایک حقیقت ثابته ھے۔ یعنی زمانے کے پیچ و خم میں لپٹے ھوئے حقائق

جوں جوں انسانی علم و کاوش کے ھاتھوں کھلتے جائیں گے قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاھدات فطرت اور علوم سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا قرآنی حقائق بے نقاب ھوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (انفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضع کر دیا کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعیات (Physics) ھی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ھیں وہ بھی اس کے دائرے کے اندر آ جاتے ھیں۔ لیکن ان علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاھدات اور تجارب کی رُو سے کی جائے گی۔ تاریخ، عمرانیات (Sociology) اور عملی سائیکالوجی کو اس باب میں خاص اھمیت حاصل ھوگی۔ طبیعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی رُو سے جوں جوں حقائق بے نقاب ھوتے جائیں گے قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ قرآن اس خدا کی کتاب ھے جس کی نگاھوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ھر شے بے نقاب رکھی ھے۔ وہ ھر شے کا ھر وقت مشاھدہ کرتا رھتا ھے۔ اور یہ اس امر کی کافی دلیل ھے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا ٹھیک ٹھیک کہے گا۔ اس کا بیان علم و حقیقت پر مبنی ھوگا، ظن و قیاس پر نہیں۔ اس لئے کہ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۵/۱) قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ھوا ھے جو کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف ھے۔ لیکن جو لوگ کائنات کی ان آیات سے بے خبر رھتے ھیں انہیں در حقیقت لقاء رب کا یقین نہیں ھوتا۔ اَلَآ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ۔ حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں تو انہیں خدا کا قانون ربوبیت جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے۔ اس لئے کہ اَلَآ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (۴۱/۵۳-۵۴) خدا کا قانونِ ربوبیت ھر شے کو محیط ھے۔ کسی ایک چیز کے ساتھ ھی وابستہ نہیں۔ اس لئے

چشم کو چاھئے ھر رنگ میں وا ھو جانا

تمہیں یاد ہو گا سلیم! میں نے تم سے ایک دفعہ ایک بڑی عمدہ کتاب کا ذکر کیا تھا جس کا نام تھا (The Great Design) - مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب مجھے اب یہاں کسی لائبریری میں نہیں ملی اور نہ ہی ولایت میں کسی کتب‌فروش سے دستیاب ہو سکی ہے - ورنہ میں تمہیں پڑھنے کے لئے دیتا - اس کتاب کا پلان یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علوم کے آئمۂ فکر و تحقیق کے پاس یہ سوالنامہ بھیجا گیا کہ آپ نے اپنے شعبہ علم میں جس قدر تحقیق کی ہے کیا اس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام کائنات کسی خاص نظم وضبط کے مطابق چل رہا ہے یا یونہی ہنگامی طور پر وجود مین آ گیا اور ہنگامی طور پر چلے جا رہا ہے؟ اس سوال کے جو جوابات ان بڑے بڑے سائنسدانوں کی طرف سے موصول ہوئے انہیں بلا تنقید و تبصرہ محولہ صدر کتاب میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے - ان جوابات کا احاطہ کس قدر وسیع تھا اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک عالم نباتیات کے مقالہ کا عنوان تھا ایک سبز پتہ، اورغالباً سر جیمز جینس نے ''ستاروں کی گذرگاہوں،، کے عنوان سے جواب لکھا تھا - ان میں سے ہر محقق اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں کائنات کے ذرے ذرے میں کسی علیم و حکیم قوت کے مستحکم اور غیر متبدل نظم و نسق کی کارفرمائیاں دکھائی دیتی ہیں - کائناتی نظم و ضبط کی یہی وہ کارفرمائیاں ہیں جن کے سامنے ان آئمۂ فکر و تحقیق کی نگہ عقیدت قدم قدم پر جھک جاتی ہے - لیکن چونکہ ان کے سامنے قرآن نہیں اس لئے وہ اس ہستی کے متعلق صحیح صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی جو اس نظام کو بایں حسن و رعنائی چلا رہی ہے - باین ہمہ، وہ اس کے نظام ربوبیت کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں (ان کے لئے اس مقام سے قرآن تک پہنچ جانا کچھ دشوار نہیں بشرطیکہ کوئی ان کے سامنے قرآن پیش کرنے والا ہو) -

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رو سے علم کی تعریف کیا ہے -

علماء کون ہیں؟

اس کے بعد اس نقطہ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے عالم کسے کہتے ہیں اور علماء سے مراد کون لوگ ہیں؟ لیکن قرآن کریم کا اعجاز دیکھو کہ اس نے اس حقیقت کو خود ہی واضح کر دیا ہے تا کہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے - قرآن

میں ’’علماء،، کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ شعراء میں (۲۶، ۱۹۸) جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ اور دوسری جگہ سورۃ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفاً اَلْوَانُھَا۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ۔ اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقے ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں۔ اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ کَذٰلِکَ۔ اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! ان آیات میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساط فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم کا۔ طبیعیات (Physics)۔ نباتیات (Botany)۔ طبقات الارض (Geology)۔ حیوانیات (Zoology) اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵، ۲۷-۲۸) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اور کس طرح ایسے عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہی کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں (وَسَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ) لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں

وھی لا سکتا ھے جو ان قوانین سے واقف ھو جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ھیں۔ یہ قوانین، فطرت کے مشاھدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ھو سکتے ھیں۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ھیں انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ھے۔

ھمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف (Definition) کے بعد تم غور کرو سلیم! کہ ھمارے ھاں جو حضرات علماء کہلاتے ھیں انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ھوتا ھے؟ وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ھوتے۔ ان کا علم نظری مباحث اور لفظی کتربیونت سے ایک قدم آگے نہیں جاتا۔ اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق جنہیں نہ کائنات سے کچھ تعلق ھوتا ھے نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ھمارے مذھبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ھوا ھوتا ھے۔ اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق۔ فلسفہ۔ معانی۔ بیان ادب، نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ھو جاتا ھے۔ اور منطق و فلسفہ بھی وہ جو اب عہد پارینہ کی داستان بن چکا ھے۔ اس نصاب میں ھیئت، ھندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ھوتی ھیں۔ لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ھے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا۔ اور تو اور (تم حیران ھوگے کہ) ان کے نصاب میں قرآن کریم بھی داخل نہیں۔ تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ھے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ھیں۔ اور آخری سال سورۂ بقرہ کی تفسیر بیضاوی۔ بس یہ ھے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ھونے کی سند مل جاتی ھے۔ اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب ھندوستان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شروع ھوا تو علمائے کرام سے اس کے جائز یا ناجائز ھونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔ اس فتویٰ کے جواب میں جمیعۃ العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا تھا کہ

> جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا ھے وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ھے کہ وہ ایک ایسا آلہ ھے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ھے اور وہ

> اس کی طرف رخ کئے ہوئے قرآت یا خطاب کرتا ہے ۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کرکے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے ۔ (بحوالہ نقیب $\frac{۱۱}{۲۱}$ ۱۰)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دیدیا ۔ لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے ایک بہت بڑے مفتی (محمد شفیع) صاحب نے (جواب پاکستان میں قیام فرما ہیں) اس کے خلاف ان فتاویٰ کا مجموعہ شائع کیا جن میں ”عباداتِ مقصودہ“ کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا * ۔ انہوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے ۔ اس کے لئے انہوں نے الیگزینڈر ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا ۔ انہوں نے کہا کہ

> برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے ۔ اور اس کا انکار بھی سمجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے ۔

چنانچہ اس تحقیق انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دیدیا ۔ یعنی ماسٹر برج نندن صاحب کی بات کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسول کا اس باب میں یہ حکم ہے ۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علوم جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے ۔ ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے، لیکن یہ ان کے حرام و حلال ہونے کے متعلق فتوےٰ ضرور صادر کرتے رہتے ہیں ۔ اور اب پاکستان میں معاملہ فتویٰ کی حد سے بڑھ کر قانون سازی تک پہنچ گیا ہے ۔ مثلاً اگر اب یہ معاملہ حکومت کے سامنے آجائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز ۔ اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت

---

* اب یہی علمائے کرام لاؤڈ اسپیکر کو نماز اور خطبات میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں ۔

ہو تو یہ قانون حضرات علمائے کرام مرتب کرینگے۔ یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہوتا کیا ہے اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بنا پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب و سنت جائز ہے یا ناجائز۔ اور یہ فیصلہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا۔ (چنانچہ یہی مفتی صاحب جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے آئین پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں مجلس آئین ساز کے شرعی مشیروں کے زمرہ میں شامل رہے ہیں)۔ یہ حضرات سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو لوگوں کو شریعت کے مسائل کون بتائے؟ سو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی مملکت میں شریعت کے مسائل اس مملکت کے قوانین سے الگ کچھ نہیں ہوتے۔ لہذا ان کے بتانے کے لئے کسی خاص گروہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کام حکومت کے عمال کا ہوتا ہے نہ کہ مولویوں کے گروہ کا۔ جب رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اسلامی مملکت قائم تھی تو اس وقت مولویوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ یہ سب بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔

باقی رہے ایسے معاشرتی احکام جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ مثلاً نکاح کیسے پڑھانا چائیے۔ جنازہ کی نماز کس طرح ہوتی ہے۔ تو ان تمام امور کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایسی باتیں نہیں جن کے لئے کسی دارالعلوم میں جانا پڑے۔ یہ ہمارے عام مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں پڑھائی جاتیں تو پڑھائی جانی چاہئیں۔ اس لئے جو لوگ علوم سائنس کے ماہر ہوں گے وہ ان امور کو بھی جانتے ہوں گے۔ بہرحال اسلامی معاشرے میں اس قسم کی تمام باتیں عام مسلمانوں کو معلوم ہونی چائیں۔ لہذا ان کے لئے بھی کسی خاص گرزہ کی ضرورت نہیں۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآن کریم کی رو سے مومنین، متقین، خدا کا ذکر کرنے والے۔ ''لقاء رب'' کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہی ہیں جو کائناتی نظام پر غور و فکر، اور اشیائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جد و جہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رو سے علم ہے۔ اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس بناء پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن و متقی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعت مومنین اور گروہ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کرے۔ مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے۔ اسلئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن و متقی وہ ہیں جو، تسخیرفطرت کے بعد، فطرت کی قوتوں کو ان قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں درج ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں۔ یعنی (۱) تسخیر فطرت اور (۲) اس کے ماحصل کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ قوم مومن اور متقی نہیں ہو سکتی۔ قرآن اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۳/۲۰۸) کا حکم دیتا ہے۔ یعنی قرآن کے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر وارد کرنے کا حکم۔ ہم صحیح معنوں میں مومن اور متقی نہیں۔ کیونکہ ہم میں شرط اول (تسخیر فطرت) کی کمی ہے (اور جب ہم شرط اول (تسخیر فطرت) ہی پوری نہیں کرتے تو شرط دوم۔ قوائے فطرت کا قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے۔ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اور اقوام مغرب مومن اور متقی نہیں کیونکہ ان میں شرط دوم کی کمی ہے۔ لہذا ایمان و تقوىٰ کی سطح پر وہ اور ہم دونوں یکساں ہیں۔ لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انہوں نے تسخیر فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنا لیا ہے اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ قوانین خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔ یہی وہ الراسخون فی العلم (۳/۶) ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں۔ اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ (۵/۴۴) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں۔ اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور

رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حال ہو رہا ہے)۔ وہ لوگ سائنس کا اسقدر وسیع علم رکھنے کے باوجود انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کر پاتے۔ یعنی اس باب میں ان کا سمع و بصر و فواد انہیں کچھ کام نہیں دے رہا۔ قرآن کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَا اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً۔ ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکن عطا کیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکن نہیں عطا کیا۔ اسکے ساتھ ہی انہیں سمع و بصر و فواد بھی عطا کیا تھا۔ لیکن فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ وَلَا اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (۴۶/۲۶) لیکن جب انہوں نے ان قوانین خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسولوں کی وساطت سے انہیں ملے تھے تو ان کی سمع و بصر و فواد انہیں تباہی سے نہ بچاسکے۔ یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آسکا۔ اگر یہ لوگ کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے اس جنت میں تبدیل ہو جائے جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ دیکھو سلیم! اس حقیقت کو قرآن کیسے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ تم سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لاؤ جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں غور و فکر سے خدا کے نظام ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انہیں یونہی میسر آجاتا ہے اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ (۱۰/۸)۔ یہ لوگ جہنم میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ان کے برعکس آیات خداوندی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ان کا نشوونما دینے والا ان کے اس ایمان کی بنا پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہ نمائی کردیتا ہے۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان باغات میں رہتے ہیں جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ اس جنتی

معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آجاتی ھے کہ بار الہٰا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ اور اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق آرزوئیں بڑی ھی حیات بخش اور سلامتی افروز ھوتی ھیں - جو لوگ اس معاشرہ کو قائم کرینگے وہ مسلسل جد و جہد اور پیہم سعی و عمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے- تاآنکہ آخرالاسر یہ تمام نوع انسانی کو محیط ھو جائیگا -اور ھر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظام ربوبیت کس طرح ھر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ھے وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ($\frac{۱۰}{۹-۱۰}$)۔ یہ نتیجہ ھوتا ھے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرف آخر

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ھوگی سلیم! کہ اگر ھم اپنے معاشرہ کو قرآنی خطوط پر متشکل کرنا چاھیں تو اس کے لئے ضروری ھوگا کہ ھم اس قسم کے ریسرچ سکالرز اور سائنسدان (Scientists) پیدا کریں جو انفس و آفاق کے ھر شعبے میں قوانین فطرت کے مشاھدات و تجربات سے، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے جائیں۔ اور اس کے ساتھ وہ قوانین خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ھیں اسطرح عام کئے جائیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو ان قوانین کے مطابق تقسیم اور استعمال کرنے میں کوئی دقت نہ ھو۔ یہی وہ لوگ ھیں جنہیں قرآن کی رو سے علماء کہا جائے گا۔ جب تک ”علم اور علماء“ کے متعلق ھمارا موجودہ تصور نہیں بدلتا، خدا تک پہنچنا تو ایک طرف، ھم زندہ قوموں کے زمرے میں بھی شامل نہیں ھوسکتے۔ وَفِيهَا آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

ستمبر ۱۹۵۶ء

والسلام
پرویز

اکتیسواں خط

(تصوف)

سلیم میاں ! میں مسلسل تین ماہ تک کوشش کرتا رہا کہ تم اپنے اس سوال کے جواب کیلئے اصرار نہ کرو۔ لیکن میں جسقدر انکار کرتا رہا اسی قدر تمہارا اصرار بڑھتا رہا۔ میں چاھتا تھا کہ تم پہلے اسلام (یعنی مسلمانوں) کی تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کر لو اور پھر ان مسائل کے پیچھے نکلو۔ اس وقت یہ باتیں تمہاری سمجھ میں زیادہ آسانی سے آسکتی تھیں۔ مگر تمہاری ضد کا کیا علاج! لیکن اس میں بھی، میں محسوس کرتا ھوں کہ زیادہ قصور خود میرا ھی ھے۔ اس لئے میں ھارا۔ تم جیتے۔ لو اب غور سے سنو۔

تمہارے سوال کا جواب تو میں ایک فقرے میں دے سکتا تھا اور وہ بھی اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ علامہ اقبال کے الفاظ میں، جو انہوں نے ۱۹۱۷ء میں سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں لکھے تھے کہ

> اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود ھی سر زمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ھے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ھوا میں پرورش پائی ھے۔

لیکن اس سے تمہارا اطمینان نہیں ھوگا، اس لئے ذرا تفصیل سے لکھتا ھوں۔

اگرچه تصوف (Mysticism) قریب قریب دنیا کی ھر قوم میں موجود ھے اور آج سے نہیں، بلکه تاریخ کے اولیں اوراق سے اس کا تذکره شروع ھو جاتا ھے۔ لیکن اس کے باوجود (مذھب یعنی (Religion) کی طرح) اس کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف (Precise definition) آج تک نہیں ھو سکی۔ اس کا دائره بہت سے تجارب و کیفیات، احوال و مقامات اور شعائر و مناسک کو محیط ھے۔ لیکن ان میں دو بنیادی عناصر ایسے ھیں جو تصوف کی اصل سمجھے جاتے ھیں۔ یعنی (۱) انسان کا خدا کے ساتھ براه راست مکالمه اور (۲) نفسِ انسان کا حقیقتِ مطلقه (یعنی خدا) کے ساتھ مل جانا۔ جسے وصال یا فنا کہتے ھیں۔ یه تمام کیفیات ھر فرد کی ذاتی (یعنی انفرادی) ھوتی ھیں جن میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں ھوتا۔ نه وه فرد ان کیفیات کو کسی دوسرے کو محسوس کرا سکتا ھے۔ اس اعتبار سے تصوف، به حیثیت ایک مذھب کے، یکسر شخصی یا ذاتی (Personal religion) ھوتا ھے اور یه تجارب (Experiences) اس کائنات کے حسّی یا مشاھداتی علم کے بغیر، ایک ایسے ذریعه سے حاصل ھوتے ھیں جو بالکل نگاھوں سے مستور اور حواس سے پوشیده رهتا ھے۔ اسی کو باطنی ذریعهٔ علم کہتے ھیں۔ اس علم کے حصول کی وجه یه بیان کی جاتی ھے که نفسِ انسانی جب باطن کی گہرائیوں میں چلا جاتا ھے تو وھاں یه اس حقیقتِ کلی میں جذب ھو جاتا ھے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ھے۔ اور اس طرح نفسِ انسان اور حقیقت (Reality) ایک ھو جاتے ھیں۔ اور وه بغیر کسی ذریعه یا واسطه کے تمام حقائق کا براه راست مشاھده کر لیتا ھے۔ مشاھده کیا، وه خود ھی حقیقت بن چکا ھوتا ھے۔ چونکه حقیقتِ مطلقه تمام مادی اور محسوس نسبتوں سے بلند اور منزه ھے اس لئے نفسِ انسانی اس کے ساتھ اسی صورت میں پیوست (بلکه اس کے اندر ضم) ھو سکتا ھے جب یه خود تمام محسوس اور مادی علائق سے بلند اور پاک ھو جائے۔ اس کے لئے نه صرف دنیوی حظائظ و لذات سے ترکِ تعلق ضروری ھے بلکه اپنے قلب و دماغ کو بھی اس مقام پر لے جانا ھوتا ھے جہاں اس محسوس دنیا کے نقوش اور خیالات کا کوئی گذر نه ھو۔ یعنی مادی دنیا کی آلائش تو ایک طرف، محسوس اشیاء کے تصورات اور خیالات تک بھی دماغ میں نه آنے پائیں۔

تصوف کی اصطلاح میں اس کیفیت کو ''مکمل تاریکی،، (Complete darkness) سے تعبیر کیا جاتا ھے۔ یه لوگ دنیائے محسوسات سے اسقدر دور چلے جاتے ھیں که ان کے عقیدہ کی رو سے وحی کے الفاظ بھی محسوسات میں داخل سمجھے جاتے ھیں۔ اس لئے وہ انہیں چھوڑ کر، وحی کا صحیح مفہوم اس باطنی دنیا سے متعین کرتے ھیں جس کا علم انہیں براہِ راست حاصل ھوتا ھے۔ اسے وہ حقیقت کا باطنی علم یا خود ''حقیقت،، کہتے ھیں۔ چونکه وہ اس طریق سے حاصل کردہ علم کو بلا واسطه علم (Direct knowledge) کہتے ھیں اس لئے وہ اسے یکسر حتمی اور یقینی قرار دیتے ھیں۔ اور اس کے مقابله میں محسوسات کے ذریعه سے حاصل کردہ علم کو ظنی اور غیر یقینی ٹھہراتے ھیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے علم کو دیگر تمام علوم کے مقابله میں افضل اور اعلیٰ سمجھتے ھیں۔ یه مقام انہیں مختلف جانکاہ مشقتوں اورجگر سوز ریاضتوں سے حاصل ھوتا ھے جن میں بعض اوقات جان تک کا بھی خطرہ ھوتا ھے۔

یه ھیں سلیم! مختصر الفاظ میں تصوف کے مبادیات اور لزوم و خصائص۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا میں چار بڑے بڑے مذاھب تھے۔ یہودیت۔ نصرانیت۔ مجوسیت اور بدھ مت۔ آخرالذکر دونوں مذاھب (مجوسیت اور بدھ مت) میں وحی کا کوئی امتیازی اور خصوصی تصور نہیں تھا۔ اس لئے یه یقین سے نہیں کہا جا سکتا که ان کے ھاں ایک نبی کی وحی اور ارباب تصوف کے کشف و الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔ لیکن یہودیت اور نصرانیت میں یه فرق ضرور تھا، اگرچه بہت مبہم طریق پر تھا۔ یہودی، حضرت موسیٰ (علیه) کو جس انداز کا نبی مانتے تھے، اس انداز کا نبی یرمیاہ، دانیال، یسعیاہ، حزقیل، وغیرہ کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن مشکل یه ھے که وہ انہیں بھی نبی (Prophets) ھی کہتے تھے۔ اس لئے که ان کے ھاں نبی کے معنی ھی تھے پیش گوئیاں کرنے والا۔ (اسی لئے اس کا ترجمه Prophet کیا جاتا ھے)۔ اس لئے بادی النظر میں یه سمجھنا دشوار ھو جاتا ھے که ان کے ھاں ایک رسول کی وحی اور ایک ولی کے الہام میں فرق کیا جاتا تھا یا نہیں۔

عیسائی اپنی انجیل کے مرتبین (لوقا - مرقس وغیرہ) کو سینٹ (ولی) کہتے ھیں اور انہیں حضرت عیسیٰؑ کا ھم مرتبہ نہیں مانتے - (یہ غالباً اس لئے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا مقام خدائی مقام ھے جس میں کوئی اور شریک نہیں ھوسکتا)۔ ان کے بعد بھی ان کے ھاں اولیاء (Saints) ھی کا سلسلہ چلتا ھے - اس اعتبار سے کہا جا سکتا ھے کہ عیسائیوں کے ھاں رسول کی وحی اور اولیاء کے کشف و الہام میں فرق ھے - لیکن (جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا) وحی اور الہام کا فرق (خواہ وہ عیسائیوں کے ھاں ھو یا مسلمانوں کے ھاں) صرف اصطلاحی فرق ھے - نوعیت دونوں کی ایک ھی ھے - مسلمانوں کو یہ فرق زیادہ شدت سے کیوں کرنا پڑا، اس کے متعلق بھی بعد میں لکھا جائیگا -

یہودیت ظواھر پرستی کا مذھب ھے اس لئے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت کم تھی - لیکن معلوم ھوتا ھے کہ بیت المقدس کی پہلی تباھی کے بعد، بابل کی اسیری کے زمانہ میں، جب کہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی (اور یہی زمانہ تصوف کے ابھرنے کا ھوتا ھے) ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ھونے شروع ھو گئے - چنانچہ اس دور میں ان کے "نبیوں" (Prophets) کے احوال و ظروف کچھ اس قسم کے ھیں جیسے باطنی خلوت گاھوں میں اربابِ تصوف کے ھوتے ھیں - اسی قسم کا اسلوبِ زندگی - وھی اندازِ گفتگو - اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات - اسی نوع کی پیشگوئیاں - لیکن حقیقی تصوف ان میں اس کے بعد جا کر آیا ھے جب ان کے مذھبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وھاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذھب ایجاد کیا - فیلو (Philo) اس مذھب کا امام ھے - تصوف کا ابوالاباء درحقیقت افلاطون (Plato) کو سمجھنا چاھئے - اس نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا تھا کہ اس عالمِ محسوس کے اوپر ایک عالم امثال ھے - وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ھے اور یہ عالم اس کا محض پرتو ھے - اِس عالم میں جو کچھ ھے اور جو کچھ ھوتا ھے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں - اس حقیقی عالم کے متعلق

علم، حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا ۔ باطنی طریق سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ افلاطون کے اس فلسفہ (یا بالفاظ صحیح، تصوف) کی نشأۃ ثانیہ بعد کے فلاسفروں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلاطینس (Plotinus) تھا ۔ ان فلاسفرز میں سے ایک (Apollonious of Tyana) نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے براہمنوں سے ہندی تصوف سیکھا ۔ فلاطینس، رومی لشکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے مُغوں سے مجوسی تصوف کی تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد ان فلاسفروں نے فلاطینس کی زیر سرکردگی افلاطون کے فلسفۂ قدیم کو، ان ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر، ایک جدید قالب میں ڈھالا ۔ اس کا نام نو فلاطونی فلسفہ یا (Neo - Platonism) ہے ۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے فیلو کا یہودی تصوف متاثر ہوا ۔ اس تصوف کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، معرفت اور حقیقت میں بدل گئی ۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ

> تورات کی روح در حقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے ۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے ۔

تورات کی شریعت، ہر بنی اسرائیل کے لئے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے ۔ چنانچہ مشناہ (کتاب ''حقیقت'') میں لکھا ہے کہ

> کتاب پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہئے ۔ اس کی سخت ممانعت ہے ۔ اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہئے تاوقتیکہ اس نے مقام ولایت حاصل نہ کر لیا ہو ۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصل معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروف ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انہیں خاص خاص طریقوں سے اکھٹے کرنے اور دہرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہوجاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی یہی خواص و تاثیرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے کہ

> خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا۔ اور ان کے پراسرار مجموعوں سے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علم حقیقی ہے اور اس سے انسان، پراسرار و رموزِ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ جس پر یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ان کے ’’ربانی صوفیوں،، (Rabbinic Mystics) کی شعبدہ بازیوں کے عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام کو رموزِ کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے۔ بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچھڑا نمودار ہوجاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے یہ ارباب تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے اور خوابوں کی تعبیر سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ) کی تعلیم (خدا کے ہر سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوائیت ان کی جان تک کی دشمن ہوگئی۔ لیکن ان کی تشریف براری کے بعد خود عیسائیت یہی کچھ بن کر رہ گئی۔

ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوئے تھے وہ پہلے یہودی ہی تھے ۔ اور دوسرے اسلئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہو گئی ۔ اس لئے اسے بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر، تصوف کی قرارگاہ میں پناہ لینی پڑی ۔ بہرحال اب ہم عیسائیت کے تصوف کی طرف آتے ہیں ۔

سلیم! غور سے سن رہے ہو یا موضوع کو خشک سمجھ کر جمائیاں لینے لگ گئے ہو؟ لیکن موضوع خشک ہے یا تر ۔ اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست! اس لئے خود کردہ را علاجے نیست ۔ اب تو آخر تک بات سننی ہی پڑے گی ۔

عیسائیت میں پہنچکر تصوف نے ایک منظم مسلک (Organised System) کی شکل اختیار کر لی ۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہو گیئں ۔ ان کے قواعد و ضوابط وضع ہوئے ۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرر ہوئیں ۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور طریق متعین ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی ۔ اس ''روحانی ترقی،، کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے زینے تجویز ہوئے ۔ جگہ جگہ مختلف اولیاء (Saints) نے اپنے حلقے اور مرکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب، تصوف کی آماجگاہ بن گیا ۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ

> اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو ۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کرو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے ۔ جب آدم اور حوا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہو گئی تھیں ۔ لیکن اس کے بعد یسوع مسیح آیا تھا کہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں بند ہو جائیں ۔ پس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے ہی سے خدا اور اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آسکے گا ۔ (St. Origen)

اس مقصد کے لئے ترکِ دنیا - ترکِ علائق - ترک خیالات، ترک آرزو، غرضیکہ ''روحانیت'' کے علاوہ ہر شے کا ترک ضروری قرار پا گیا اور حقیقی زندگی اسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت— گوش بند و چشم بند و لب بہ بند—کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا، رموز و اسرار کائنات کے جلوے دیکھتا رہے-

> وہ عالم غیب - وہ دنیائے نور- وہ بلند سے بلند تر مقام جہاں سادہ، غیر متبدل اور مطلق حقیقتیں، باطنیت کی مضمر خاموشیوں کی نورانی قباؤں میں لپٹی ہوئی ہیں - ان کے جلوے دیدہ ظاہر بین سے نہیں دیکھے جا سکتے - انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی - یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آسکتی ہے خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود - سب کو چھوڑو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود وقیود سے ماوراء ہے - یاد رکھو! اگر تم میں ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماوراء ہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے اس کے نور کی شعاع کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے - کامل تاریکی میں- (Donysius)

اس کے لئے

ترک دنیا - مرشد کی اطاعت - خاموشی اور انکساری اولین شرائط ہیں- (St. Benedict)- ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا زاہد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

> اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے - اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہ نمائی کرتی ہے تاآنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے - اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی

> اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ تکمیل نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور آخرالامر وہ خود حقیقت مطلق میں جذب ہوجاتا ہے۔ (St. Macarius)

خدا اور انسانی روح کے اس تعلق کو (Origen) ’’عروسی تعلق،، کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی (Saints) بھی اسے ’’آسمانی دلہن،، (Heavenly Spouse) کہہکر پکارتے ہیں۔ (اس اصطلاح کو ذرا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا سلیم! اس لئے کہ یہی وہ تصور ہے جو آپ کے ہاں ’’عرس،، کے رنگ میں رائج اور فقیری ’’دلہنوں،، کی صورت میں جلوہ بار ہے!)۔ چونکہ اس طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے، لوگوں کی نگاہوں میں بیحد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشربِ خانقاہیت کے مراکز تھے۔

یہ تھے اس وقت کے حالات جب اسلام کا ظہور ہوا۔ میں نے سلیم! قصداً ایران اور ہندوستان کے تصوف کا تذکرہ اس مقام پر نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس وقت عرب اور اس کے گرد و پیش یہودی اور نصرانی ہی پھیلے ہوئے تھے۔ ہند و ایران کے ساتھ ان کے روابط و علائق براہ راست نہیں تھے۔ یوں بھی یہودی اور نصرانی تصوف، ایران کے مجوسی (مانوی) تصوف اور ہندوستان کے بودھی تصورِ فنا اور وحدت وجود کو اپنے آغوش میں لے چکے تھے۔ ہندی تصوف (ویدانت) کا سب سے بڑا پرچارک (مبلغ) شنکر اچاریہ ہے۔ اس کے نزدیک اصل علم آتما تم ودِّھی یا معرفت نفس ہے۔ وہ روح کو ازلی اور غیر فانی مانتا ہے اور خارجی کائنات کو فانی۔ اسکی تعلیم یہ ہے کہ برھما ادراک سے بالاتر ہے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ وجدان

ہے۔ کائنات اور اسکی تمام اشیاء سراب (مایا) ہیں۔ ''میں'' بھی مایا ہے۔ ترک خواہشات کے ذریعے انسان مایا کے فریب سے نکل سکتا ہے۔

شنکر اچاریہ کے بعد اس مذہب (ویدانت) کا مبلغ پتنجلی ہے جو وحدت وجود کا قائل ہے۔ اہم برہم اسمی (میں ہی برہما ہوں) اس کا مشہور مقولہ ہے۔

* * *

اب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں۔ اس لئے اب جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھو تاکہ تمہاری یہ الجھن ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے اور اس کانٹے کی چبھن تمہیں پھر نہ ستائے۔ یہودیت یا نصرانیت کے مقابلے میں اسلام کے متعلق صحیح بات تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہے۔ اس لئے کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ حضرت موسیٰ (علیہ) اور حضرت عیسیٰ (علیہ) نے اپنے پیغام کو لوگوں کے سامنے کن الفاظ میں پیش کیا تھا۔ لیکن رسول اللہ ص نے اپنے پیغام کو جن الفاظ میں دنیا تک پہنچایا تھا اس کا ایک ایک حرف قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ لہذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زیر نظر موضوع کے متعلق قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

قرآن نے سلیم! یہ کہا ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل و فکر دی ہے، اور اسے بار بار تاکید کی ہے کہ وہ کائنات کے نظام پر غور کرے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرے جن کی رو سے یہ اتنا عظیم الشان اور محیر العقول کارخانہ اس حسن و نظم سے چل رہا ہے۔ اس طرح وہ کائناتی قوتوں کا راز پائے گا جو اس کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں۔ اور جب ان کا راز پا لے گا (یعنی یہ معلوم کرلیگا کہ وہ کس طرح کام کرتی ہیں اور کیا کیا کام کرتی ہیں) تو ان سے بے شمار فوائد حاصل کرسکے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اشیائے کائنات سے جو مفاد حاصل ہوتے ہیں انہیں کس طرح صحیح مصرف میں لایا جائے۔ یہ وہ سوال ہے جسے تنہا انسانی عقل حل نہیں کر سکتی۔ ان کا استعمال ان مستقل اقدار کے مطابق کرنا ہوگا جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لئے متعین کیا ہے۔ ان کا علم اسے وحی کے ذریعے مل سکے گا۔ وحی کو انسان اپنی محنت اور کسب و ہنر سے حاصل

نہیں کر سکتا ۔ یہ خدا کی طرف سے وھبی طور پر ملتی ھے ۔ یعنی انسان ازخود انکشاف حقیقت نہیں کر سکتا ۔ حقیقت اپنے آپ کو خود انسان پر منکشف (Reveal) کرتی ھے ۔

لیکن یہ انکشاف حقیقت (وحی) ھر انسان پر نہیں ھوتا ۔ یہ انکشاف خاص خاص انسانوں پر ھوتا ھے جنھیں نبی یا رسول کہا جاتا ھے ۔ وہ انسان، اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے ھیں ۔ رسول اللہ ؐ وہ آخری انسان تھے جنھیں خدا کی طرف سے وحی ملی ۔ یہ وحی قرآن کے اندر محفوظ ھے ۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ھمیشہ ھمیشہ کے لئے بند ھو گیا ۔

تم نے غور کیا سلیم ! کہ بات کیا ھوئی؟ بات یہ ھوئی کہ رسول اللہ ؐ کے بعد، انسانوں کے پاس علم کے ذرائع صرف دو ھی رہ گئے ۔

(۱) خدا کی وہ راہ نمائی جو قرآن کے اندر محفوظ ھے ۔ اور

(۲) انسانی عقل ۔

ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعۂ علم نہیں جس کا ذکر قرآن میں ھو ۔ اس میں کشف، الہام، باطنیت ”اندرونی روشنی“، وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ۔ اس میں صوفی یا تصوف کا لفظ تک نہیں آیا ۔ اس میں اولیاء کے کسی گروہ کا الگ تذکرہ نہیں ۔ وہ جماعت مؤمنین ھی کو اولیاء اللہ کہ کر پکارتا ھے ۔ اس میں انسانی روح کے خدا کے اندر جذب ھو جانے کا کوئی ذکر نہیں ۔ اس میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ کی اصطلاحات کا کوئی گزر نہیں ۔ اس میں واصل بالحق ھونے یا ”عروسی“ درجہ حاصل ھونے کا اشارہ تک نہیں ۔ باقی رھا قرآن ۔ سو اس کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ یہ عربی زبان کی ایک کتاب ھے ۔ اس کی زبان بڑی صاف، واضح اور روشن ھے ۔ اس میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ نہیں ۔ کوئی پیچ نہیں، خم نہیں، ابہام نہیں ۔ کوئی تہ دار بات نہیں ۔ اس پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی آسانی سے سمجھ میں آسکتے ھیں ۔ اس میں زیادہ تر محسوس امور ھی سے بحث کی گئی ھے لیکن جہاں کہیں مجرّد حقائق (Abstract Truths) کا ذکر آیا ھے تو (جیسا کہ ایک بلند پایہ کتاب کا انداز ھوتا ھے) انھیں محسوس تشبیہات میں بیان کر دیا گیا ھے ۔ (انھی کو

سلیم ! متشابہات کہتے ہیں) ۔ ان میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے ۔ اور یہ چیز علم کی پختگی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کے الفاظ کا کوئی باطنی مفہوم ہے جسے صرف خاص خاص لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں ۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے راہ نمائی کا ضابطہ ہے اس لئے اس کے مطالب تمام نوع انسانی کے سامنے یکساں طور پر کھلے ہیں ۔ اس میں نہ زمان کی قید ہے ، نہ مکان کی ۔ وہ خود روشن (نور) ہے اور جو بھی اس سے راہ نمائی حاصل کرنا چاہے اسے روشنی عطا کر دیتا ہے ۔ یہ ہے قرآن کی پوزیشن ۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے ، اسے سلیم ! سامنے رکھو اور پھر غور کرو کہ قرآن نے کس طرح تصوف کی اصل و بنیاد کو ختم کر دیا ۔ تم نے شروع میں دیکھا ہے کہ تصوف کی عمارت ان اقنوم ثلاثہ پر قائم ہوتی ہے :—

(۱) ہر انسان خدا کے ساتھ براہ راست ہم کلام ہو سکتا ہے ۔ (قرآن نے ختم نبوت کا اعلان کر کے ، خدا سے براہ راست ہم کلام ہونے کا دروازہ بند کر دیا) ۔

(۲) انسانی روح ، خدا کی ذات کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو کر مادی دنیا میں چکر کاٹ رہی ہے ۔ آخر الامر یہ خدا کی ذات میں جا کر جذب ہو جاتی ہے یہ انسانی زندگی کا منتہیٰ اور کمال ہے (قرآن نے خدا کو ایک مکمل ذات بتا کر اس باطل تصور کی جڑیں کاٹ ڈالیں ۔ اس نے کہا کہ انسان کی ذات ، خدا کی ذات کا حصہ نہیں جو اس سے الگ ہو کر مصروف آہ و بکا ہے اور اس کا پھر اپنی اصل سے مل جانا مقصود حیات ۔ کوئی ذات نہ کسی دوسری ذات کا حصہ ہوتی ہے نہ اس میں جذب ہو سکتی ہے ۔ انسان کی ذات خدا کی عطا کردہ ہے اور اس کی نشو و نما انسانی زندگی کا فریضہ ۔ یہ ذات مناسب نشو و نما سے حیات جاوید حاصل کر سکتی ہے لیکن خدا کی ذات میں جا کر جذب نہیں ہو جاتی) ۔

(۳) آسمانی کتابوں کے حقیقی معانی ان کے الفاظ میں نہیں ہوتے ۔ ان کے باطنی معنی ہوتے ہیں جو کشف و الہام سے سمجھ میں آسکتے ہیں (قرآن نے کشف و

الہام کے امکان کو ختم کرکے اور اپنے آپ کو عربی زبان کی واضح کتاب کہہ کر اس تصور کو سرے سے مٹا دیا) ۔

(۴) صاحبان کشف و الہام سے کرامات سر زد ہوتی ہیں (قرآن نے کہا کہ صاحبان کشف و الہام تو کجا رسول اکرمؐ کو قرآن کے سوا کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ۔ حقیقت کو دلائل و براہین کی رو سے منوایا جاتا ہے ، نہ کہ خارق عادات کرشمے دکھا کر)۔

ان حقائق کی روشنی میں سلیم ! (میرا خیال ہے کہ) تم بے ساختہ کہہ اٹھو گے کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ قرآن اور تصوف بالکل متضاد بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارتیں ہیں ۔ اور قرآن فی‌الواقعہ تصوف کی باطل عمارت کو منہدم کرنے کے لئے آیا تھا ۔

اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ لیکن چونکہ تم نے یہ بھی پوچھا ہے کہ پھر اسلام میں تصوف آ کہاں سے گیا؟ اس لئے اس کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں لکھنا ضروری ہو گیا ۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو کہ،اور تو اور، خود صوفی بھی یقینی طور پر نہیں کہ سکتے کہ لفظ تصوف کے بنیادی معنی کیا ہیں؟ اس کا مادہ کیا ہے اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں؟ بعض اس لقب کو اصحاب صفّہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں ۔ [یعنی وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ''پناہ گزینوں (Refugees) کی طرح بے سرو سامانی کے حالت میں مسجد نبوی کے ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے]۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے ۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیا (Sophie) سے ماخوذ سمجتے ہیں جس کے معنی عقل و دانش کے ہیں اور جو لفظ فلسفہ (Philosophy) کی ترکیب میں شامل ہے ۔ لیکن اکثر کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (اون) کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے ، کیونکہ یہ لوگ آون کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا ۔ اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ ۱۴۰ھ میں رملہ کے

قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی - ابوہاشم کوفہ کا رہنے والا تھا اور اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آگیا تھا۔ یہاں ۱۶۰ ھ میں اس کا انتقال ہؤا - اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت کا مرکز تھا لیکن تصوف کے بنیادی تصور کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آگئے اور یہاں پہنچکر اپنے آبائی تصورات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے۔ اسلئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان کو قرآن سے بیگانہ نہ بنایا جائے اسکی قوت میں ضعف نہیں آ سکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اسلئے کہ اس کی حفاظت کا انتظام بڑا پختہ تھا۔ لہذا انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو وہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم یکسر بدل جائے۔ اس کیلئے ایک طریقہ تو وہ تھا جسے (مثلاً) طبری نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رو سے یہ کہہ کر کر دئیے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ لہذا قرآن کے الفاظ تو وہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں اُسوقت سے آجتک متوارث چلا آ رہا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی روح ہے۔ وضعی روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا کیونکہ روایات، جسقدر بنانی ممکن تھیں، اس زمانہ میں بن گئیں۔ لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا اور آجتک جاری ہے۔ اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس

> دستورالعمل کو مسخ کر دینا ھے۔ یہ ایک نہایت (Subtle) طریق تنسیخ کا ھے۔ اور یہ طریق وھی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ھیں جن کی فطرت گوسفندی ھو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ھیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اسکا نشو و نما نہ ھونے دیا تاھم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاھر ھوا۔ یا با الفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاھر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ھے۔ (اقبال نامہ ج ۱ صفحہ ۳۵)

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں قرآن کے باطنی مفہوم کے علاوہ وحدت الوجود کے فلسفہ کا بھی ذکر کیا ھے۔ اس کے متعلق تفصیل سے کسی اور وقت لکھا جائے گا۔ سردست تم اس نکتہ کو اچھی طرح سے سمجھ لو کہ، جیسا کہ حضرت علامہ نے لکھا ھے، قرآن میں باطنی مفہوم پیدا کرنا اسے منسوخ کر دینے کا ایک نہایت لطیف اور پر فریب طریقہ تھا جسے مسلمانوں میں اس طرح رائج کر دیا گیا۔ جیسا کہ تم پہلے دیکھ چکے ھو، یہ وھی چیز تھی جو یہودی، عیسائی اور ایرانی تصوف میں ھر جگہ موجود تھی۔ لہذا یہی نظریہ مسلمانوں میں جہاں ایک طرف اسماعیلی شیعیت کا موجب بنا، دوسری طرف اس نے تصوف کی بنیاد ڈال دی۔

جیسا کہ تم دیکھ چکے ھو، باطنی معنی کی بنیاد اس عقیدہ پر ھے کہ ھر انسان کوشش کرنے سے، کشف و الہام کے ذریعے، ان معانی کو براہ راست خدا سے حاصل کرتا ھے۔ یعنی خدا اور بندہ کی براہ راست ھمکلامی کا تصور۔ اس سے تم سمجھ سکتے ھو کہ جہاں باطنی مفہوم کے تصور نے قرآن کو عملاً منسوخ کر دیا، وھاں رسول اللہؐ کے بعد، کشف و الہام کے عقیدہ نے ختم نبوت کی مہر کو بھی توڑ دیا۔ وحی اور الہام

میں صرف لفظی فرق ھے ورنه اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ھیں ۔ دونوں کی عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ھے که انسان کے پاس عقل کے علاوہ ایک اور ذریعه علم بھی ھے جس سے وہ خدا سے براہ راست معلومات حاصل کر سکتا ھے ۔ اس طریق سے حاصل کردہ معلومات کو قرآن کی رو سے وحی کہا جاتا ھے اور تصوف کی زبان میں الہام ۔ لہذا ظاھر ھے که اگر رسول اللهؐ کے بعد، الہام کا امکان جاری رھے تو ختم نبوت کی کوئی حقیقت ھی نہیں رھتی ۔ چنانچه رسول اللهؐ کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ھے ، کشف و الہام ھی کی رو سے کیا ھے ۔

اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یه خیال پیدا ھو که جب الہام کے امکان سے ختم نبوت جیسے بنیادی عقیدہ کی تردید ھو جاتی ھے تو مسلمانوں میں اس عقیدہ کو رائج کیسے کر دیا گیا؟ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت طریقه اختیار کیا گیا ۔ پہلے یه کہا گیا که رسول اللهؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ھوتا تھا ۔ اسے وحی خفی، یا وحی غیر متلو کا نام دیا گیا (واضح رھے که رسول اللهؐ کے زمانے میں مسلمان ان اصطلاحات سے آشنا تک نه تھے) ۔ اس عقیدہ نے دو کام کئے ۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجه حاصل ھو گیا جو قرآن کی تفسیر یا'' اسلام کی تکمیل،، کے لئے وضع کی جا رھی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ھاتھ آ گئی ۔ اس کے علاوہ اس سے ایک اور بڑا فائدہ ھو گیا ۔ ان لوگوں کو یه خدشه تھا که ارباب شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ھوگی ۔ لیکن جب ارباب شریعت نے اس اصول کو مان لیا که رسول اللهؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ھوتا تھا اور ختم نبوت کے معنی سلسلۂ وحی کا ختم ھو جانا ھے ، نه که سلسلۂ الہام کا ۔ تو وہ اصولاً اھل باطن کی مخالفت کر ھی نہیں سکتے ۔ چنانچه اس قسم کی روایات خود ھماری کتب احادیث میں موجود ھیں که حضرت ابوھریرہؓ نے کہا که رسول اللهؐ نے مجھے دو برتن عطا فرمائے تھے ۔ ایک کو تو میں نے کھول کر عام کر دیا ھے (یه شریعت کا علم ھوا) لیکن اگر دوسرے کو کھول دوں تو میری شاہ رگ کاٹ دی جائے (یه ھوا باطن کا علم جو سینه به سینه آگے چلتا ھے) ۔ باقی رھیں خانقاھوں کی ریاضتیں ۔ سو ان کے لئے اس قسم کی

روایات موجود ھیں که رسول الله نبوت سے پہلے، پانی اور ستو لے کر غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وھاں کئی کئی روز تک مصروف مراقبه رهتے تھے ۔ انھیں ریاضتوں کا نتیجه خدا کیطرت سے وحی کا ملنا تھا ۔ یه تھے مختصر حربے جن سے، قرآن کے علی الرغم، باطنیت جیسا قرآن کا دشمن عقیده عام ھوتا چلا گیا ۔

دوسری طرف یهودیت اور نصرانیت کے تصوف نے پہلے ھی سے فضاء کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا ۔ جو یهودی یا نصرانی مسلمان ھوئے انھوں نے اس کو اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا ۔ اس لئے انھوں نے اسے لپک کر گلے سے لگا لیا ۔ نتیجه یه که تیسری صدی ھجری ھی میں خود مسلمانوں میں اسی زرو شور سے خانقاھیں کھلنی شروع ھو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ھاں ھوا تھا ۔

اگر تصوف کے سلسله کی ابتداء ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنھوں نے فی الحقیقت اس کی ابتداء کی تھی تو ممکن ھے بعض لوگوں کو یه خیال گزرتا که یه ان کی اپنی اختراع ھے ۔ اس کے لئے یه عقیده وضع کیا گیا که ان حضرات نے باطنی طور پر سلسله بسلسله رسول اللهؐ سے فیض حاصل کیا ھے ۔ اور چونکه یه تصور ایرنیوں کا پیدا کرده تھا اس لئے اس میں حضرت علی رضی الله عنه کا اسم گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا اور انھیں شاہ ولایت کے لقب سے سرفراز کیا گیا ۔ اب مختلف شجروں کا منتھیٰ حضرت علیؓ ھی قرار پاتے ھیں ۔ مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے ۔ سری سقطیؒ مرید تھے حضرت معروف کرخیؒ کے، معروف کرخیؒ مرید تھے داؤد طائیؒ کے، داؤد طائیؒ مرید تھے حبیب عجمیؒ کے، حبیب عجمیؒ مرید تھے خواجه حسن بصریؒ کے اور خواجه حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؓ کے، جنھوں نے یه باطنی علم رسول اللهؐ سے حاصل کیا تھا ۔ حالانکه تاریخ میں اتنی شهادت بھی نهیں ملتی جس سے یه معلوم کیا جا سکے که خواجه حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؓ سے ھوئی تھی ۔ اس کے برعکس اس امر کی شهادت ملتی ھے که حضرت معاویهؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ میں خواجه حسن بصریؒ لوگوں کو غیر جانبدار رهنے کی تلقین اور حکام وقت کی اطاعت کی تاکید کرتے تھے ۔ اگرچه مجھے تو اس میں بھی شبه ھی

نظر آتا ہے۔ ان کی پیدائش ٢١ھ میں بتائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت معاویہ اور حضرت علی رض کی جنگ کے زمانہ میں یہ بمشکل سولہ سترہ برس کے ہوسکتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں ان کی ایسی بڑی پوزیشن بمشکل باور کی جا سکتی ہے کہ یہ اتنے بڑے اہم معاملہ میں لوگوں پر کوئی اثر رکھتے ہوں۔ لیکن یہ باتیں تو اہل ظواہر کی ہیں۔ صوفیا کے نزدیک زمان و مکان کا بُعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھائے، ایک لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنید کے ایک مرید نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پیرومرشد کو خرقۂ تصوف حضرت انس بن مالک رض سے ملا تھا جو رسول اللہ ص کے صحابی تھے۔

میرا خیال ہے سلیم! تم اس مختصر سی سرگشت سے یہ سمجھ گئے ہو گے کہ تصوف کے جراثیم اسلام میں کہاں سے اور کیسے آئے۔ اس خط میں تصوف کی پوری تاریخ بیان نہیں کی جا سکتی، لیکن چلتے چلتے ایک ایسی شخصیت کے متعلق دو چار باتیں ضرور سن لو جس نے تصوف کو ایک مستقل مذہب کی حیثیت دیدی اور جس کے بھرپور وار سے ملت اسلامیہ اس وقت تک سنبھل نہیں سکی۔ یہ تھے ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی، جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے اور جن کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم تصوف کا عروۃ الوثقیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ وہی فصوص الحکم جس کے متعلق علامہ اقبال رح نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ

> جہانتک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبالنامہ ج ١ صفحہ ۴۴)

یہ چھٹی صدی ہجری میں اندلس میں پیدا ہوئے اور ٦٣٨ھ میں دمشق میں وفات پائی، جہاں ان کے مزار پر ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اس زمانہ میں ہسپانیہ میں متصوفین فلاسفرز کا ایک گروہ تھا جو وحدتِ وجود کے قائل تھے۔ وہ اپنی کیفیات اور احوال کو تشبیہ اور استعارہ کے رنگ میں بیان کیا کرتے تھے اور اپنے عشقِ حقیقی کو عشق مجازی کے جاذب نگاہ لباس میں پیش کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی انہی سے متاثر ہوئے۔ انہی کا فلسفہ، انہی کا انداز بیان حتی کہ انہی کا سا

عشق مجازی بھی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ھیں کہ جب وہ مکہ میں مقیم تھے تو ایک دوشیزہ کی طرف ان کا میلان ھو گیا تھا اور ان کے اکثر مکاشفات کا روحانی جذبہ اسی کے عشق کا رھین منت ھے۔ ان کے ملفوظات اور یہودی تصوف کی بنیادی کتاب '' زھار،، میں بڑی مطابقت پائی جاتی ھے۔ دونوں الہامی کتابوں کی تاویل اپنے ذاتی مکاشفات کی بنا پر کرتے ھیں۔ حروف اور اعداد سے پراسرار معانی اخذ کرتے ھیں۔ خوابوں کی تعبیر پر حقائق کی عمارتیں تعبیر کرتے اور انسانی مقدر کو ستاروں کے اثرات کے تابع مانتے ھیں۔ علامہ اقبال نے لکھا ھے کہ مسلمانوں میں وحدت وجود کا عقیدہ بدھ مت سے آیا ھے۔ لیکن یہ کہیں سے بھی آیا ھو اسے ایک منظم مذھب کی حیثیت ابن عربی نے ھی دی ھے۔ اور ستم ظریفی یہ کہ وہ اس کی سند بھی قرآن سے پیش کرنے کی جرأت کرتے ھیں۔ لیکن وہ سندیں کس قسم کی ھیں، اس کا نمونہ ملاحظہ ھو۔ قرآن کریم میں زمین کے متعلق ھے کہ منھا خلقنٰکم و فیھا نعیدکم و منھا نخرجکم تارۃً اخریٰ ($\frac{۲۰}{۵۵}$) اس کا صاف ترجمہ یہ ھے کہ ھم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے۔ ابن عربی صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ھیں کہ

> ھم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ھو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے، پھر بقا ملیگی اور دوبارہ پھر نمودار ھوں گے (فصوص الحکم)

میں پہلے لکھ چکا ھوں کہ جس بنیادی عقیدہ کی رو سے تصوف، اسلام کے مدّ مقابل کھڑا ھوتا ھے وہ یہ ھے کہ رسول اللہؐ کے بعد خدا کے ساتھ براہِ راست ھمکلامی کا سلسلہ جاری ھے۔ ابن عربی کا عقیدہ ھے کہ ارباب باطن، دین کے متعلق اپنے علم کو خدا اور رسول دونوں سے براہ راست حاصل کرتے ھیں۔ خدا کے متعلق ان کا ارشاد ھے کہ

> جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل صاحب الزمان، غوث، قطب لیتے ھیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ھیں کہ احادیث

روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں - لھذا اولیا ان کے متعلق رسول خدا سے براہ راست دریافت کرلیتے ھیں - اگرچہ اولیا انبیاء کے تابع ھوتے ھیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ھوتے ھیں.... اگرچہ رسول اللہ ؐ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرہ شرع سے باھر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ھے جسے ھمارے ھی جیسے شخص جان سکتے ھیں - اور وہ دقیقہ یہ ھے کہ جب یہ شرع رسول پر حکم کرتے ھیں تو ان کا ماخذ کیا ھوتا ھے؟ یہ کہاں سے حکم دیتے ھیں؟ ارباب شریعت تو وہ ھیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ھیں - قرآن و حدیث میں مصرح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ھیں، اجتہاد کرتے ھیں مگر اس اجتہاد کی اصل وھی منقول قرآن و حدیث ھوتے ھیں - اس کے برعکس ھم میں ایسے لوگ بھی ھیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ھیں - لہذا خود اس حکم شرعی میں خلیفۃ اللہ ھوتے ھیں - پس ایک طور پر مادہٴ کشف و الہام اور مادہٴ وحی رسول ایک ھے *....... صاحب کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ھونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ھے .... ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ ؐ کا لینا ھے .... یہی وجہ ھے کہ رسول اللہ ؐ کا انتقال ھو گیا اور آپ نے منصوص و معین طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امت میں ایسے لوگ ھونگے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ھوں گے .... پس خلق خدا میں خلیفۃ اللہ ھیں - وہ معدن

---

* قرآن کی رو سے اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں - وہ تمام مومنین کو اولیاء الراحمین کہہ کر پکارتا ھے -

** تم نے دیکھا کہ مرزا غلام احمد کو ان کی وحی اور الہام کی سند کہاں سے مل رھی ھے؟

> خاتم النبیین ومادہ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انھوں نے لئے تھے .... خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کرکے انبیاء کو دئے گئے تھے۔ اگرچہ خلیفۂ ولی ظاہر میں متبع نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے۔

دوسری جگہ یہ صاحب لکھتے ہیں :

> کبھی خلیفہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم حدیث کے خلاف ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا اجتہاد ہے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس کے کشف کی رو سے یہ حدیث ثابت نہیں۔ اگرچہ وہ حدیث عن عدل عن عدل سے ثابت ہو۔

میں سلیم اس ضمن میں اور بھی بہت کچھ نقل کر دیتا، لیکن ایک تو خط میں اتنا کچھ آ نہیں سکتا اور دوسرے میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی اصطلاحی چیزوں سے تمہاری طبیعت بہت جلد اکتا جایا کرتی ہے۔ لیکن جتنا کچھ میں نے لکھا ہے اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایک نبی کی وحی اور ان لوگوں کے الہام میں صرف اصطلاحی فرق ہے۔ معنوی طور پر کچھ فرق نہیں۔ دونوں کا مفہوم خدا سے براہ راست علم حاصل کرنا ہے۔ یہ لوگ کہدیتے ہیں کہ اگرچہ دونوں کا سر چشمہ ایک ہوتا ہے لیکن وحی یقینی علم ہوتا ہے اور الہام ویسا یقینی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ فرق صرف کمیت (Quantity) یا درجہ (Degree) کا فرق ہے۔ کیفیت (Quality) یا نوعیت کا فرق نہیں۔ سر چشمہ (Source) ان دونوں کا ایک ہے۔ یعنی خدا سے براہ راست حاصل کردہ علم۔ اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا سلیم! کہ جب الہام کے امکان کو مان لو تو پھر نبوت کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے، مسلمانوں میں تمام مدعیان نبوت اسی راستہ سے آئے ہیں۔ اس کشف والہام کی رو سے قرآن کو جو باطنی معنی پہنائے جاتے ہیں، ایک آدھ نمونہ اس کا بھی دیکھ لو تا کہ بات

نکهر کر تمهارے سامنے آجائے۔ ابن عربی ، فصوص الحکم کلمه موسویه میں لکهتے هیں که

> رعون کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے میں کیا حکمت نهی اور کیا راز تها ؟ اس کا راز یه تها که جو جو لڑکے موسیٰ کے اسطے مارے گئے تهے ان کی زندگی سے موسیٰ کو امداد ملے۔ کیونکه ه لڑکے موسیٰ سمجه کر مارے گئے تهے تو ضرور ان سب بچوں حیات جو موسیٰ سمجه کر مارے گئے تهے حیاتِ موسوی کی طرف ود کرے گی۔ ان معصوم بچوں کی حیات طاهر تهی ، فطرت پر تهی لکه وه قالوا بلیٰ کے عهد پر قائم تهے۔ لهذا موسیٰ ان سب مقتولین حیات کا مجموعه تها ۔ وه بهت سی روحوں کا مجموعه تها اور لند مقام پر تها کیونکه بچه کو الله کے پاس سے آئے هوئے تهوڑی دت هوتی هے۔

آگے چل کر یه صاحب یه کهنے کی بهی جرات کرتے هیں که فرعون ایمان پر مرا تها اور اس کی بخشش هو چکی هے۔ اتنا هی نهیں بلکه وه تو یهانتک بهی لکه گئے هیں (جس کے نقل کرنے سے میرا قلم تهرتهراتا اور روح کانپتی هے) که

> پس فرعون کو ایک طرح سے حق تها که کهے انا ربکم الاعلیٰ یونکه فرعون ذات حق سے جدا نه تها اگرچه اسکی صورت فرعون کی تهی۔

اور ایک ابن عربی پر هی کیا موقوف هے۔ دیگر بڑے بڑے صوفیا کے هاں بهی اسی قسم کی شطحیات ملتی هیں۔ رومی کهتا هے۔

می گفت در بیاباں رند دهن دریده
صوفی خدا ندارد اونیست آفریده

حدیقه سنائی میں ایک شعر هے جسے لکهتے وقت هزار بار روح تهرتهراتی اور دل کانپتا

ہے لیکن چونکہ اس قسم کی مثالوں کے بغیر بات صاف نہیں ہوتی اس لئے دل پر پتھر رکھ کر اور صد بار نقل کفر کفر نباشد کہتے ہوئے لکھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے

درمذہب عاشقاں یک رنگ
ابلیس و *.... است یک سنگ

ان لوگوں کے نزدیک کفر اور اسلام میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ

کفر و دین است دررہت پویاں
وحدہ، لا شریک لہ گویاں

میرا خیال ہے کہ تم ان مثالوں سے سمجھ گئے ہوگے کہ وہ جو اقبال نے کہا تھا کہ فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں، تصوف کا تمام لٹریچر اسی قسم کے الحاد و زندقہ سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ صوفیا میں بعض ایک دوسرے کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ مثلاً وحدت شہود کے مدعی وحدت وجود کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن تصوف کی اصل و بنیاد کو سب محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جو شخص اس کی طرف انگلی اٹھائے اس کی مخالفت میں سب متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی قسم کی مخالفت نے آجکل ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ یعنی عجمی تصوف اور اسلامی تصوف۔ اس امتیاز کی وجہ بڑی دلچسپ ہے۔ ایک چیز ہے تصوف اور ایک چیز ہے تصوف کا ضابطہ اخلاق (Ethics of Mysticism)۔ تصوف کا ضابطہ اخلاق یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑو' آرزؤں کو ترک کرو، محکومی اور سربزیری کی زندگی بسر کرو، افلاس اور محتاجی کو خدا کی رحمت سمجھو، قوت اور شوکت کو خوئے درندگی جانو اور مسلک گوسفندی اختیار کرو۔ ہمارے زمانہ میں علامہ اقبالؒ نے تصوف کے اس ضابطہ اخلاق کی سخت مخالفت کی اور قرآن کے پر شکوہ اور با عظمت، زندہ اور زندگی بخش مسلک حیات کی عام تبلیغ کی۔ چونکہ اہل تصوف اس دور میں یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ ضابطہ اخلاق فی الواقعہ اسلام کی تعلیم کا مظہر ہے اسلئے انہوں

---

* یہاں بنی اکرمؐ کا اسم گرامی لکھا ہے۔ استغفر اللہ۔ ثم استغفر اللہ

نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ عجمی تصوف ہے اسلامی نہیں۔ یعنی یہ لوگ جس تصوف کے وارث ہیں وہ اسلامی ہے اور جس تصوف کی مخالفت ہو رہی ہے وہ عجمی ہے۔ حالانکہ تصوف نہ عجمی ہے نہ اسلامی۔ یہ ایک غیر اسلامی تصور ہے جو غیر مسلموں میں بھی پایا جاتا ہے اور مسلمانوں میں بھی۔ جس طرح جھوٹ' مسلمانوں کے ہاں آکر سچ نہیں بن سکتا اسی طرح کوئی غیر اسلامی نظریہ مسلمانوں کے ہاں رواج پاکر اسلامی نہیں بن سکتا۔ یہ کہنا کہ حافظ کا تصوف عجمی ہے اور رومی کا تصوف اسلامی، تصوف کی اصل وبنیاد سے ناواقفی نہیں تو تسامح ضرور ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ضابطہ اخلاق کا ہے۔ نہ کہ تصوف کا۔ مثلاً حافظ کے ہاں سکوت و سکون ہے اور رومی کے ہاں اکثر مقامات پر حرارت اور گرم جوشی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں صوفی ہیں۔ بلکہ رومی اس باب میں حافظ سے بھی ذیادہ شدید صوفی ہے۔ وہ باطنی ذریعہ علم کو حافظ سے بھی زیادہ قابل اعتماد قرار دیتا ہے۔ جہاں تک قرآن کے باطنی مفہوم کا تعلق ہے رومی کا یہ دعویٰ ہے کہ

مازقرآں مغزرا برداشتیم
استخواں پیش سگاں انداختیم

یہ "مغزاستخواں" وہی ہے جسے باطنی مفہوم کہا جاتا ہے اور "استخواں" (معاذاللہ معاذ اللہ) وہ قرآن ہے جو عربی الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ جب مثنوی کو "قرآن درزبان پہلوی" کہنے والوں کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا جائے تو وہ کھسیانے سے ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولانا کا اس سے مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے معانی لیلئے ہیں۔ الفاظ سے ہمارا سروکار نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیا دنیا میں بغیر لفظ کے بھی کوئی معنی ہوتا ہے؟ تم سمجھے سلیم! کہ یہ کیا بات ہوئی۔ بات وہی ہوئی جو میں نے اوپر لکھی ہے کہ یہ حضرات اس مفہوم کو اصل مفہوم سمجھتے ہی نہیں جو قرآن کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا صحیح مفہوم وہ ہے جو انہیں کشف و الہام کے ذریعہ براہ راست خدا سے ملتا ہے۔ اور یہی ہے تصوف کی وہ بنیاد جو قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ لہذا اس بنیاد کی رو سے نہ رومی کا تصوف اسلامی ہو سکتا ہے نہ حافظ کا۔ تصوف فی ذاتہ ایک غیر اسلامی نظریہ ہے اور اقبال کے الفاظ میں "سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا"۔

بعض لوگ کہدیتے ھیں کہ تصوف سے مراد صرف ''اخلاص فی العمل،، ھے۔ یعنی نیک کام دکھاوے کی خاطر نہ کئے جائیں بلکہ مخلصانہ طور پر خدا کی رضاجوئی کی خاطر کئے جائیں۔ ذرا سوچو سلیم! کہ کیا اسلام یہ سکھاتا ھے کہ نیک کام ریاکاری سے کئے جائیں، جو اخلاص فی العمل کے لئے اسلام کو چھوڑ کر تصوف کی الگ اصطلاح کی ضرورت پڑ گئی؟ قرآن ریاکاری اور منافقت کو بد ترین جرم قرار دیتا ھے اور ایسا کرنے والوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں پھینکتا ھے۔ اس نے ریاکاروں کے لئے منافق اور مخلصین کے لئے مومن کے الفاظ استعمال کئے ھیں۔ ان قرآنی اصطلاحات کو چھوڑ کر ھمیں اور اصطلاحات تلاش کرنے کی ضرورت کیا ھے، بالخصوص جبکہ وہ اصطلاحات (تصوف اور صوفی) اس قدر غیر قرآنی تصورات کی حامل ھوں۔ حقیقت یہ ھے کہ جو لوگ تصوف کی مدافعت کی کوشش کرتے ھیں ان کی اس کوشش کا جذبہ محرکہ وھی ھوتا ھے جو دیگر غیر قرآنی معتقدات و تصورات کی مدافعت میں کارفرما ھوتا ھے۔ یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ۔ تصوف میں پہنچکر یہ جذبہ اور بھی شدید ھو جاتا ھے اس لئے کہ صوفیا (اولیا اللہ) کا جو مرتبہ ان کے معتقدین کے دل میں ھوتا ھے وہ خدا کا بھی نہیں ھوتا۔ لہذا وہ اس بات کا خیال تک بھی دل میں لانا کفر سمجھتے ھیں اور اس سے لرز جاتے ھیں کہ ان حضرات کے مسلک کو تنقید کی نگاہ سے دیکھیں۔ خواہ وہ تنقید خالص قرآن کی کسوٹی ھی سے کیوں نہ کی جاتی ھو۔ لیکن سلیم! یاد رکھو، جب تک ھم یہ مسلک (Attitude) اختیار نہیں کریں گے کہ اپنے مروجہ عقائد اور تصورات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں اور ایسا کرنے میں کسی اور خیال کو اثر انداز نہ ھونے دیں، اسوقت تک ھم اس ضابطہ زندگی (الدین القیم) کے قریب تک بھی نہیں آسکیں گے جسے خدا نے ھمارے لئے تجویز کیا تھا۔

باقی رھا تمہارا یہ کہنا کہ ان لوگوں سے بعض اوقات ایسی باتیں (کرامات) سر زد ھوتی ھیں جن کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔ تو اس کے متعلق اس خط میں اس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں کہ ان باتوں کو دین سے کوئی علاقہ نہیں۔ ھر انسان کے اندر ایک قوت ھے (جسے قوت خیال کہ لو یا (Will Power) جسے اگر خاص

طریقوں سے (Develop) کر لیا جائے تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جنہوں نے ایسا نہ کیا ہو۔ یہ کچھ ہر انسان کر سکتا ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تمیز نہیں۔ ہندو سادھوؤں اور سنیاسیوں سے (جو علانیہ بت پرستی کرتے ہیں) ایسی ایسی ”خارق عادات،، باتیں سرزد ہوتی ہیں جو مسلمان پیروں سے بھی نہیں ہوتیں۔ اس باب میں تمہیں یہ سنکر تعجب ہوگا کہ میری عمر کا ایک بڑا حصہ انہی وادیوں میں گزرا ہے اور میں نے یہ سب کچھ خود کرکے دیکھا ہے۔ اس کے لئے میں اپنے ہاں کی خانقاہوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ سادھوؤں کی سمادھیوں تک سے بھی ہو آیا ہوں۔ وہاں یہی دیکھنے گیا تھا کہ اگر یہ ”کرامات،، دین اسلام کا مغز ہیں تو پھر مشرکین سے یہی کچھ کیسے سرزد ہو جاتا ہے! لہذا اس باب میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ — قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

لیکن میں اس ضمن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس لئے کہ (تم تو شاید ضبط کر لو لیکن) اگر طاہرہ نے سن پایا تو وہ سر ہو جائے گی کہ چچا ابا کچھ ہمیں بھی دکھائیے۔ زیادہ نہیں تو مائی جیبو کی بیٹی کا جن ہی نکال دیجئے! اسے کیا معلوم کہ یہ جن نکالنے تو بہت آسان ہیں لیکن وہ جن جو پوری کی پوری ملت اسلامیہ کو صدیوں سے چمٹے چلے آرہے ہیں ان کا نکالنا کسقدر مشکل ہے۔ اور ان جنات میں سے یہ جن تو بہت ہی بڑا خطرناک ہے کہ ختم نبوت کے بعد الہام کا دروازہ کھلا ہے اور انسان خدا سے براہ راست ہمکلام ہو سکتا ہے۔ یاد رکھو سلیم! رسول اللہ ؐ کے بعد، خدا سے ”ہم کلام،، ہونے کا ذریعہ صرف قرآن ہے اور قرآن کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ سے متعین ہوتا ہے۔ اس کا کوئی باطنی مفہوم نہیں۔

اب سمجھے تم کہ تصوف کا عقیدہ کس طرح ختم نبوت اور قرآن کی اکملیت کی عمارت کو بنیادوں تک سے گرا دیتا ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ اسلام کے ہاتھوں میدان جنگ میں پٹے تھے انہوں نے اسے کس طرح مدرسوں اور خانقاہوں مین پہنچکر پچھاڑا ہے۔

والسلام

پرویز

دسمبر ۱۹۵۴ء

بتیسواں خط

(صوفیائے کرام)

تم نے عزیزم ! وقت تو بہت لیا لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ یہ بات تمھاری سمجھ میں آگئی کہ تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے غیر قرآنی تصور ہے ۔ اب رہا تمہارا یہ سوال کہ ہمارے صوفیائے کرام کی (بالخصوص وہ جن کا ہندوستان میں بہت چرچا ہے) علمی اور فکری سطح کیا تھی ، اور قرآن پر ان کی نگاہ کہاں تک تھی ؟ تو اس کے لئے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے جو بزرگ دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان کے متعلق جب بھی گفتگو کی جائے گی تو انہی کتابوں کی رو سے کی جائے گی جنہیں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ ان کتابوں کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں ۔ یا وہ آن حضرات کی نہیں ہیں اور انہیں ان کی طرف غلط منسوب کیا جاتا ہے ، تو اس صورت میں ان کے متعلق ہم بھی وہی کہیں گے جو حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ (۲۰/۵۲) اور اگر یہ کتابیں فی الواقعہ انہی کی ہیں تو ان سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان حضرات کی علمی اور ذہنی سطح کیا تھی ۔ تم نے بالخصوص حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ ، خواجہ قطب عالمؒ ، بابا فرید گنج شکرؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلق دریافت کیا ہے ۔ ان حضرات کی مستقل تصانیف کوئی

نہیں، البتہ ان کے ملفوظات کے مجموعے ہیں۔ ان ملفوظات کی صورت یوں ہے کہ ایک پیر کے ملفوظات ان کے خلیفہ قلمبند کرتے ہیں۔ وہ ان کی مجلس میں جاتے ہیں، اور ان کے ارشادات کو محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک مجموعہ مرتب ہو جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ معین الدین اجمیری کے پیرومرشد تھے خواجہ عثمان ہارونیؒ۔ انہوں نے خواجہ ہارونیؒ کے ملفوظات قلمبند فرمائے ہیں۔ اس مجموعہ کا نام ہے انیس الارواح۔ خواجہ اجمیری کے ملفوظات کو ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین اوشی کاکیؒ (خواجہ قطب عالمؒ) نے جمع کیا ہے۔ اس کا نام ہے دلیل العارفین۔ خواجہ قطب عالم کے ملفوظات کو بابافرید گنج شکر نے مرتب فرمایا تھا۔ اس مجموعہ کا نام ہے فوائدالسائلین۔ حضرت بابا فریدؒ کے ملفوظات کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے جمع کیا تھا، اس کا نام ہے راحت القلوب۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ* کے ملفوظات کو امیر خسرو نے مرتب کیا تھا۔ مجموعہ کا نام ہے راحت المحبین۔ تم نے دیکھا کہ اس طرح ان ملفوظات کے ہر مجموعہ کو دوہری سند حاصل ہو جاتی ہے، ایک تو ان کی جن کے یہ فرمودات ہیں اور ایک ان کی جنہوں نے ان ارشادات کو جمع اور مدون فرمایا۔ مثلاً انیس الارواح میں خواجہ عثمان ہارونیؒ کے فرمودات ہیں۔ اس اعتبار سے انہیں ان کی سند حاصل ہے، اور ان فرمودات کو جمع کیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے۔ اس اعتبار سے اس مجموعہ کو ان کی سند حاصل ہے۔ یہ مجموعے طبع شدہ ہیں۔ اس لئے انہیں ازخود دیکھا جا سکتا ہے، اور چشتیہ خاندان کے متوسلین تو ان مجموعوں کو ورد وظائف کی طرح یاد کرتے اور دہراتے رہتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تم خود ان مجموعوں کو دیکھتے تاکہ تمہیں ان کے علمی پایہ کا براہ راست اندازہ ہو جاتا، لیکن تمہاری تو حالت یہ ہو چکی ہے کہ لاددے، لدادے، لادنے والا ساتھ دے۔ تم انہیں ازخود کہاں پڑھو گے! اس لئے یہ ڈیوٹی بھی مجھے ہی سر انجام دینی پڑے گی۔ لیکن میں ان مجموعوں کو بہ تمام و کمال تو خط میں منتقل کر نہیں سکتا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض اقتباسات نقل کردوں۔ ان سے باقی

---

* اولیاء ولی کی جمع ہے۔ لیکن چونکہ ان کا یہی نام مشہور ہے اس لئے میں نے بھی اسی طرح لکھ دیا ہے۔

مجموعہ کے متعلق خود اندازہ لگا سکو گے۔ یہ مجموعے فارسی میں ہیں۔ لیکن چونکہ تمہیں فارسی پر اتنا عبور نہیں، اس لئے ان کا اردو ترجمہ ہی لکھنا پڑیگا۔ یہ ترجمہ مسلم پریس دہلی کا چھپا ہوا ہے۔ اقتباسات لفظ بہ لفظ نقل کئے جائیں گے تا کہ ان کی صحت میں کوئی شبہ نہ رہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ایسے معاملات میں کتنی احتیاط برتا کرتا ہوں۔ اچھا تو لو سنو۔

انیسُ الارواح پہلا مجموعہ ہے انیس الارواح یعنی خواجہ عثمان ہارونی کے ارشادات کا مجموعہ جسے خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے مرتب فرمایا۔ خواجہ صاحب اپنے پیر و مرشد کے متعلق فرماتے ہیں کہ

”میرے ہمسایہ میں میرا ایک پیر بھائی تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا، لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر دفن کر کے واپس چلے آئے۔ میں اس کی قبر پر بیٹھا رہا۔ عالم مشغولی میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو فرشتے عذاب کے اس کے پاس آئے اور چاہتے تھے کہ عذاب کریں۔ اتنے میں حضرت پیر و مرشد تشریف لائے۔ اور ان دونوں فرشتوں کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ اسے عذاب مت کرو۔ یہ میرا مرید ہے۔ وہ حسب الارشاد واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے اور عرض کی، باری تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ اگرچہ یہ شخص آپ کا مرید تھا لیکن آپ کے طریقہ سے برگشتہ تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حال ایسا ہی ہے مگر اس نے اپنی ذات کو میرے پلے میں باندھا تھا۔ اس کی حمایت میرے ذمہ ضروری ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ان فرشتوں کو حکم ہوا کہ واپس چلے آؤ۔ اس شخص کو عذاب نہ کرو۔ ہم نے اسے حضرت کی خاطر عزیز ہونے کے سبب سے بخشدیا ہے۔“

اس کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد کی معیت میں ایک سفر کا حال لکھا ہے۔ جس میں (بدخشاں میں) ایک بزرگ کو دیکھا جن کی عمر ایک سو چالیس برس کی تھی۔ ان کا ایک پاؤں جڑ سے کٹا ہوا تھا، اس کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ

”میں ایک مدت سے اس صومعہ میں معتکف ھوں۔ اس سے کبھی ایک قدم ھی خواهش نفس سے باھر نہیں نکالا۔ ایک دن ایسا ھوا کہ ھوائے نفسانی سے یہ بریدہ پاؤں باھر نکالا اور دوسرا نکال کر ارادہ روانگی کا تھا کہ ھاتف نے آواز دی: ے مدعی! ھمیں عہد بدا کہ فراموش کردی۔ یہ آواز سن کر متنبہ ھوا اور اپنی وعدہ خلافی سے پشیمان۔ چھری میرے پاس موجود تھی۔ فی الفور میان سے نکالی اور اس پاؤں کو جو باھر نکالا تھا کاٹ کر پھینک دیا۔“

اب مجالس کا ذکر شروع ھوتا ھے۔ ایک دن گفتگو در بارہ چاند و سورج گرھن ھوئی، آپ نے فرمایا: ”حضرت ابن عباس رضؓ نے رسول اللہؐ سے روایت کی ھے کہ جب آدمیوں سے گناہ زیادہ سرزد ھوتے ھیں فرشتوں کو اللہ تعالیٰ حکم دیتا ھے کہ چاند اور سورج کو پکڑو اور اس کے کسی جزو کل کو کسی قدر عرصہ کے لئے بے نور کر دو کہ اس سے خلق کو عبرت ھو۔“

ایک مجلس میں فرمایا کہ

”اگر خاوند کے جسم سے پیپ اور خون رواں ھو اور عورت اسے صاف کرنے کے لئے اپنے منہ سے چاٹے، تو بھی خاوند کا حق کما حقہٗ ادا نہ ھوگا۔“

ایک مجلس میں فرمایا کہ

”حضرت عیسیٰؑ کا دسترخوان سرخ رنگ کا تھا۔ وہ آسمان سے نازل ھوا تھا۔ جو شخص سرخ دسترخوان پر روٹی کھاتا ھے بروز حشر حضرت جبریل اس کے ئے براق معہ حلہ بہشتی لائیں گے۔“

ایک مجلس میں اھل جنت کے متعلق گفتگو ھوئی تو فرمایا کہ

”رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ آپ ھمیں اھل جنت کے خورو پوش سے خبر دیجئیے۔ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ھے مجھکو اس ذوالجلال والاکرام کی جس نے مجھے پیغمبری دی ھے کہ مرد بہشت میں سو مرتبہ کھانا کھائے گا اور سو

ھی مرتبہ اپنی عیال داری سے محبت کرے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ جب اس قدر کھانا پینا ہوگا تو انہیں قضائے حاجت بھی ہوگی یا نہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں ۔ وقت قضائے حاجت شکم سے ایک ریح خارج ہوگی جس کی خشبو مشک کو ماند کرتی جائے گی ۔ ''

دلیلُ العَارفین

اب اس مجموعہ کو لو جو خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات پر مشتمل ھے اور جنہیں خواجہ قطب عالمؒ نے مرتب فرمایا تھا ۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ ، قصبہ ہارون کے رھنے والے تھے جو نیشاپور کے قریب واقعہ ھے ۔ اور خواجہ اجمیریؒ قصبۂ سنجر میں پیدا ہوئے تھے جو سیستان میں واقعہ ھے ۔ آپ کی وفات ۶۳۳ھ میں اجمیر میں ہوئی تھی ۔ آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

''فقہ اکبر میں بروایت امام اعظم ابوحنیفہؒ لکھا ھے کہ ایک کفن چور جس نے چالیس سال تک کفن چرائے تھے ، قضائے الٰہی سے مر گیا ۔ اس کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بہشت بریں میں خراماں ھے ۔ پوچھا یہ درجہ اس نے کہاں سے حاصل کیا ۔ جواب دیا کہ نماز پڑھنے اور صبح کی نماز سے اشراق تک مصلّے پر قرار پکڑنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے میرے سارے گناہ بخشدیئے ۔ ''

ایک مجلس میں فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ صَلَاتِھِمۡ سَاھُوۡنَ* کی تفسیر میں فرمایا کہ ویل ایک کنواں یا میدان ، دوزخ میں ھے ۔ اس سے زیادہ کسی دوزخ میں عذاب نہیں ۔

ایک مجلس میں عذابِ قبر کے متعلق گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ

''ایک بزرگ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھے تھے ۔ ہمارے متصل ایک مردے کو عذاب قبر ہو رہا تھا ۔ اس بزرگ نے جب یہ حال دیکھا تو زور سے نعرہ

---

* تباھی (ویل) ھے ان نمازیوں کے لئے جن کی نمازیں تیر بے ھدف کی طرح بے نتیجہ رہ جائیں ۔

مار کر زمین پر گر پڑے۔ ہم نے اٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ جان قالب سے پرواز کر گئی ہے ۔ پھر تھوڑی دیر میں بدن ان کا پانی ہو کر ناپید ہو گیا ۔ اسی طرح فرمایا کہ دو درویش قوالی سنتے سنتے زمین پر گر پڑے۔ خرقہ ان کا زمین پر پڑا رہا اور جسم اس کے اندر سے غائب ہو گیا ۔ ،،

ایک مجلس میں خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ

،،بروز قیامت انبیاء ، اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے ۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہوں گے ۔ ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ تانے کے تاگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے ۔ ان کے مرید اور بچے ان کے ان تاگوں کو پکڑیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامۂ محشر سے فارغ نہ ہو ۔ پھر حق تعالیٰ انہیں پل صراط پر پہنچائیگا اور وہ مع اپنے پیروں کے اس بتیس ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں بہ برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے ۔ اور دروازہ بہشت پر پہنچکر دارالنعیم میں داخل ہوں گے ۔ ،،

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ

’’جب رسول اللہ؏ کا وصال ہوا تو آپ نے اصحاب کہف کا غار دیکھا ۔ انہیں سلام کیا۔ حق تعالیٰ نے سب کو زندہ کیا اور جواب سلام دلوایا ۔ آپ نے مذہب اسلام کی دعوت دی اور انہوں نے اسے بصدق دل منظور کیا ۔،،

ایک مجلس میں فرشتوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ

،،اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ ھابیل نام پیدا کیا ہے ۔ اس کا ایک ہاتھ مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں ، تسبیح اس فرشتہ کی ہے لَاَ اِلٰـہَ اِلاَّ اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ۔ وہ روز و شب پر موکل ہے ۔ اس کے سامنے ایک تختی پر بہت سے خطوط سیاہ و سفید ہیں ۔ وہ ان خطوط کی درازی اور کوتاہی سے رات دن چھوٹا

بڑا کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو رات دن گھٹ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ فرما کر آپ زاروقطار رونے لگے۔ اور عالم بیہوشی آپ پر طاری ہوا۔ پھر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے کوہ‌قاف کو پیدا کیا ہے۔ اور تمام عالم اس کے احاطہ کے اندر آباد ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ فرمایا : ق۔ والقرآن‌المجید ...... پھر فرمایا کہ وہ پہاڑ زمین سے چالیس گنا زیادہ وسیع ہے۔ اسے ایک گائے اپنے سر پر رکھے ہے۔ درازی اس گائے کی تیس ہزار سال کی راہ ہے۔ سر اس کا مشرق میں اور دم مغرب میں ہے۔ پھر فرمایا کہ خواجہ مودود چشتیؒ نے جس مجلس میں یہ بات بیان کی تھی اس میں ایک درویش حاضر تھے۔ انہیں اس سے اپنے دل میں کچھ شک گزرا۔ حضرت خواجہ سربمراقبہ ہوئے۔ اور وہ اور وہ درویش اپنے اپنے خرقوں سے گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے تو اس درویش نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے حضرت خواجہ نے کوہ‌قاف دکھا دیا ہے۔ اب مجھکو کوئی شبہ نہیں رہا۔ ،،

ایک مجلس میں فرمایا کہ

’’جس روز اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا کیا ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ نے ایک سانپ کو بھی پیدا کیا اور اس سانپ سے ارشاد فرمایا کہ اے سانپ ! ہم تجھے امانت سپرد کرتے ہیں، منظور ہے یا نہیں۔ سانپ نے جواب دیا۔ مجھے بسروچشم منظور ہے۔ حکم ہوا منہ کھول دے۔ اس نے منہ کھولا۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ دوزخ کو لاؤ اور اس سانپ کے منہ میں رکھدو۔ فرشتوں نے دوزخ لا کر اس کے منہ میں رکھدی اور منہ باندھ دیا۔ اب دوزخ اس سانپ کے منہ میں ہے ساتویں زمین کے نیچے۔ اگر دوزخ سانپ کے منہ میں زیر زمین نہ ہوتی تو تمام عالم جل جاتا۔ ،،

ایک مجلس میں الحمد شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

،،میں اور خواجہ عثمان ہارونیؒ سفر میں تھے۔ دجلہ کے کنارے پہنچے۔ دریا طغیانی پر تھا۔ میں فکر میں ہوا کہ کس طرح پار اتریں، اور جلد عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ آنکھیں بند کرو۔ میں نے آنکھیں بند کیں

تھوڑی دیر میں کھولیں۔ خود اور حضرت خواجہ کو دجلہ کے پار پایا۔ میں نے دریافت کیا کہ کس طور عبور فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ الحمد شریف کو پانچ مرتبہ پڑھکر قدم پانی میں رکھا اور پار اتر گئے۔ ''

ایک دفعہ فرمایا کہ

''جب حضرت آدمؑ سے لغزش ہوئی تو تمام چیزیں حضرت کو دیکھر رونے لگیں لیکن چاندی اور سونا نے آنسو نہ نکالے اور خدا سے عرض کی کہ ہم اس کے حال پر نہ روییں گے جو تیرا گناہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عرض سنکر قسم کھائی اور کہا کہ میں تمہاری قیمت مقرر کردوں گا اور بنی آدم کو تمہارا خادم بنا دوں گا،،

اس کے بعد فرمایا کہ جنگل میں ایک درویش رحلت کردہ کی لاش کو دیکھا کہ ہنس رہی تھی۔ پوچھا تم تو مر چکے ہو اب کیونکر ہنستے ہو۔ جواب دیا کہ محبت حق تعالیٰ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

سلیم میاں ! باتیں تو بہت سی لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن خط میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ اس لئے مختصر اقتباسات پر ہی کفایت کر رہا ہوں۔

فوائد السّائلین

اب تم فوائدالسّائلین کو دیکھو جو خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور جنہیں ان کے خلیفہ خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ خواجہ صاحب قصبہ اوش کے رہنے والے تھے جوماوراء النہر کا ایک قصبہ ہے۔ آپ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کی والدہ پندرہ پارہ کی حافظ تھیں، اور ایّام حمل میں قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف رہتی تھیں۔ اس لئے آپ پیدائش ہی سے پندرہ پارہ کے حافظ تھے۔

آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

''بدخشاں میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے حاکم وقت کو حکم دیا کہ ایک خانقاہ تیار کرو۔ اس نے خانقاہ تیار کرائی تو آپ نے حکم دیا کہ ہر روز

حکم خدا ھوا کہ اس نوجوان کو فلاں خرابہ میں تلاش کرو۔ لیکن ملک الموت کو اس کا وھاں بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا اے ملک الموت! تم ھمارے دوستوں کی روح قبض نہیں کر سکتے اور نہ ان کو دیکھ سکتے ھو۔ وہ لوگ میرے پاس ھیں،، ۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ

''شیخ جلال الدین رومی کبھی روم میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا آپ غائب ھو جاتے۔ آخر معلوم ھوا کہ آپ شرعاً و تعظیماً خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ھیں،،۔ ایک جگہ لکھا ھے کہ ''ایک جوگی حضرت (بابا فرید) کی خدمت میں آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کوئی کرامت دکھاؤ۔ یہ سن کر وہ ھوا میں اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی جوتیاں ھوا میں چھوڑ دیں۔ وہ اس جوگی کے سر سے اونچی چلی گئیں۔ چنانچہ جوگی معترف ھوا کہ جس شخص کی جوتیوں کا یہ مرتبہ ھوگا وہ کس مرتبے کا ھوگا۔،،

ایک مرتبہ آپ نے اپنی ریاضت کے متعلق بتایا کہ

''میں بیس سال عالم تفکر میں کھڑا رھا۔ بالکل نہیں بیٹھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس بیس سال میں میں نے کچھ کھایا ھو۔،،

اس مجلس میں حضرت عمرؓ کے مناقب بیان کرتے ھوئے آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک دھی بیچنے والا راستے میں کھڑا رو رھا ھے۔ اس نے کہا کہ میرا دھی زمین پر گر گیا تھا۔ زمین اسے پی گئی ھے۔ کیا آپ اسے روا رکھ سکتے ھیں۔ یہ سن کر آپ نے درہ اٹھا کر نعرہ مارا کہ زمین! تو دھی واپس دیتی ھے یا نہیں۔ یہ سنتے ھی زمین پھٹ گئی اور دھی اوپر نکل آیا۔ اس دھی والے نے اپنا سبوچہ دھی سے بھر لیا اور چل دیا،،۔

اسی طرح فرمایا کہ ''ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنا خرقہ سی رھے تھے اور پشت آپ کی جانب آفتاب تھی۔ پشت مبارک آپ کی تمازت آفتاب سے گرم ھوگئی تو آپ نے نگاہ غضب سے آفتاب کی طرف دیکھا، معاً فرشتوں کو حکم ھوا کہ نور آفتاب کا محو

کریں کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا ہے - فرشتوں نے فی الفور تعمیل کی اور نور آفتاب سے لے لیا - جملہ جہان تاریک ہو گیا - رسول اللہؐ اس زمانہ میں حیات تھے - ازحد غمناک ہوئے - فرمانے لگے کہ شاید قیامت قائم ہو گئی جو نورآفتاب سے لے لیا گیا - یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت جبریلؑ نازل ہوئے اور بیان کیا کہ یا رسول اللہؐ ! قیامت قائم نہیں ہوئی بلکہ آفتاب کا نور حضرت عمرؓ کی گستاخی کی وجہ سے چھین لیا گیا ہے - رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا اور شفاعت کی - حضرت عمرؓ نے سورج کو معاف کر دیا - فی الفور جہان روشن ہو گیا،، -

ایک مجلس میں فرمایا کہ

،،عہد رسول اللہؐ کا ذکر ہے کہ ایک شخص کے ہاں دو بچے توأم پیدا ہوئے - یہ خبر آنحضرت کو پہنچائی گئی اور عرض کیا گیا کہ ان کے جدا کرنے کی ترکیب فرمائیے - آپ متفکر تھے کہ حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور کہا کہ یا رسول اللہؐ ! ان کے سروں میں ایک ہی کنگھا کرنا چاہئے، علیحدہ ہو جائیں گے - ایسا ہی کیا گیا اور وہ الگ الگ ہو گئے -،،

ایک مرتبہ فرمایا کہ سورہ ملک کا نام توریت میں ماثورہ ہے، اور ماثورہ کا ترجمہ (فارسی میں) عذاب گور سے باز رکھنے والا ہے -

اس مجلس میں فرمایا کہ ،،جب خواجہ عبداللہ سہیل تستری کا انتقال ہوا ہے تو شہر میں یہودیوں کی ایک جماعت سخت منکر تھی - ان میں سے ایک یہودی نے جنازہ سے قریب آ کر کہا کہ اگر آپ مجھے اس وقت تلقین کریں تو میں مسلمان ہوتا ہوں اور میرے ساتھ ہزار آدمی اور مسلمان ہوں گے - وہ یہ بات پوری نہ کر چکا تھا کہ آپ نے کفن سے ہاتھ باہر نکالا اور دونوں آنکھیں کھول کر کہا : اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ - چنانچہ اس پر وہ سب مسلمان ہو گئے،، -

ایک مجلس میں گفتگو در بارۂ خرقۂ درویش ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ

”جب رسول اللہ معراج سے واپس آئے تو آپ نے صحابہ رض سے فرمایا کہ مجھے فرمان الٰہی ہوا ہے کہ خرقۂ درویش اس شخص کو دوں جو میرے سوال کا جواب شافی دے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رض حضرت عمر فاروق رض اور حضرت عثمان غنی رض سے یہ سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دیدیا جائے تو تم کیا کرو گے۔

حضرت صدیق رض نے کہا کہ میں سب کچھ خدا کی راہ میں نثار کردوں گا۔ حضرت عمر رض نے کہا کہ میں عدل و انصاف کروں گا۔ مظلوموں کی داد کو پہنچوں گا۔ حضرت عثمان رض نے کہا کہ میں حیا اور سخاوت اختیار کروں گا۔ لیکن ان میں سے کسی کا جواب اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علی رض سے سوال کیا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں دیدیا جائے تو تم کیا کرو گے۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر مجھے خرقہ عطا کر دیا جائے تو میں بندگان خدا کی پردہ پوشی کروں گا۔ چنانچہ آپ نے وہ خرقہ حضرت علی رض کو دیدیا۔

ایک دفعہ فرمایا کہ

”خواجہ ابوسعید ابوالخیر ایک دفعہ ذکر خدا میں مشغول تھے، کہ بال کی جڑ سے خون روانہ ہونے لگا۔ اہل خانہ نے ایک کاسہ چوبیں نشست کے نیچے رکھ دیا کہ جو خون بہے وہ کاسہ میں جمع ہو جائے۔ آپ کے جسم مبارک سے اس قدر خون رواں تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کاسہ بھر گیا اور اہل خانہ نے وہ خون پی لیا“۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

”نواح غزنی میں میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ نہایت ضعیف اور لاغر تھے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر شب ایک سو بیس رکعات نماز نفل ادا فرماتے تھے۔ لیکن عارضہ شکم کی وجہ سے ہر دو رکعت کے بعد انہیں قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تھی۔ آپ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے جاتے۔ واپس آکر غسل فرماتے اور

دوگانہ ادا کرتے ۔ پھر قضائے حاجت ہوتی اور غسل کرتے اور دوگانہ ادا کرتے ۔ مختصراً یہ کہ اس شب وہ ساٹھ مرتبہ نہائے اور اپنا وظیفہ ادا کیا ۔ آخر بار جب نہانے تشریف لے گئے تو میازر آب انتقال فرمایا ۔ سبحان اللہ ! کیا مضبوط اور راسخ العقیدہ تھے،، ۔

ایک دفعہ فرمایا کہ

''جب مغلوں نے یمن کا محاصرہ کیا تو والئی یمن حضرت خواجہ ابواللیث کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آپ کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی ۔ آپ نے وہ خلیفہ کو عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ غروب آفتاب کے وقت مغلوں پر شبخون مارنا ۔ اس نے ایسا ہی کیا اور جونہی وہ لکڑی لشکر مغل پر پھینکی انہیں ہزیمت واقع ہوئی اور وہ لڑتے لڑتے بھاگ گئے،، ۔

اسی طرح ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ایک سیاح نے مجھ سے یہ حکایت بیان کی تھی کہ میں نے شہر دمشق کو اجاڑ پایا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کے بعض باشندوں نے وظیفہ ترک کر دیا تھا ۔ ناگاہ مغلوں کا لشکر ان کے شہر میں آیا اور شہر کو ویران کر دیا،، ۔

چونکہ سلیم ! یہ ایک تاریخی بات ہے جو درمیان میں آگئی ہے ، اس لئے تمہاری اطلاع کے لئے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یمن پر مغلوں کا حملہ بالکل خلاف واقعہ ہے ۔ باقی رہا مغلوں کا دمشق پر حملہ ۔ سو دمشق پر پہلی بار تیمور کے مغلوں نے حملہ کیا تھا جو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے قریب سو سال بعد کا واقعہ ہے ۔

ایک مجلس میں فرمایا

''ایک نوجوان واصلان حق میں سے تھا ۔ جب عمر اس کی تمام ہوئی ملک الموت نے اس کو شرق سے غرب تک ڈھونڈا لیکن نہیں پتہ پایا ۔ مجبور اپنے مقام پر پر آکر سجدہ میں سر رکھا، اور خدا سے درخواست کی وہ اس نوجوان کا پتہ بتا دیں ۔

بازار سے ایک کتا خرید کر لائیں ۔ حسب الحکم روز کتے خرید کر لاتے ، آپ ان کا ھاتھ پکڑ کر سجادہ پر بٹھاتے اور فرماتے خدا کے سپرد کیا ۔ آخرالامر وہ کتے ایسے ہو گئے کہ ہر ایک ان میں کا پانی پر چلتا تھا اور جس کسی کو وہ نقش دیدیتا ، اچھا ہو جاتا ۔ ،،

ایک مجلس میں فرمایا کہ

’’میں اور قاضی حمیدالدین ایک سفر میں تھے ۔ ھم نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو ھے ، جو دریا کی جانب روانہ ہو رہا ھے ۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو لئے ۔ دریا پر پہنچے تو دریا زور شور سے رواں تھا ، اور کوئی کشتی وغیرہ موجود نہ تھی ۔ ھم نے اللہ سے دعا کی کہ اگر ھم نے اپنا کام کمال کو پہنچا لیا ہو تو دریا ھمیں راہ دیدے ۔ ناگاہ دریا شق ھو گیا اور درمیان دریا راہ ھویدا ھوئی ۔ ھم اس راہ میں رواں ہو کر پار اتر گئے ۔ وہ بچھو ھمارے آگے آگے تھا ۔ بچھو ایک درخت کے تلے پہنچا جس کے سائے میں ایک مرد سو رہا تھا ، اور ایک اژدھا اس شخص کو کاٹنے کے لئے آ رہا تھا ۔ بچھو نے سانپ کے ڈنگ مارا ، سانپ مر گیا ۔ اور بچھو غائب ھو گیا ۔ وزن اس سانپ کا ھزار من کا ھوگا ۔ ھم اس شخص کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ وہ شرابی ھے ۔ شراب پی کر قے کی ھے اور بد مست پڑا ھے ۔ ھم متعجب ہوئے کہ ایسے نافرمان شخص پر اللہ نے ایسی نوازش فرمائی ھے ۔ جونہی یہ اندیشہ ھمارے دل میں گزرا ، ھاتف غیبی نے آواز دی کہ اگر ھم پارساؤں پر ھی اپنی توجہ مبذول رکھیں تو غریبوں کا حامی کون ہوگا ؟ ،،

ایک مجلس میں فرمایا کہ خواجہ عثمان ھارونیؒ کے ایک مرید نے آپ سے کہا کہ میرے ھمسایہ نے میرے مکان سے متصل ایک چوبارہ بنوایا ھے جس سے میرا مکان بے پردہ ہو گیا ھے ۔ آپ نے دریافت کیا کہ وہ شخص یہ جانتا ھے یا نہیں کہ تم میرے مرید ہو ۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے واقف ھے ۔

آپ نے یکایک زبان مبارک سے فرمایا کہ پھر کیا وجہ ھے کہ وہ کوٹھے پر سے گر نہیں پڑتا ۔ اور اس کا مہرۂ گردن ٹوٹ نہیں پڑتا ۔ اس اثنا میں وہ مرید

اپنے گھر کو گیا ۔ راستے میں سنا کہ وہ شخص کوٹھے سے گر پڑا ہے اور اس کی گردن کا مہرہ ٹوٹ گیا ہے ۔

پھر فرمایا کہ بغداد شریف میں ایک شخص کو جرم قتل کی سزا میں قتل کرنے لگے اور قاعدے کے موافق اس کا منہ قبلہ رخ کرنے لگے تو اس نے اپنا منہ قبلہ سے پھیر کر اپنے پیر کے مزار کی طرف کر لیا ۔ جلاد نے کہا کہ مرتے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف کرنا چاہیئے ۔ اس شخص نے کہا کہ تو اپنا کام کر ۔ میں نے اپنا منہ اپنے قبلہ کی طرف کر لیا ہے ۔ وہ دونوں اسی حیص بیص میں تھے کہ خلیفہ کا قاصد آیا اور اس نے کہا کہ اس شخص کا جرم خلیفہ نے معاف کر دیا ہے ۔ اس پر خواجہ قطب عالمؒ نے فرمایا کہ دیکھو ۔ اس شخص کی خوش عقیدگی نے اسے قتل سے صاف بچا لیا ۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ

''حضرت خواجہ مودود چشتیؒ کو جب اشتیاق خانہ کعبہ کا غالب ہوتا تو اُسے فرشتے سرزمین چشت میں لے آتے کہ خواجہ صاحب زیارت سے مشرف ہوں ۔،،

راحتُ القلوب

اب سلیم اس مجموعہ کی طرف آؤ جو ان سب میں بڑا ہے ۔ یعنی 'راحت القلوب، ۔ اس میں خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کے وہ ملفوظات ہیں جنہیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے مرتب فرمایا تھا ۔ خواجہ گنج شکرؒ اجودھن کے رہنے والے تھے ۔ محرم ٦٦٨ھ میں وفات پائی ۔ آپ کا مزار پاکپتن (ضلع منٹگمری) میں ہے ۔ آپ کے لقب (گنج شکر) کی وجہٴ تسمیہ میں بہت سے اقوال ہیں ۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک بنجارہ گزرا جس کے بوروں میں شکر لدی ہوئی تھی ۔ آپ نے پوچھا کہ بوروں میں کیا ہے ۔ اس نے ازراہ ظرافت کہا کہ یہ نمک ہے ۔ گھر جا کر بورے الٹے تو ان سب میں نمک ہی نمک تھا ۔ وہ روتا ہوا حاضر خدمت ہوا تو آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا ، وہ شکر تھی تو شکر ہو جائے گی ۔ چنانچہ وہ شکر بن گئی ۔

اسی طرح جب خواجہ قطب‌الدین مودود چشتی کا انتقال ہوا ہے اور لوگوں نے چاہا کہ جنازہ اٹھائیں توجنازہ خود بخود ہوا میں معلق ہو کر چلنے لگا۔ دفن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بیان کرکے آپ نعرہ مار کر بے ہوش ہوگئے اور دیر تک بے ہوش رہے۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ

”ایک روز حضرت رسول‌اللہ ؐ مع اصحاب ایک جا متمکن تھے۔ معاویہ رضؓ، یزید کواپنے کندھے پرسوار کئے ہوئے گزرے۔ رسول‌اللہ ؐ نے تبسم کیا کہ سبحان اللہ! دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔ یہ ارشاد والا حضرت علی رضؓ نے سنا۔ دریافت کیا: رسول اللہ ؐ! فرمائیے کہ پسرمعاویہ رضؓ کیونکر دوزخی ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اے علی رضؓ! یزید بدبخت وہ ہے جومیرے حسن رضؓ وحسین رضؓ اوران کی تمام اولاد کوشہید کرا دیگا۔ امیرالمومنین حضرت علی رضؓ اٹھے اور تلوار میان سے کھینچی اور چاہا کہ یزید پلید کو مار ڈالیں۔ آنحضرت ؐ مانع ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ حکم باری تعالیٰ کا ایسا ہی ہے۔ مخالفت تقدیر کی نہ کرنی چاہیئے۔“

سلیم! تمہاری اطلاع کےلئے اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یزید کی پیدائش ٢٦ھ میں ہوئی تھی یعنی رسول‌اللہ ؐ کی وفات کے بھی سولہ برس بعد۔

راحت المحبین

اب چند ایک مثالیں راحت المحبین سے بھی سن لو۔ یہ خواجہ نظام‌الدین اولیا کے ملفوظات ہیں جنہیں امیر خسرو نے مرتب کیا تھا۔ خواجہ صاحب بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ٧٢٥ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ وہیں آپ کا مزار ہے۔ جہاں تم بیسوں مرتبہ گئے ہو۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ”آدم علیہ السلام بہشت سے کوہ سراندیب میں (جو اب لنکا یاجزیرہ سیلون کے نام سے مشہور ہے) اترے تین(سو) برس تک اپنی لغزش کی بنا پر روتے رہے۔ چنانچہ گوشت پوست ان کے رخساروں کا بہہ گیا تھا۔ اور چڑیوں

نے ان کے رخساروں میں گھونسلے بنا لئے تھے اور ان کو اسکی خبر تک نہ تھی ۔ آپ کے آنسوؤں سے زمین اس قدر تر ہو گئی کہ اس پر گھاس آگ آئی اور اتنی بلند ہو گئی کہ آپ کا وجود مبارک اس میں پوشیدہ ہو گیا ،، ۔

ایک دفعہ فرمایا کہ ’’جس روز حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا ہے اور ایک بھیڑئیے کو پکڑ کر حضرت یعقوبؑ کی خدمت میں لے گئے کہ اس نے یوسفؑ کو ھلاک کیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بھیڑئیے سے پوچھا کہ تو نے یوسف کو ھلاک کیا ہے؟ اس نے کہا کہ خیر (یعنی نہیں) ۔ آپ نے دوبارہ اس سے دریافت کیا کہ تو جانتا ہے کہ یوسفؑ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا ۔ حضرت مجھے معلوم نہیں ۔ اگرچہ میں جانور ہوں لیکن عیب جوئی اور عیب گوئی نہیں کرتا ،، ۔

پھر فرمایا کہ ’’حضرت ایوبؑ نے خدا سے دعا کی کہ مجھے بارہ ہزار زبانیں دے تا کہ ہر زبان سے تیرا ذکر کروں ۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں کیڑوں میں مبتلا کر دیا ۔ چنانچہ ان کے جسم میں بارہ ہزار کیڑے تھے ۔ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا کہ وہ ہر رات میں ایک ہزار رکعت نماز نفل ادا کیا کرتے تھے ۔ اور قریب صبح سر سجدہ میں رکھکر عاجزی کیا کرتے تھے ۔ اس وقت آپ کے ہر بن مو سے خون جاری ہو جاتا اور ہر قطرہ سے جو زمین پر گرتا نقش تسبیح پیدا ہو جاتا ۔ آپ کی کشتی کے متعلق فرمایا کہ اس کے لئے جبریلؑ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار تختے مہیا کئے ، اور اس طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار کیلیں آسمان سے نازل کیں ۔ ہر تختے پر ایک نبی کا نام لکھا تھا ۔ حضرت محمدؐ کے نام کے بعد چار تختے خالی رہ گئے ۔ آپ نے کہا کہ اب ان پر کس کا نام لکھا جائے گا ۔ وحی ہوئی کہ رسول اللہؐ کے چار یار ہونگے ۔ ان کے اسماء کے بغیر کشتی تیار نہیں ہوسکے گی ۔ پھر فرمایا کہ آپ نے حضرت آدم کی نعش (جو صفا اور مروہ کے درمیان تھی) نکال کر اس کشتی میں رکھی ۔ آپ کی کشتی میں ابلیس بھی سوار ہو گیا ۔ آپ نے اسے نکالنا چاہا تو ارشاد خداوندی ہوا کہ اسے نہ نکالو ہم نے اسے انقراض عالم تک مہلت دے رکھی ہے ،، ۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ

''حضرت عیسیٰؑ آخری زمانہ میں دنیا میں اتریں گے اور اپنے معجزہ سے ایک مردہ زندہ کریں گے ۔ وہ ابوطالب ہوں گے،، (ابوطالب حضرت علیؓ کے والد تھے) ۔

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب آدمی نماز میں مصروف ہوتا ہے اسے اگلی پچھلی بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتیں ہیں ۔ فرمایا کہ میں نے حدیث شریف کی کتب میں دیکھا ہے کہ آلصّلوة نُور ۔ یعنی نماز روشنائی ہے ۔ وقت نماز کوئی شے پنہاں نہیں رہ سکتی ۔ پس آدمی جب نماز پڑھنے لگتا ہے تو اسے سب بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں ۔

حضرت ابراھیمؑ کے متعلق فرمایا کہ'' آپ کے والد نے نمرود کے ڈر سے انھیں ایک غار میں پھینکدیا تھا ۔ چنانچہ آپ اس غار میں چودہ برس تک رہے ۔ جس آگ میں آپ کو ڈالا گیا تھا اس کے متعلق فرمایا کہ اس کی تپش ساٹھ کوس تک جاتی تھی ۔ نمرود کے متعلق فرمایا کہ جس مچھر نے اسے ھلاک کیا تھا وہ لنگڑا تھا،، ۔

حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمایا ۔'' ایک مرتبہ انھوں نے حضرت یعقوبؑ کو دیکھکر تعظیم کے لئے گھوڑے سے اترنا چاھا لیکن اس میں ذرا دیر لگ گئی ۔ اس پر جبریلؑ تشریف لائے اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ تم نے گھوڑے سے اترنے میں دیر لگا دی ہے اس لئے تمہاری اولاد میں کوئی پیغمبر نہیں ہوگا،، ۔

حضرت سلیمانؑ کے متعلق فرمایا کہ ''ان کے باورچی خانہ میں ستر ھزار اونٹ روزانہ نمک لاتے تھے ۔ اور وہ روزانہ خرچ ہو جاتا تھا ۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا کہ جب وہ پیدا ہوئے تو فرعون نے ایک تنور گرم کر کے انھیں اس تنور میں ڈلوا دیا،، ۔

ایک مرتبہ مجلس میں درود شریف کی فضیلت کا ذکر آگیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک روز حضرت عثمانؓ بازار سے مچھلی لائے اور اسے بریاں کرنا چاھا ۔ مگر وہ بریاں نہ ہوتی تھی ۔ جس قدر لکڑیاں انبار خانے میں جمع تھیں سب جل گئیں ۔ لیکن

وہ مچھلی اپنی اصلی حالت پر ھی رھی۔ وہ مچھلی رسول اللہؐ کے سامنے پیش کی گئی تو آپ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میں نے دریا میں ایک طائفہ دیکھا تھا جو آپ پر درود بھیجتا تھا۔ میں نے بھی ان کی موافقت میں ایک مرتبہ آپ پر درود بھیجا تھا۔ اللہ نے اس کی برکت سے مجھ پر آگ حرام کر دی ھے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ مہتر جبریل نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ حضور میں آپ کی اور آپ کی اولاد کی خدمت کرتا ھوں۔ امید ھے کہ آپ فردائے قیامت میں میرے حق میں سفارش فرمائیں گے اور اس روز مجھے فراموش نہ کریں گے۔

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کے متعلق فرمایا کہ ''ایک چیونٹی ان کے پاؤں تلے آ کر مر گئی اور اس نے شدت درد سے سخت آہ کھینچی۔ آپ نے چیونٹی کو اٹھا کر خدا سے دعا کی کہ اگر تیری بارگاہ میں میری کچھ بھی عزت ھے تو اس چیونٹی کو زندہ کر دے۔ چنانچہ وہ چیونٹی اسی وقت زندہ ھو گئی،،۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ کنگھی کر رھے تھے کہ آپ کی ڈاڑھی میں سے ایک بال ٹوٹا جسے ھوا اڑا کر یہودیوں کے قبرستان میں لے گئی۔ اس کی برکت سے تین دن تک عذاب ان کافروں پر نہ ھوا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ''ایک بڑھیا روتی ھوئی حضرت مودود چشتی کے پاس آئی اور عرض کیا کہ حضور میرے اکلوتے بیٹے کو بادشاہ نے ناحق مروا دیا ھے۔ آپ یہ سن کر سر دار تشریف لے گئے اور اس لڑکے کی لاش سے کہا کہ اگر تو ناحق مارا گیا ھے تو اٹھ کھڑا ھو۔ لڑکا اسی وقت زندہ ھو گیا،،۔

کہاں تک لکھتا جاؤں سلیم! اب تو میرا ھاتھ بھی تھک گیا ھے۔ یہ ھے نمونہ ان ملفوظات کا۔ زیادہ تفصیل سے دیکھنا چاھو تو انھیں خود دیکھ لو۔ امید ھے انہی اقتباسات سے تمہیں ان حضرات کی قرآنی معلومات اور علمی اور ذھنی سطح کا اندازہ ھو گیا ھوگا۔

اپریل ۱۹۵۵

والسلام
پرویز

تینتیسواں خط

(تصوف قرآن کی روشنی میں)

اس سے پہلے دو خطوں میں سلیم! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تصوف کی ابتدائی تاریخ کیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت دنیا کے مختلف گوشوں میں اسکی کیا حالت تھی۔ اسلام نے اسکے خلاف کسطرح صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن اس کے بعد یہ کسطرح مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو کر عین دین بلکہ ’’مغزدین،، بن گیا۔ نیز یہ کہ ہمارے جلیل القدر صوفیائے کرام کے معتقدات کیا ہیں اور جو ملفوظات ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان کی رو سے ان کے علم کے متعلق کیا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تمہارے آخری سوال کا جواب سامنے آتا ہے کہ جن اجزا سے تصوف مرکب ہے قرآن کی روشنی میں ان کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے کہ اس کی رو سے ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ مرحلہ ذرا دشوار گزار اور غور طلب ہے اس لئے اس خط کو زیادہ توجہ سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

علم کے ذرائع

اصل سوال تک پہنچنے سے پہلے تمہیداً ایک بات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی اور علم حاصل کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ طریقہ کیا ہے؟ مسائل زیرنظر پر خود غور و غرض کرنا۔ دوسروں کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنا۔ کتابوں کے ذریعے یا زبانی —— فطرت کا

مشاہدہ۔ تجربات کے ذریعہ حقائق تک پہنچنا۔ اس میں اقوام سابقہ کے تجربات بھی شامل ھیں جسے تاریخ کہا جاتا ھے۔ یہی وہ ذرائع ھیں جن کی رو سے فراہم شدہ معلومات پرانسان (عقل وفکر سے) غوروتدبر کرے تو اسے علم حاصل ھوتا (یا اس کے علم میں اضافہ ھوتا) ھے۔ یہ طریق علم ھر انسان کے لئے کھلا ھے۔ اس میں جسقدر کوئی محنت کرے گا اتنا ھی اس کا علم زیادہ ھوتا جائے گا۔

وحی

لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ھے جو ان تمام ذرائع سے یکسر الگ اور منفرد ھے۔ وہ یہ کہ خدا کسی انسان کو براہ راست حقائق کا علم عطا کر دے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں ’’وحی،، کہا جاتا ھے اوریہ حضرات انبیاء اکرامؑ سے مخصوص ومختص ھے*۔ یعنی خدا کی طرف سے اس طرح علم عطا ھونے کو وحی کہا جاتا ھے اور جسے یہ علم عطا ھو اسے نبی کہتے ھیں۔ بلا ذریعہ اور بلا واسطہ علم حاصل ھونے کی یہ استثناء (Exception) صرف نبی کے لئے ھے۔ غیر از نبی اس میں قطعاً شریک نہیں ھو سکتا۔ جس انسان (نبی) کو خدا کی طرف سے یہ علم ملتا ھے اس میں اس کے کسب و ھنر کو کوئی دخل نہیں۔ یعنی یہ نہیں ھوسکتا کہ وہ (دیگر علوم کی طرح) اس علم کو (بھی) محنت اور ریاضت سے حاصل کرلے یا اس میں اضافہ کر سکے۔ محنت اور ریاضت سے حاصل کرنا تو ایک طرف، اسے وحی ملنے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ھوتا کہ اسے وحی ملنے والی ھے۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ھے کہ وَكَذَالِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحاً مِّنْ اَمْرِنَا۔ اس طرح ھم نے تیری طرف (اے رسول) اپنے امر کو بذریعہ وحی نازل کیا۔ مَاكُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْكِتَابُ وَلَاالْاِیْمَانُ (۴۲/۵۲) تو جانتا نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ھیں اور ایمان کیا ھوتا ھے؟ دوسرے مقام پر ھے۔ وَمَاكُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ يُّلْقٰى اِلَيْكَ الْكِتَابُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (۲۸/۸۶) تو اس کی امید

---

* اس میں شبہ نہیں کہ وحی کا لفظ قرآن میں اور معنوں میں بھی استعمال ھوا ھے۔ لیکن ھماری مراد اُس علم سے ھے جو خدا کیطرف سے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے براہ راست ملتا تھا۔

ہی نہیں کر سکتا تھا کہ تیری طرف کتاب آئیگی۔ یہ صرف تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ تجھے وحی عطا ہوئی ہے)۔

وحی کا یہ سلسلہ حضرات انبیاء اکرام؏ کے ساتھ چلا آرہا تھا تاآنکہ قرآن میں پیغام خداوندی کی تکمیل ہو گئی۔ اس نے وحی کے ذریعے جو ہدایت انسانوں تک پہنچانی تھی وہ مکمل ہو گئی۔ اس میں نہ تغیروتبدل کی ضرورت باقی رہی اور نہ حک و اضافہ کی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ تیرے رب کی باتیں صدق اور عدل کے ساتھ اتمام تک پہنچ گئیں۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٦/١١٦)۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

ختم نبوت

سلسلہ ہدایت تکمیل تک پہنچ گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (١٥/٩)۔ یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد خدا نے اعلان کر دیا کہ حضور نبی اکرم خاتم النبیین ہیں (٣٣/٤٠)۔ آپ کی ذات پر سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا۔

سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو خاص ذریعہ علم تھا (جس میں کسی انسان کو خدا کی طرف سے عام ذرائع علم کے بغیر براہ راست علم حاصل ہوتا تھا) اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے سلیم! کہ اگر (نبی اکرمؐ کے بعد) کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ اسے خدا کی طرف سے براہ راست علم عطا ہوتا ہے، تو وہ شخص نبوت کے بند دروازے کو کھولنے کا مدعی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے جس میں کسی التباس یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ اس کے بعد کسی انسان کو خدا کیطرف سے براہ راست علم مل سکیگا۔ اس میں (نبی اکرمؐ کے بعد) کسی شخص کی طرف وحی یا الہام کئے جانے کے امکان کا کوئی ذکر نہیں۔

لیکن تصوف کی ساری عمارت اس بنیاد پر اٹھتی ھے که (رسول اللهؐ کے بعد بھی) انسانوں کو خدا کیطرف سے براہ راست علم حاصل ھو سکتا ھے (اور ھوتا ھے)۔ اس علم کو (وحی کے بجائے) الھام یا کشف کہا جاتا ھے اور جسے یه علم ملتا ھے اسے (نبی کے بجائے) ولی یا صوفی کہتے ھیں۔ اس مختصر سی تشریح ھی سے تم نے دیکھ لیا ھوگا سلیم! که تصوف کا دعویٰ بالفاظ دیگر نبوت کا دعویٰ ھے۔ اس کا نام وحی کے بجائے الھام یا کشف، اور اس کے مدعی کا نام نبی کے بجائے ولی، رکھ لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے یه دعاوی تمھاری نظروں سے گزر چکے ھیں که *

> جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل۔ غوث۔ قطب لیتے ھیں .... اگرچه اولیاء انبیاء کے تابع ھوتے ھیں لیکن صاحب وحی دونوں ھوتے ھیں .... ایک طور پر مادۂ کشف و الھام اور مادۂ وحیٔ رسول ایک ھے .... صاحب کشف، الله تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ھونے کی وجه سے خاتم النبیین کے موافق ھے .... ان کا الله تعالیٰ سے لینا عین رسول الله کا لینا ھے .... خداتعالیٰ ایسے خلیفه کو وھی احکام شرعیه اور علوم دیتا ھے جو خاص کر انبیاء کو دئے گئے تھے۔ (فصوص الحکم)

میں نہیں سمجھتا که ان تصریحات کے بعد، اس ضمن میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ھے که دعوئے الھام اور دعوئے نبوت اصل کے اعتبار سے ایک ھی ھے (یہی وہ دروازہ تھا جس سے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نبرت کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے داخل ھوئے تھے)۔ بعض لوگ کہتے ھیں که وحی اور الھام میں فرق یه ھے که وحی کے ذریعے حاصل شده علم یقینی ھوتا ھے اور الھام کی رو سے حاصل شده علم میں شک کی گنجائش ھو سکتی ھے۔ لیکن یه محض اعتراض

---

* یه تمام باتیں تفصیلاً اس سے پہلے ایک خط میں لکھی جا چکی ھیں جو طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ھوا تھا۔

سے بچنے کے لئے ایک آڑ وضع کر لی گئی ہے۔ اس میں وزن کچھ نہیں۔ اگر الہام خدا کیطرف سے عطا شدہ علم ہے تو اس میں شک وشبہ کا کیا سوال؟ اور اگر اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے تو وہ علم خدا کیطرف سے عطا شدہ ہو نہیں سکتا۔ بعض کہدیتے ہین کہ اس علم میں تو شک وشبہ نہیں ہوتا لیکن صاحب الہام کو اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صاحب الہام کی ناپختگی کی دلیل ہے۔ جب وہ پختگی کے مقام پر پہنچ جائے (جسے ابن عربی نے انسان کامل۔ یا غوث اور قطب سے تعبیر کیا ہے) تو وہ اپنے الہام کے سمجھنے میں بھی غلطی نہیں کریگا۔ جب صورت یہ ہے کہ خدا اسے ''وحی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر انبیاءؑ کو دئے گئے تھے،، تو اس قسم کا صاحب الہام یقیناً پختگی کے مقام تک پہنچا ہوا ہوگا۔ ورنہ ایسے شخص کو اس قسم کا علم رکھنے سے کیا حاصل جو اسے صحیح طو پر سمجھ ہی نہ سکے؟

اب تم پوچھو گے کہ ہمارے ہاں ''کشف والہام،، کا تصور آ کہاں سے گیا؟

تصور کہاں سے آیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں سے تصوف کا تصور آیا وہیں سے کشف والہام کا تصور آ گیا۔ قرآن میں نہ وہ ہے، نہ یہ۔ قرآن میں کشف کا لفظ ان معانی میں کبھی نہیں آیا۔ باقی رہا الہام۔ تو (ل ہ م) کے مادہ سے ایک جگہ لفظ اَلْہَمَہَا آیا ہے۔ سورہ الشمس میں ہے۔ وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاھَا۔ فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَا (۹۱/۷-۸) ''لہم،، کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے اندر کسی چیز کو رکھ دینا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ نفس انسانی اور وہ موثرات جو اسے سنوارتے اور اسکی تکمیل کرتے ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اس کے اندر اس کا فجور اور اس کا تقویٰ رکھ دئے گئے ہیں۔ یعنی اس کے اندر بگڑنے اور بننے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ سارے قرآن میں یہی ایک مقام ہے جہاں اَلْہَمَ کا لفظ آیا ہے۔ اسے اس ''الہام،، سے کیا تعلق ہے جس پر تصور کی عمارت استوار ہوتی ہے؟

یاد رکھو سلیم! ختم نبوت کے بعد، علم انسانی کا ذریعہ' عقل وفکر ہے۔ باقی رہا خدا کیطرف سے براہ راست انکشاف حقیقت۔ سو وہ قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اور قرآن

غوروتدبر سے سمجھ میں آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ختم نبوت کے بعد علم کے ذرائع ہیں قرآن کریم اور فہم و تدبر۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ کسی شخص کا یہ دعویٰ کہ اسے خدا کیطرف سے براہ راست حقائق کا علم ہوتا ہے، دعویٰ نبوت ہے۔ لیکن ایک نہج سے دیکھئے تو اس قسم کا مدعی اپنے آپ کو انبیاء سے بھی اونچا لے جاتا ہے۔ انبیاء کی یہ کیفیت ہے کہ جب اللہ انہیں کسی حقیقت کا علم دے دیتا ہے تو وہ اس علم کو پا لیتے ہیں۔ جب وہ وحی نازل نہیں کرتا تو یہ بے بس ہوتے ہیں۔ وحی کا لے آنا (یعنی خدا سے براہ راست علم حاصل کر لینا) ان کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس تصوف کا دعوےٰ یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کسب وہنر سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ خدا سے براہ راست علم حاصل کر لے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی محنت سے اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لیتا ہے کہ وہ مستور حقائق کو بے نقاب دیکھ لے وہ اس شخص سے (معاذ اللہ) یقیناً بلند درجے پر ہوتا ہے جو اس انتظار میں ہے کہ خد اسکی طرف وحی بھیجے تو اسے حقیقت کا علم ہو۔

تم نے دیکھا سلیم! تصوف کا دعوےٰ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے!

اب آگے بڑھو۔ تصوف کا دوسرا دعوےٰ (یا یوں سمجھو کہ پہلے دعوےٰ کا

غیب کا علم

فطری نتیجہ) یہ ہے کہ اس سے غیب کی باتوں کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ غیب کے علم کے متعلق قرآن کریم میں (بزبان نبی اکرمؐ) کہا گیا ہے کہ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ (۱۰/۲۰) ”ان سے کہدے کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے“۔ دوسری جگہ ہے۔ قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (۲۷/۶۵) ”ان سے کہدو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں خدا کے سوا کوئی نہیں جو غیب کا علم رکھتا ہو“۔ اور تو اور، خود نبی اکرمؐ نے اس کا اعلان فرمایا کہ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۱۱/۳۱)۔ ”میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ ہی یہ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں“۔

قرآن کی ان تصریحات سے واضح ہے سلیم ! کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالےٰ اپنے رسولوں کو وحی کے ذریعے بعض امور یب کا علم دید یتا ہے۔ سورہ الجن میں ہے عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ أَحَدًا۔ خدا عالم الغیب ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دیتا کہ کوئی خص اس کے علم غیب پر قدرت (یا غلبہ) حاصل کر لے۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ سُوْلٍ ($\frac{۷۲}{۲۶-۲۷}$) ہاں ! جسے وہ رسول بنانا پسند کرے (تو اسکی طرف علوم غیب وحی کر دیتا ہے)۔ مثلاً قرآن میں حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد رمایا ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْكَ ($\frac{۳}{۴۴}$) یہ غیب کی باتیں یں جو تیری طرف وحی کی گئی ہیں (نیز $\frac{۱۱}{۴۹}$ ؛ $\frac{۱۲}{۱۰۲}$)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے سلیم ! اگر کوئی شخص غیب جاننے کا دعوےٰ کرتا ہے (پیش گوئیاں بھی اسی میں داخل ہیں) تو وہ یا دعوےٰ نبوت کرتا ہے کیونکہ قرآن کی رو سے غیب کا علم اللہ کی طرف سے صرف حضرات انبیائے کرامؑ کو دیا جاتا ہے)۔ اور یا جھوٹ بولتا ہے (کیونکہ انبیاء کے علاوہ کسی اور کو غیب کا علم دیا نہیں جاتا)۔ اگر وہ دعوےٰ نبوت کرتا ہے تب بھی وہ جھوٹا ہے کیونکہ سول اللہؐ کے بعد باب نبوت بند ہو چکا ہے۔

خدا کو دیکھنا

اب اور آگے بڑھو۔ تصوف کا دعوےٰ یہ ہے کہ صاحب کمال صوفی، خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شب اللہ کے ربار میں حاضر ہوتا ہے اور وہاں سے اپنے فیصلوں پر صاد کرا کر لاتا ہے۔ اتنا ہی ہیں۔ وہ خدا سے جھگڑتا ہے اور اپنی بات منوا کر رہتا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ تمام عاوی باطل ہیں۔ جہانتک خدا کو دیکھنے کا تعلق ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ۔ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ۔ وَهُوَ اللَّطِيْفُ لْخَبِيْرُ ($\frac{۶}{۱۰۳}$) ”نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں۔ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔، وہ نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین۔ باخبر

ہے''۔ اور تو اور، اگر کسی نبی کے دل میں بھی اس کی آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خدا کو دیکھ سکے تو اسے بھی کہدیا گیا کہ لَنْ تَرٰانِیْ (۷/۱۴۳) ''تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی قرآن میں کہیں نہیں کہ حضور نے خدا کو دیکھا تھا۔ قوم بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا جب کہا تھا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللہَ جَھْرَۃً (۲/۵۵) ''ہم تیری بات نہیں مانیگے جب تک خدا کو کھلے بندوں نہیں دیکھ لینگے''۔ اس تقاضے کے جواب میں جو کچھ ہوا قرآن اس پر شاہد ہے۔ ان حالات میں کسی کا یہ کہنا کہ وہ ذات خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔

معرفت

خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کی رو سے تصوف کا مطالبہ ایمان کا نہیں، عرفان (معرفت) کا ہے۔ یعنی خدا کو ماننا نہیں بلکہ خدا کو پہچاننا۔ خدا کو پہچاننے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم کائنات (اور قرآن کریم) پر غور و تدبر سے خدا کی خلاقیت اور دیگر صفات کا علیٰ وجہ البصیرت اندازہ کریں اور اسطرح خدا کو پہچانیں۔ اس فکری طریق سے خدا کے متعلق اندازہ کرنے میں بھی انسان غلطی کر سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ایسے لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ مَا قَدَرُوا اللہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (۶/۹۲)۔ ''انہوں نے خدا کے متعلق ویسا اندازہ نہیں لگایا جیسا اندازہ لگانے کا حق تھا''۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے متعلق جو کچھ بتانا تھا اسے وحی کے ذریعے (قرآن کریم میں) بتا دیا۔ اس میں بھی اس نے صرف اپنی صفات کے متعلق بتایا ہے۔ خود ذات خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کہ ذات خداوندی کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا ذہن انسانی کے لئے ناممکن ہے۔ محدود ادراک، لامحدود کی کنہ و حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے ذات خداوندی پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کے عرفان کا مطالبہ کہیں نہیں کیا۔ اور تو اور، خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ حضورؐ نے خدا کی ''معرفت'' حاصل کر لی تھی۔ اس کی ذات کا ادراک تو ایک طرف اسے کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ

شَیْءٌ (۴۲/۱۱) خود خدا کا ارشاد ہے۔ علاوہ بریں اس نے اپنی جو صفات بیان کی ہیں ان کے علاوہ اگر انسان اپنے ذہن سے اسکی کوئی اور صفت بیان کرنا چاہے تو قرآن اسے بھی صحیح قرار نہیں دیتا اور کہدیتا ہے کہ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ (۶/۱۰۱ ودیگر مقامات)۔ ''لوگ جو کچھ اس کے متعلق کہتے ہیں وہ اس سے بلند اور پاک ہے،،۔ لہذا جس خدا کی یہ کیفیت ہو اس کے متعلق یہ دعوےٰ کہ ہم ذات خداوندی کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں، قرآن کی تعلیم کے یکسر منافی ہے۔ انسان نہ خدا کی ذات کا مشاہدہ کر سکتا ہے نہ (ان معنوں میں) اس کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

مرادیں پوری کرنا

تم نے کبھی اس پر غور کیا سلیم! کہ پیروں فقیروں کے گرد اسقدر ہجوم کیوں رہتا ہے؟ اس لئے کہ یہ ''لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں،،! یہ جس سے بگڑ جاتے ہیں اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ جس سے خوش ہو جاتے ہیں اس کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ یہ لوگوں کو اولاد دیتے ہیں۔ شفا عطا کرتے ہیں۔ دولت بخشتے ہیں۔ منصب ومراتب دلاتے ہیں۔ مقدمات ان کے حق میں فیصل کراتے ہیں۔ ان کے دشمنوں کو تباہ وبرباد کرتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی سب مرادیں پوری کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی کو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ نفع اور نقصان کے لئے اللہ نے محکم اور اٹل قوانین اور اسباب مقرر کر رکھے ہیں۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نفع یا نقصان ان اسباب کے ذریعے ہی پہنچا سکتا ہے۔ ان سے الگ ہٹ کر کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور تو اور خود نبی اکرمؐ سے کہلوا دیا گیا کہ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (۷۲/۲۱)۔ ''ان سے کہدو کہ میں تمہارے لئے کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا،، دوسروں کے لئے تو ایک طرف، خود اپنی ذات کے لئے بھی نہیں۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ ان سے کہدو کہ میں اپنے آپ کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، یہ سب اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا

ہے۔ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ (۷/۱۸۸)۔ ’’میں اگر غیب جانتا تو اپنے لئے دنیا بھر کے مفاد جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو بھی نہ سکتی،،۔ لیکن مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے جن میں کوئی شخص تغیروتبدل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی ان کے نتائج کو روک سکتا ہے۔

میں نے تمہیں بتایا تھا سلیم! کہ علمائے عمرانیات کی تحقیق کی رو سے ’انسان پر پہلا دور یہ آیا تھا کہ جب وہ کسی بڑی قوت سے ڈرتا تو اس کے سامنے گڑگڑانے لگ جاتا۔ ہاتھ جوڑتا۔ پاؤں پڑتا۔ منت وخوشامد کرتا۔ اور اسطرح اسے راضی کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے عہد پرستش (Age of Worship) کہتے ہیں۔ (یاد رکھو! سلیم یہ گفتگو اس انسان کے متعلق ہو رہی ہے جس تک وحی کی روشنی نہیں پہنچی تھی)۔

عصر سحر

اس کے بعد ان میں کچھ سیانے پیدا ہو گئے جنہوں نے ان سے کہا کہ ان بڑی قوتوں سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں ایسے طریقے بتاتے ہیں جن سے یہ قوتیں مجبور ہو کر تمہاری مرضی کے مطابق کام کرنے لگ جائیں۔ اس کے لئے انہوں نے جنر منتر۔ گنڈے تعویز۔ ٹونے ٹوٹکے۔ چلّے مراقبے۔ وغیرہ ایجاد کئے۔ اسے عصر سحر (Age Of Magic) کہتے ہیں۔ تصوف اس ’’عصر سحر،، کی یادگار ہے۔ اس میں سمجھا یہ جاتا ہے کہ ایک ’’ولی اللہ‘‘ میں اسکی قوت ہوتی ہے کہ وہ خدا کے قانون کے خلاف، جو کچھ چاہے کر دے۔ یہی عقیدہ لوگوں کو ان کے گرد جمع کرتا اور ان سے سجدے کراتا ہے۔

مردوں کی پرستش

پیروں فقیروں کی اس قوت اور اختیار کے متعلق اتنا ہی نہیں سمجھا جاتا کہ وہ ان کی زندگی تک محدود ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے اختیارات کی وسعتیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں اور ان کی قبریں مرجع انام بن جاتی ہیں۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ قائم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے تمام حالات سے باخبر ہیں۔ ہماری سب باتیں سنتے ہیں اور دلوں کے حالات تک سے

سے واقف ھیں ۔ ھماری فریاد سنتے ھیں اور مدد بھی کرتے ھیں ۔ حالانکہ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ھے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے ۔ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۔ اور اگر وہ تمہاری پکار سن بھی لیتے تو وہ اس کا جواب نہ دے سکتے (۳۵/۱۴) وہ تمہاری کیا سنینگے ۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم وشعور نہیں کہ کب اٹھائے جائینگے ۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱) ۔

یہ ھے سلیم ! قرآن کی رو سے (زندہ اور مردہ) ”پیروں فقیروں“ کے اختیارات کا عالم جن کے متعلق تصوف کی رو سے عقیدہ یہ ھے کہ خدا کے محکمہ قضا و قدر پر انہی کا تصرف ھوتا ھے اور زمین کے اوپر جس قدر (زندہ) مخلوق بستی ھے ان کے تمام معاملات کا فیصلہ زیر زمین بسنے والی (مردہ) دنیا کے ھاتھ میں ھوتا ھے ۔ تم نے ”مردہ بدست زندہ“ کا محاورہ سنا ھوگا ۔ لیکن تصوف میں اس کے الٹ ھوتا ھے ۔ وھاں کا قانون یہ ھے کہ ”زندہ بدست مردہ“ ۔

اولیاء اللہ

تصوف کی رو سے اولیاءُ اللہ کا ایک الگ گروہ مانا جاتا ھے ۔ ان کی خصوصیات عام جماعت مومنین سے مختلف ھوتی ھیں اور ان کی پہچان کے طریقے بھی الگ ھوتے ھیں ۔ یہ تصور بھی قرآن کی تعلم کے خلاف ھے ۔ قرآن کریم مؤمنین ھی کو ”اولیاءُ اللہ“ (اللہ کے فرماں بردار بندے ۔ یا اللہ کے دوست) کہکر پکارتا ھے ۔ سورۂ یونس میں ھے اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اس حقیقت سے آگاہ رھو کہ اللہ کے فرماں بردار بندے، اس کے دوست، وہ ھیں جن پر نہ کسی قسم کا خوف ھوتا ھے نہ حزن ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۲-۶۳) ۔ (یہ کوئی الگ گروہ نہیں ھوتا) یہ وھی لوگ ھیں جو ایمان لاتے ھیں اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ھیں ۔ اس سے یہ حقیقت واضح ھو گئی سلیم ! کہ اولیا اللہ ، مومنین اور متقین ھی کا دوسرا نام ھے ۔ ان کا کوئی الگ گروہ نہیں ھوتا ۔

اولیاء اللہ کی زندگی

تصوف کی رو سے ''اولیائ اللہ،، کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یہ دنیا، دنیا داروں کے لئے ہوتی ہے۔ ''اللہ والوں،، کی دنیا، روحانی دنیا ہوتی ہے۔ اللہ والے اس دنیا میں غریب و محتاج۔ بیکس و بے بس۔ مفلوک الحال۔ خستہ وخراب رہتے ہیں۔ شکستہ جھونپڑی۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ ایک مٹکا۔ ایک پیالہ۔ ایک کشکول' یہ کل متاع حیات۔ لیکن اپنی روحانی دنیا کے بادشاہ۔ قرآن اس کے برعکس کہتا ہے کہ اولیاءاللہ کی نشانی یہ ہے کہ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ ان کے لئے اِس دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبریاں اور خوش حالیاں ہیں۔ اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اس کے بعد ہے لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللهِ۔ اللہ کی ان باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یعنی اولیائ اللہ کی اس دنیا کی زندگی کو نہایت شگفتہ و شاداب ہونا چاہئے۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے۔ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰/۶۴)۔ یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن کی رو سے

(۱) اولیائ اللہ کی کوئی الگ جماعت نہیں ہوتی۔

(۲) وہ مومنین ہی کو اولیائ اللہ کہتا ہے۔ اور

(۳) ان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان کی اس دنیا کی زندگی بڑی شگفتہ و شاداب ہوتی ہے۔

(اس نکتہ کی مزید وضاحت ذرا آگے چل کر بیان کی جائیگی)

تصوف کا دعوےٰ یہ ہے کہ جو طریق اس نے تجویز کیا ہے اس سے انسان کا

تزکیئہ نفس

,, تزکیئہ نفس '، ہوجاتا ہے۔ پہلے تم اس اصطلاح کا مفہوم سمجھ لو۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روح' خدا کی ذات کا ایک حصہ ہے جو اپنے اصل سے الگ ہو کر مادہ کے دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اسے ان آلائشوں سے پاک و صاف کرنا، تا کہ یہ اپنی اصل سے جا کر مل جائے،

مقصود حیات ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک „تزکیہ'' کے معنی ھیں انسانی روح کا مادی آلائشوں سے پاک کرنا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھو سلیم! کہ انسانی روح کے متعلق یہ تصور (کہ وہ ذات خداوندی کا حصہ ہے جو اپنی اصل سے الگ ھو کر مادی غلاظتوں سے ملوث ھو چکی ہے) کسقدر قرآن کے خلاف ہے! ذات (Personality) انسان کی ھو یا خدا کی، نا قابل تقسیم وحدت (Indivisible Whole) ھوتی ہے جس کے حصے بکھرے نہیں ھو سکتے۔ اس لئے یہ کہنا یکسر خلاف حقیقت ہے (اور قرآن سے اسکی کوئی سند نہیں مل سکتی) کہ انسانی روح ذات خداوندی کا حصہ ہے۔

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے

پھر مادہ (Matter) کو اسقدر غلیظ اور قابل نفرت سمجھنا' قرآنی تعلیم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ قرآن اس ذھنیت اور تصور کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ مادی کائنات کے متعلق کہتا ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا۔ „کائنات کی پستیوں بلندیوں اور میں جو کچھ ہے ہم نے اسے باطل نہیں پیدا کیا،، یعنی اس کا قابل نفرت (غلیظ اور نا پاک) ھونا تو ایکطرف یہ بیکار اور رائگاں بھی نہیں۔ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ یہ ان لوگوں کا ظن ہے جو کفر کرتے ھیں۔ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) سو جو لوگ (اسطرح) کفر کرتے ھیں جہنم کی آگ کی وجہ سے ان کی تباھی ہے،،۔ تم نے غور کیا سلیم! قرآن نے کیا بات کہی؟ اس کا کہنا یہ ہے جو لوگ اس مادی دنیا کو باطل سمجھتے ھیں وہ مومن نہیں' کافر ھیں — اور تصوف کی بنیاد ھی اس تصور پر ہے کہ دنیا باطل ہے۔ اس سے دور بھاگنا اور روح کو اس کی آلائشوں سے پاک و صاف کرنا مقصود زندگی ہے۔

تزکیۂ نفس کا قرآنی مفہوم

„تزکیۂ نفس،، کے معنی انسانی ذات کو مادی آلائشوں سے پاک اور صاف کرنا۔ نہیں۔ اس کے معنی انسانی ذات کی نشوونما (Growth Or Development) ھیں۔ قرآن کی رو سے انسانی

زندگی کا مقصود و منتہیٰ، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ یہ نشوونما، مال و دولت سے نفرت کرکے فقروفاقہ کی زندگی بسر کرنے سے نہیں ہوسکتی۔ قرآن کی رو سے اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان انتہائی محنت سے مال و دولت کمائے اور پھر اسے دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے عام کر دے۔ سورۃ وَالَّیْلِ میں ہے کہ جہنم کے عذاب سے محفوظ وہ رہیگا اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی۔ ($\frac{۹۲}{۱۸}$) جو اپنے مال کو۔ (بلکہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی سب کچھ) دوسروں کی پرورش کے لئے دیدے تا کہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما (تزکیہ) ہو جائے۔ تم نے دیکھا سلیم ! قرآن کی رو سے تزکیۂ نفس کا طریقہ کیا ہے ؟ کما کر دوسروں کی پرورش کے لئے عام کرنا۔ نہ یہ کہ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنا۔ جو شخص اپنے آپ کو فقیر (صوفی) کہتا ہے، وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار جَو کی روٹی ہی کیوں نہ کھائے، وہ ہوتی تو دوسروں کی کمائی کی ہے۔ یہ چیز دنیا سے نفرت کرنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان مال و دولت نہ کمائے۔ بہرحال یہ ہے ”تزکیۂ نفس“ کا وہ مفہوم اور وہ طریقہ جو قرآن بتاتا ہے۔ اور وہ ہے وہ مفہوم اور وہ طریقہ جو تصوف کے ہاں سے ملتا ہے۔ فرق ان دونوں کا تمہارے سامنے ہے۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ تصوف، رہبانیت کی زندگی سکھاتا ہے۔ یعنی انفرادی زندگی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تصورِ حیات عیسائی راہبوں کا خود وضع کردہ ہے۔ خدا کا متعین فرمودہ نہیں ($\frac{۵۷}{۲۷}$)۔ خدا نے جماعت مومنین کو ”اُمت“ بنایا ہے ($\frac{۳}{۱۰۹}$)۔ انہیں اجتماعی زندگی کے طور طریقے سکھائے ہیں۔ ان سے تاکید کی ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ($\frac{۸۹}{۲۹}$)۔ میری جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو انفرادی زندگی مت بسر کرو۔ میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر، اجتماعی زندگی بسر کرو۔ اس سے تم جنت میں جانے کے قابل ہو سکوگے — اس دنیا میں بھی، اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی — لہذا، تزکیۂ نفس انفرادی زندگی سے نہیں ہوتا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرے اور اسطرح تمام افراد کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے۔

اجتماعی زندگی

اب سلیم! تم تصوف کے اس گوشے کیطرف آؤ جو اسکی اصل و بنیاد ہے۔ اس گوشے کو سمجھنے کے لئے اس کہانی کو یاد کرو جو میں نے پچھلی گرمیوں میں تمہیں سنائی تھی اور جو دبستانِ تصوف میں داخل ہونے والے ''طالب علم'' کو پہلے دن یاد کرائی جاتی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک بزرگ تھے صاحبِ کمال۔ اور ایک تھا ان کا مرید۔ یہ دونوں دریا کے اس پار رہتے تھے اور ان کی خانقاہ دریا کے اس پار تھی۔ یہ ہر روز صبح اٹھتے اور خانقاہ کا رخ کرلیتے۔ آگے آگے پیر۔ پیچھے پیچھے ان کا مرید۔ جہاں سے انہوں نے دریا پار کرنا ہوتا تھا وہاں نہ پُل تھا نہ کشتی۔ لیکن پیر صاحب لب دریا آتے اور رواں دواں دریا پر چلتے چلے جاتے (جیسے سڑک پر چل رہے ہیں)۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کا مرید بھی دریا پر گامزن ہوجاتا۔ اس لئے کہ انہوں نے اسے بتا رکھا تھا کہ جب دریا آئے تو تم نے میرا نام لیکر پانی پر قدم رکھ دینا اور جب تک اس پار نہ پہنچ جاؤ میرا نام لیتے چلے جانا۔ برسوں اسی طرح گزر گئے۔ صبح دریا کو اِدھر سے اُدھر اور شام کو اُدھر سے اِدھر پار کرلیتے — آگے آگے پیر۔ پیچھے پیچھے پیر کا نام جپتے ہوئے مرید۔

وسیلہ

ایک دن عین دریا کے بیچ میں پہنچکر پیر صاحب نے دیکھا کہ ان کا مرید ان کے پیچھے پانی میں غوطے کھا رہا ہے اور چلا رہا ہے کہ یا حضرت! بچائیو۔ انہوں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑا اور دریا کے پار لے گئے۔ وہاں جا کر پوچھا کہ آج کیا ہؤا تھا جو تم ڈوبنے لگے تھے؟ اس نے دست بستہ کہا کہ حضور! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ میں ہر روز دیکھتا تھا کہ آپ بھی میرے آگے آگے منہ میں کچھ کہتے رہتے ہیں۔ آج میں نے ذرا آگے بڑھکر سنا تو آپ کہہ رہے تھے ''یا اللہ یا اللہ''۔ میں نے سوچا کہ جب آپ اللہ کا نام لیکر پار اترتے ہیں تو میں آپ کا نام کیوں لوں۔ میں بھی اللہ کا نام کیوں نہ لوں! چنانچہ میں نے آپ کے نام کی جگہ ''یا اللہ! یا اللہ'' کہا اور گڑم سے پانی کے اندر پہنچ گیا۔

پیر صاحب مسکرائے اور کہا کہ تو نے کبھی اللہ میاں کو دیکھا ھے؟ اس سے کچھ جان پہچان ھے؟ اس نے کہا کہ نہیں یا حضرت! میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میری اس سے جان پہچان نہیں۔ پیر صاحب نے کہا کہ بھائی! جس سے جان پہچان نہ ھو وہ تمہارے بلاوے پر تمہاری مدد کو کسطرح آسکتا ھے؟ میری اس سے جان پہچان ھے، میں اسے بلاتا ھوں۔ تمہاری مجھ سے جان پہچان ھے، تم مجھے پکارو۔ کرتا تو سب کچھ وھی ھے لیکن اس تک مرشد کے وسیلے سے پہنچا جاتا ھے۔ تم دوپہر کے وقت سورج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو۔ کبھی سورج کو نہیں دیکھ سکو گے۔ آنکھیں چندھیا جائینگی۔ لیکن پانی کا پیمانہ لے کر اس میں سورج کو دیکھو۔ وہ پورے کا پورا نظر آ جائیگا*۔ تمہاری آنکھیں اللہ کے جلال کو بے نقاب برداشت نہیں کر سکتیں۔ تم اسے مرشد کے آئینے میں سے ھی دیکھ سکتے ھو۔ براہ راست کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ خود خدا نے حکم دیا ھے کہ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔ اس کی طرف (جانے کے لئے) وسیلہ تلاش کرو۔ تم بغیر وسیلے کے اس تک کیسے پہنچ سکتے ھو؟

تمثیلات

سنا تم نے سلیم! اس کہانی کو۔ اور پھر ”سورج اور پانی کے پیمانے“ کی مثال کو؟ حقیقت یہ ھے کہ تصوف کا سارا دار و مدار اسی قسم کی تمثیلات پر ھے۔ ان کی ساری تعلیم تمثیلات کے رنگ میں دی جاتی ھے۔ ایک مثال بیان کرتے ھیں اور پھر جھٹ سے اپنی تعلیم کا ایک ٹکڑہ اس سے چسپاں کر کے مرید سادہ لوح کے سامنے پیش کر دیتے ھیں۔ ان کی مثال یا تشبیہ ایسی برجستہ ھوتی ھے کہ وہ دماغ میں چپک جاتی ھے اور انسان سمجھنے لگتا ھے کہ انہوں نے بہت بڑی حقیقت بیان کر دی۔ مثلاً انہوں نے بتانا یہ ھے کہ جب تک تجلیات خداوندی، قلب مرشد کے اندر سے نہ گذریں شعلۂ عشق بیدار نہیں ھو سکتا۔ اسے وہ اس طرح بیان کرینگے کہ سورج کے سامنے

---

* حالانکہ اسطرح بھی آنکھوں میں اس کی چمک پڑتی ھی ہے اور انسان اسے پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔

روئی کا ڈھیر دن بھر پڑا رہنے دو۔ وہ یونہی ذرا سا گرم تو ہو جائیگا۔ اس میں آگ نہیں لگیگی۔ لیکن سورج کی انہی کرنوں کو آتشیں شیشے میں سے گذارو۔ دو منٹ میں روئی میں آگ لگ جائیگی۔ کسی سے کہو کہ آتشیں شیشے کے بغیر ساری عمر میں روئی میں آگ لگا کر دکھائے۔ یہ ہے سلیم! ان کا طریقۂ تعلیم۔ یہ طریقہ محض شاعری ہے۔ حقیقت نگاری نہیں۔ یہ لطائف ہیں۔ حقائق نہیں۔ تصوف کا سارا دار و مدار شاعری پر ہے — خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں — اور قرآن، شاعری کو آسمانی انقلاب کے داعی کے شایانِ شان قرار نہیں دیتا۔

لیکن ان کے طریقہ تعلیم میں سب سے خطرناک مقام وہ ہوتا ہے جہاں وہ اس قسم کی شاعری کی تائید میں قرآن کی آیات پیش کر دیتے ہیں۔ جیسے مندرجہ بالا مثال میں وسیلہ کے متعلق آیت پیش کی گئی ہے۔ تم مثالوں کو چھوڑو اور اس آیت کو لو۔ یہ سورۃ مائدہ کی آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ ۔
> وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵/۳۵) ۔

وسیلہ کی آیت

اس کا صاف اور سیدھے الفاظ میں ترجمہ ہے — اے ایمان والو! قوانین خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ اختیار) کرو۔ اور اس کا ”وسیلہ“ طلب کرو۔ اور اس کے راستے میں جہاد کرو۔ تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

اس سے یہ حضرات ”خدا تک پہنچنے کے لئے وسیلے“ کی قرآنی سند لاتے ہیں۔ لیکن سلیم! تم یہ سنکر حیران ہوگے کہ ہم جن معنوں میں (اردو میں) وسیلہ کا لفظ بولتے ہیں، عربی زبان میں اس کے معنی اس سے مختلف ہیں۔ عربی زبان میں اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں — قدر و منزلت۔ عزت و تکریم۔ مدارج و مراتب۔ قرب — اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین سے کہا ہے کہ تم قوانین

خداوندی کی نگہداشت کرو۔ . . . . اسطرح اس کے ہاں عزت و مرتبت کی طلب کرو۔ اس کے لئے اس کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ ہے وہ طریق جس سے تم اللہ کے نزدیک واجب التکریم ہو جاؤ گے۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی تم میں سے جو سب سے زیادہ تقوی شعار ہوگا وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ بات کیا تھی اور یہ حضرات اُسے پیش کسطرح سے کرتے ہیں؟ قرآن دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ یہ بڑے بڑے "بزرگ" جنہیں لوگ خدا تک پہنچنے کا "وسیلہ" سمجھتے ہیں۔ خود ان کی یہ حالت ہے کہ وہ بھی خدا کے ہاں اپنی قدر و منزلت کے آرزو مند رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا (۱۷/۵۷)۔ "جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں۔ ان کی خود یہ حالت ہے کہ وہ اپنے رب کے ہاں عزت اور مرتبہ ڈھونڈتے ہیں — وہ بھی جو ان میں سے سب سے زیادہ قریب ہے — وہ خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اس کا عذاب واقعی ایسا ہے جس سے ڈرا جائے"۔ تم غور کرو سلیم! کہ جب بڑے بڑوں کی قوانین خداوندی کے سامنے یہ حالت ہے تو اس تک پہنچنے کا "وسیلہ" کون بن سکتا ہے؟

قرب خداوندی

قرآن کہتا ہے کہ مشرکین، جو خدا کے علاوہ اور معبودوں کی بھی پرستش کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ان معبودوں کی پرستش مقصود بالذات نہیں۔ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں۔ یعنی ہم قرب خداوندی حاصل کرنے کے لئے غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔

(مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى - ۳۹/۳)۔ تم غور کرو سلیم! کیا بعینہ، یہی جواب ان حضرات کیطرف سے نہیں ملتا جو پیر کو خدا تک پہنچنے کا "وسیلہ" قرار دیتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس تک انسان براہ راست نہیں پہنچ سکتا بلکہ کسی کی وساطت سے پہنچ سکتا ہے، ذہنِ انسانی کے اس دور کا پیدا کردہ ہے جس میں خدا کو "بادشاہ" جیسا سمجھا جاتا تھا۔ جسطرح آپ کسی بادشاہ (یا حاکم) تک براہ راست نہیں پہنچ سکتے بلکہ ان لوگوں کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں جو اس کے مقرب ہوں۔ اسی طرح خدا کے متعلق بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ نہ اس تک براہ راست پہنچا جا سکتا ہے۔ نہ اس تک اپنی فریاد پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان ان لوگوں کا ذریعہ تلاش کرے جو "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" ہیں۔

خدا براہ راست سنتا ہے

قرآن کی رو سے خدا کے متعلق ایسا عقیدہ اور تصور یکسر باطل ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۔ جب تجھ سے میرے بندے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہدو کہ میں (ان سے) قریب ہوں۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (اتنا قریب کہ) جب بھی کوئی بلانے والا مجھے بلاتا ہے تو میں اس کے بلاوے کا جواب دیتا ہوں۔ (۲/۱۸۶)۔ قرآن کے اس واضح اعلان سے ظاہر ہے کہ خدا ہر بندے کی پکار کو براہ راست سنتا ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ کہ خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی وسیلہ یا ذریعہ کی ضرورت ہے، قرآن کے اس اعلان کی تکذیب ہے۔ وہ اتنا قریب ہے کہ اس کا ارشاد ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶) "ہم انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔ اب ظاہر ہے کہ جو ذات انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہو اور اس کا اعلان ہو کہ ہم ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتے ہیں اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ اس تک آواز پہنچانے (یا اس تک پہنچنے) کے لئے کسی ذریعے اور وسیلے کی ضرورت ہے، خدا کے ارشاد کے منافی ہے۔

اس مقام پر سلیم! یہ خیال دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جب خدا ہر ایک کی سنتا ہے تو پھر ہر ایک کی مانگ (طلب) پوری کیوں نہیں ہو جاتی؟ اس سوال کا مفصل جواب تو تمہیں میری کتاب ''من و یزداں،، کے عنوان ''مشیت۔ تقدیر۔ دعا،، میں ملیگا (جس کا ملخص میں اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں *) لیکن مختصر جواب قرآن نے اسی آیت کے باقیماندہ حصہ میں دیدیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں ان کی مانگ پوری کروں تو اس کا طریق یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶)۔ انہیں چاہئے کہ پہلے

خدا کیسے سنتا ہے

میری دعوت پر لبیک کہیں۔ میرے قوانین کی اطاعت کریں۔ انہیں اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ اس سے انکے سامنے وہ راستہ آجائیگا جو انہیں ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیگا۔ انہیں اس مقصد کے لئے کسی ''مرشد،، کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کریں جو قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہو۔ پھر ان کی ہر طلب (جو لا محالہ قوانین خداوندی کے مطابق ہی ہوگی) اس معاشرہ کی وساطت سے پوری ہوتی جائیگی۔ یہ ہے سلیم! وہ طریقہ جس سے ہر فرد اپنی آواز خدا تک پہنچا سکتا ہے اور خدا اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس معاشرے کے اندر ہوتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ نہ کہ خانقاہیت کی انفرادی زندگی سے جس کے متعلق قرآن نے کہدیا ہے کہ وہ انسانوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ خدا کا مقرر فرمودہ نہیں (۵۷/۲۷)۔

اس مقام پر سلیم! اتنا اور بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جسے ''قربِ خداوندی،، کہتے ہیں اس سے مراد کیا ہے اور ''مقربین بارگاہِ خداوندی،، سے کون لوگ مراد ہیں؟ جب خدا کا تصور ''بادشاہ،، کا سا قائم کر لیا جائے تو

---

* وہ خط جس کا عنوان ہے ''خدا کا تصور''۔

قرب خداوندی کا مفہوم

اس ”مقربین،، سے مفہوم ایسے لوگ ھونگے جو خدا کے قریب ھوں۔ جو خدا کے رازداں ھوں۔ خدا ان سے صلاح مشورہ کرتا ھو۔ وہ خدا سے لوگوں کی سفارش کرتے ھوں۔ لیکن خدا کے اس تصور کی رُو سے جسے قرآن پیش کرتا ھے، یہ تمام نظریات باطل قرار پاتے ھیں۔ اس تصور کی رُو سے قُرب خداوندی کا مفہوم کچھ اور ھے۔ اسے غور سے سنو۔

جو انسان قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ھے اس کی ذات کی نشوو نما ھوتی جاتی ھے۔ ”ذات کی نشوو نما،، کے متعلق میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ھوں کہ اس سے انسان کے اندر حدود بشریت کے مطابق خدائی صفات کی نمود ھوتی جاتی ھے۔ اسی کو قُرب خداوندی کہتے ھیں۔ یعنی جس انسان میں جسقدر صفاتِ خداوندی کی نمود ھوگی وہ اسی قدر خدا کا مقرب ھوگا۔ اس سے صرف اسکی اپنی ذات کو فائدہ پہنچتا ھے۔ یہ نہیں ھوتا کہ وہ ”خدا کا مقرب،، بنکر کاروبار خداوندی میں دخیل ھو جاتا ھے اور ”خدا اور بندوں،، کے درمیان واسطہ بن جاتا ھے۔ کوئی ”مقرب،، نہ خدا کا مشیر ھوتا ھے اور نہ ھی خدا تک بندوں کی سفارشیں پہنچاتا ھے۔ خدا اس سے بہت بلند ھے کہ اس کے ایسے مقرب ھوں۔

یہ بھی کہا جاتا ھے کہ ”اولیاء اللہ“ (یعنی جنہیں تصوف کی اصطلاح میں اولیاء کہا جاتا ھے) خدا سے محبت کرتے ھیں۔ ان کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی ھوئی ھوتی ھے۔ وہ اپنے آپ کو عشق خداوندی کی آگ میں اس شدت سے جلاتے ھیں کہ وہ خود آگ بن جاتے ھیں۔ جسطرح لوھا آگ میں تپانے سے آگ بن جاتا ھے۔

خدا سے محبت کا مفہوم

یہ سب شاعری ھے سلیم! اور اسی تمثیلی انداز بیان کا نتیجہ جس پر تصوف کی بنیاد ھے۔ خدا نے کہیں نہیں کہا کہ انسان کا مقصد زندگی یہ ھے کہ وہ اپنے آپ کو عشق خداوندی کی آگ میں جلا کر خود آگ بن جائے۔ اس سلسلہ میں اھل تصوف کیطرف سے قرآن کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ھے۔ یعنی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (۲/۱۶۵)۔ اس کا عام الفاظ میں ترجمہ یہ ہے کہ "ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قوتوں کو اس کا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اسطرح محبت کرتے ہیں جسطرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت بڑھ کر ہیں"۔ اسی طرح سورۃ آل عمران کی اس آیت سے بھی "خدا سے محبت" کی دلیل لائی جاتی ہے۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳/۳۱-۳۲)۔ اس کا ترجمہ عام الفاظ میں یہ ہے "ان کو کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہارے قصوروں کو معاف کردیگا اور اللہ حفاظت کرنے والا۔ رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہدو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا"۔

غیر مرئی سے محبت ناممکن ہے

قبل اس کے میں تمہیں بتاؤں کہ عربی زبان میں لفظ "محبت" کے معنی کیا ہیں۔ تم یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ لوگے کہ خدا کی ذات انسانی حیطۂ ادراک سے بالا ہے اس لئے جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے (خواہ وہ اولاد سے محبت ہی کیوں نہ ہو) اس قسم کی محبت خدا سے کی ہی نہیں جا سکتی۔ تم کسی آن دیکھی چیز سے محبت کر نہیں سکتے۔ یہی وہ نفسیاتی دشواری تھی جس کی وجہ سے (محسوسات کے خوگر انسان کو) خدا کو انسانی شکل (اوتاروں کے روپ) میں ڈھالنا پڑا۔ اسکی مورتیاں بنانی پڑیں۔ اور یہی وہ مشکل تھی جس کے پیش نظر خود ہمارے تصوف میں "مجاز سے حقیقت" کیطرف جانے کا راستہ اختیار کیا گیا اور مضطرب و بیقرار عاشق کی جبینِ نیاز میں تڑپنے والے سجدوں کو کہنا پڑا کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

مجاز و حقیقت

محسوسات کا خوگر انسان، کسی غیر مرئی و غیر محسوس حقیقت سے محبت نہیں کرسکتا۔ جو اس کے مدعی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی مجازی پیکر کو حقیقت بنا لیتے ہیں یا حقیقت سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں۔ تصوف کی ساری شاعری اسی حسین و کیف آور فریب کا مرقع ہے۔ یہی فریب ہے جو رومی کی ”شاخِ نبات،، کو ”معشوق ازلی“ اور حافظ کی شرابِ ناب کو ”بادۂ الست“ کے تفسیری پیرہن پہنا کر سامنے لاتا ہے۔ غالب نے جب کہا تھا کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو یہ، امرِ واقعہ کی ضد تھا۔ بات یہ نہیں کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کہے بغیر بن نہیں پڑتی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بادہ و ساغر کو مشاہدہ حق کی گفتگو کہے بغیر کام نہیں چلتا۔ بہر حال، میں کہہ یہ رہا تھا سلیم! کہ جس قسم کی محبت باہم انسانوں میں ہوتی ہے، خدا کے ساتھ اس قسم کی محبت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ دیکھو کہ آیاتِ مندرجہ بالا میں خدا سے بندوں کی محبت اور خدا کی بندوں سے محبت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

عربی زبان میں لفظ محبت کے معنی ہیں (۱) کسی چیز پر ثابت قدمی سے جم جانا۔ اور (۲) کسی کی حفاظت کرنا۔ اسے بلند کرنا۔ ظاہر کرنا۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کرنا۔ لہذا قرآنی آیات میں ”خدا سے بندوں کی محبت“ کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی ثابت قدمی سے جم کر اطاعت کرنا۔ خود سورۂ آلِ عمران کی آیت (۳/۳۱) میں اَطِیْعُوااللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ کے الفاظ نے ”محبت،، کی یہ تشریح کر دی ہے۔ دوسری طرف خدا کی بندوں سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ خدا ان کی حفاظت کرتا ہے۔ انہیں بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کرتا ہے۔ ان کی

مضمر صلاحیتوں کی نمود اور نشو و نما کرتا ہے۔ یہ چیزیں قوانین خداوندی کی اطاعت کا فطری نتیجہ ہیں۔

یہ ہے سلیم! خدا کی محبت اور خدا سے محبت کا قرآنی مفہوم۔

کرامات

اب ہم سلیم! اُس "طوطے" کی طرف آتے ہیں جس میں تصوف کے اتنے بڑے "جن" کی جان ہے۔ یعنی اولیاء اللہ کی "کرامات"۔ یہی وہ چیز ہے جس نے اس میں اتنی بڑی کشش پیدا کر رکھی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی ذہن، تمام عقلی دلائل اور علمی براہین کو بالائے طاق رکھ کر ان حضرات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ ذرا تصور میں لاؤ اس منظر کو کہ کسی مجمع میں قرآن کریم کے عظیم القدر حقائق و معارف بیان ہو رہے ہیں۔ بیان کرنے والا تاریخی شواہد، عصری انکشافات اور فلسفہ اور سائنس کی بلند ترین اسناد کی روشنی میں قرآنی دعاوی کی صداقت روز روشن کی طرح واضح کر رہا ہے کہ اتنے میں سڑک کے اُس پار کوئی مست ملنگ ہُو حق کا نعرہ لگاتا ہے اور آنکھیں لال کر کے بالوں کو نچوڑتا ہے تو ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپکنے لگ جاتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ یہ سارا مجمع قرآنی حقائق و معارف کو یک قلم چھوڑ کر اُس مست ملنگ کے گرد جا کھڑا ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی ذہن، بایں ہمہ ادعائے علم و تمدن، ہنوز اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ اسے (بچوں کی طرح) بسیط حقائق کے مقابلہ میں محیرالعقول عجائبات زیادہ تیزی سے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ قرآن، انسانی ذہن کی اسی خامی کو دور کرنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن تصوف اسے پھر اسی کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ اسی میں تصوف کی کامیابی کا راز ہے — بزرگوں کی کرامات — یہی وہ وادیٔ حیرت ہے جہاں پہنچکر بڑے بڑوں کی عقلیں گم اور ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اسی سے یہ "مغز دین" قرار پا جاتا ہے۔ آؤ۔ دیکھو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔

تم میری کتاب (معراج انسانیت) کے "معجزات" کے باب پر نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ مخالفین بار بار نبی اکرمؐ سے معجزات کا تقاضا کرتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ ہر بار ان کے مطالبہ کو یہ کہہکر رد کر دیتا ہے کہ ہم نے رسول کو کوئی حِسّی معجزہ نہیں دیا ۔ اس کے معجزات صرف دو ہیں ۔

(۱) یہ کتاب جس کی مثل و نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا ($\frac{۲۹}{۵۱}$) ۔

اور

(۲) خود اس (رسول) کی اپنی زندگی جو سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز ہے ($\frac{۱۰}{۱۶}$) ۔

ان کے علاوہ اگر تم معجزات دیکھنا چاہتے ہو تو قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{۱۰}{۱۰۱}$) ۔ ارض و سمٰوٰت پر غور کرو ۔ قدم قدم پر معجزات دکھائی دینگے ۔

غور کرو سلیم! حضور نبی اکرمؐ کو تو کوئی حِسّی معجزہ نہیں دیا جاتا لیکن یہ حضرات (جو حضورؐ کے متبع ہونے کے مدعی ہیں) ان سے قدم قدم پر کرامات ظہور میں آتی چلی جاتی ہیں ۔ اگر اسلام کا ماحصل کرامات تھا تو سب سے پہلے ان کا ظہور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس سے ہونا چاہئیے تھا اور آپؐ کے بعد صحابہؓ کبار سے ۔ لیکن اُس سارے عہد میں کسی کی کوئی اس قسم کی کرامت دکھائی نہیں دیتی ۔ لیکن جب ان (صوفیاء) کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو ان کی ایک ایک سانس میں کرامات رقص کرتی نظر آتی ہیں ۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

کرامات کی حقیقت

میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں سلیم! کہ کرامات کو دین سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ ایک فنی چیز ہے جسے جس کا جی چاہے حاصل کر لے ۔ یہ قوتِ خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں جنہیں ہر شخص، خاص انداز کی مشق و ریاضت سے پیدا کر سکتا ہے ۔ اس میں نہ کفر و اسلام کی کوئی خصوصیت ہے نہ شرک و توحید کی کوئی تمیز ۔ یہ کچھ سلیم! میں جگ بیتی نہیں کہ رہا ۔ آپ بیتی کہ رہا ہوں ۔ اس داستان کی تفصیل طویل ہے ۔ (اگر کبھی میں نے اپنی زندگی کے تجارب کو قلمبند کیا تو یہ تفاصیل وہاں آسکیں گی) اسوقت

صرف اسقدر بتا دینا کافی ہوگا کہ جن دنوں میں سلوک کی منازل طے کر رہا تھا، ہمارے ہاں (اکثر رات کی تنہائیوں میں) ہندو سنیاسی بھی آیا کرتے تھے۔ ان سے اس قسم کے خارق عادات کرامات سرزد ہوتیں کہ میں ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا۔ میرے دل میں اس زمانے میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ اگر یہ چیزیں دین کا ماحصل (یا نتیجہ) ہیں تو ان مشرکین سے ان کا ظہور کیسے ہو جاتا ہے؟ یہ کھٹک میرے دل میں پرورش پاتی رہی — حتٰی کہ جب میں دہلی سے شملہ پہنچا تو مجھ سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔ میں تحقیق حق کے لئے سادھوؤں کی سمادھیوں میں پہنچا۔ خود ایک یوگی کو اپنے گھر پر رکھا۔ اور اس کی زیر تربیت یوگ کے مراحل طے کئے۔ اور تم یہ سنکر حیران ہوگے کہ اس طریق سے بھی وہی کچھ ظہور میں آنے لگ گیا جس تک میں تصوف کے راستے پہنچا تھا۔ یوں میں نے سلیم! اپنے ذاتی تجربہ سے اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا کہ ”ان کرامات“ کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک فن ہے جس کے حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ تصوف کی ریاضتیں بھی ہیں۔ (مغرب میں اس فن کو بھی ایک قسم کی سائنس بنا دیا گیا ہے اور اس سے کئی قسم کے کام لئے جاتے ہیں جن میں عصبی بیماریوں کا علاج نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔)

دین کی کرامات

دین کی کرامات اور ہوتی ہیں۔ اس سے انسانی دنیا میں وہ انقلاب عظیم برپا ہوتا ہے جس سے باطل کا ہر نظام الٹ کر، اس کی جگہ ایسا نظام متشکل ہو جاتا ہے جو قوانین خداوندی (قرآن کے غیر متبدل اصولوں) پر قائم ہوتا ہے اور جس کا نصب العین دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر، عدل و احسان کو عام کرنا ہوتا ہے۔ قرآن نے ”ایمان و اعمال صالح“ کا یہ نتیجہ بتایا ہے جب کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ، جو ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں حکومت عطا کرے گا۔ جیسی حکومت اس نے

ان لوگوں کو عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ یہ حکومت ان کی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ مقصد اس سے یہ ہوگا کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔ وہ ان کے لئے اس نظام حیات کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، متمکن کر دے۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ اور وہ ان کی حالتِ خوف کو امن میں بدل دے۔ تاکہ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا۔ وہ صرف میرے قوانین کی محکومیت اختیار کریں۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ (۲۴/۵۵)۔ یہ تھا دین کا مقصود، سلیم! تصوف اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کر کے فرار کی راہیں سکھاتا ہے۔ اس سے قرآن نے یہ کہکر متنبہ کیا تھا کہ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵)۔ جو اس واضح راہ نمائی کے بعد اس سے انکار و سرکشی اختیار کریگا تو یہی لوگ ہونگے جو غلط روش پر چلینگے۔

اب سمجھ لیا سلیم! تم نے کہ قرآن کی روشنی میں تصوف کی پوزیشن کیا ہے؟ وہی جو اقبال نے کہا تھا کہ

> تصوف اسلام کی سر زمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔ اور (اس کے امام، ابن عربی کی) فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں۔

اور جب نفس تصوف اسلام کی سر زمین میں اجنبی پودا ہے تو پھر "اسلامی تصوف" اور "غیر اسلامی تصوف" کی تفریق و تقسیم کیا؟ جو نظریہ، تصور، عقیدہ، مسلک یا مشرب، اسلام کی سر زمین میں اجنبی ہو، اس کے "اسلامی" ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انسانیت کو نقصانات

اب رہا یہ کہ تصوف نے انسانیت کو نقصان کسقدر پہنچایا ہے۔ تو اس کی تفصیل کے لئے کئی مجلدات لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن میں تمہیں نہایت مختصر انداز میں یہ بتانے کی کوشش کرونگا کہ خود ان لوگوں نے جن کے ہاں سے ہم نے تصوف کو مستعار لیا ہے (یعنی خود عیسائیوں نے) اس کے نقصانات کے متعلق کیا چیخ و پکار کی ہے۔

تم نے برفو (Briffault) کا تو اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے۔

> یہ تصوف پسند حضرات چاہتے ہیں کہ اِس پراز مصائب اور بدنما انسانی دنیا سے بھاگ جائیں اور خلوت کی تجرد گاہوں میں جا کر پناہ لیں جہاں صرف فطرت ہی فطرت ہو (انسان کوئی نہ ہو)—ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنہیں انسان کے ناپاک قدموں نے چھوا نہ ہو— وہاں جا کر اپنی روح کو فطرت کے کیف اندوز نظاروں سے سرشار کریں، بایں نمط کہ ان سرور آفریں کیفیات میں کوئی دخل اندازی نہ کرنے پائے اور ان کے اس جہانِ کیف و مستی میں انسانی دنیا کی ذلت و پستی کا کوئی گزر نہ ہو۔ لیکن وہ نہیں جانتے، یا جاننا نہیں چاہتے کہ ان کی یہ تمام حسین آرزوئیں، یہ بلند تخیلات، یہ علو جذبات، انسان کے قلب کی یہ کیف باریاں، انسانی فطرت کی لغزشوں کا یہ احساس لطیف اور فطرت کے متعلق یہ حسنِ خیال۔ یہ سب اسی دنیائے انسانیت کی تخلیق ہے جسے وہ اسقدر قابلِ نفرت سمجھ کر تیاگ دینے کی فکر کر رہے ہیں۔
>
> (The Making of Humanity P. 349)

میسن اپنی کتاب (Creative Freedom) میں لکھتا ہے

> اخلاق اس کا نام نہیں کہ آپ مادہ کے کثیف تاثرات سے بھاگ جائیں۔ اخلاقی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ آپ مادہ کا مقابلہ کریں۔ تخلیقی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ مادہ پیش کرتا ہے اس سے متمتع ہوں۔ . . اگر مذہب، انسان کی توجہ، مادیت سے ہٹا کر، اس کے روحانی الاصل ہونے پر ہی مرکوز کردے تو یہ اخلاق نہیں مذہبی، بد اخلاقی ہے۔ . . . نوع انسانی اسی صورت میں ترقی کر سکتی ہے جب مادی اور

> روحانی دونوں پہلو، اپنے تضادات کے باوجود ھاتھ میں ھاتھ ڈالے آگے بڑھتے جائیں ۔ (P.P. 233 ; 337 ; 340)

برفو دوسرے مقام پر لکھتا ھے ۔

> اخلاقیات کے متعلق 'یونان کے ابتدائی تصور کا' رواقی اور ایپقوریت کے فلسفہ میں تبدیل ھو جانا ایسی خرابی کا موجب ھؤا جس کی نظیر انسان کے اخلاقی تصور میں کہیں نہیں مل سکتی ۔ اخلاق، جس سے مفہوم یہ ھے کہ انسان کے باھمی معاملات، حق و صداقت پر مبنی ھونے چاھئیں، اپنا حقیقی مفہوم کھو دیتا ھے اگر اس کا نتیجہ نوع انسانی کی بہبود نہیں ۔ اس سے تو اخلاقیات کا مقصد ھی فنا ھو جاتا ھے ۔ اخلاقیات کا مقصد ایک فرد کی ذاتی بہبود یا نجات نہیں (اگرچہ نوع انسانی کی بہبود میں فرد کی ذاتی بہبود بدرجۂ اتم موجود ھے) ۔ بلکہ مقصد یہ ھے کہ اس فرد کا اُس نوع انسانی کے ساتھ جس کا یہ ایک جزو ھے کس قسم کا تعلق ھے؟ اس (باھمی تعلقات اور معاملات) کے ضابطۂ اخلاق کی بنیاد عدل ھے . . . . عدل کا تقاضا یہ ھے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ اور قاھرانہ قوت سے غالب نہ آسکے . . . . اگر دنیا میں باطل کے کوئی معنی ھیں تو یہی کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض فرضی اقتدار کی بنا پر اپنا تابع فرمان بنا لے . . . . اسی باطل کا استیصال، اخلاقیات کا کم از کم فریضہ ھے ۔ آپ مثالی اخلاقیات کی کیسی شاندار عمارت کیوں نہ تعمیر کرلیں اگر وہ باطل کا استیصال کرکے اسکی جگہ حق کو قائم نہیں کرتی تو وہ یکسر بے معنی ھے ۔ یہ اوپر کی عمارت، اخلاقیات کی عمارت کہلا ھی نہیں سکتی . . . . رواقی فلسفہ کی رُو سے نصب العین

> حیات، شر کا مقابلہ نہیں بلکہ اس کے سامنے جھک جانا رہ جاتا ھے۔
> (P.P. 331 - 332)

یہ رواقی فلسفہ وھی ھے جس پر ھمارے تصوف کی عمارت استوار ھے۔ اور تصوف کا فلسفۂ اخلاق (Ethics of Mysticism) عیسائیت کے فلسفۂ اخلاق کا چربہ ھے۔ اس فلسفۂ اخلاق کی ٗرو سے (جس کا منتہیٰ ایک فرد کی ذاتی نجات ھے) ظلم و استبداد کی قوتوں کو بد لگام چھوڑ دیا جاتا ھے کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔ ”خدا کے نیک بندے“ حجروں اور خانقاھوں میں جا چھپتے ھیں اور شریر لوگوں کو کھلی چھٹی دیدی جاتی ھے کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کے خون کی رنگینی سے اپنے عشرتکدوں کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائیں۔ عیسائیت کے فلسفۂ اخلاق کی یہی تباہ کاریاں تھیں جن سے متاثر ہو کر ھسپانیہ کا پروفیسر (Dr. Falta De Gracia) ان الفاظ میں چیخ و پکار کرتا ھے کہ

> عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نا مانوس ھے جسطرح ذھنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے بالکل باھر کی چیز ھے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ھمدردی کا اظہار کیا ھے جن پر ظلم و ستم ھوں لیکن خود ظلم و ستم سے تسامح برتا ھے۔ اس نے ان لوگوں سے جو ظلم و ستم کے بوجھ کے نیچے دبے ھوئے ھوں۔ جنہیں مصائب و شدائد نے گھیر رکھا ھو، دعوت دی ھے اور انہیں آئین محبت کی تعلیم دی ھے۔ عفو و رحم کا سبق سکھایا ھے۔ انہیں خدا کی ربوبیت یاد دلائی ھے۔ لیکن مذھب و اخلاق کے اس طوفان میں جس کے متعلق کہا جاتا ھے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراج کبریٰ ھے عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس، جور و استبداد کے ستائے ھوئے مظلوم انسانوں کے درمیان، آسمان سے اترتا ھوا فرشتہ دکھائی دیتا ھے۔ جو ان کی طرف فارقلیط کا

پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جوروا ستبدار کی علت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے۔ خیر وشر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظام عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔ سینٹ و نسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنّم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں۔ ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں۔ وہ مٹ جائیں۔ فنا ہو جائیں۔ عیسائیت کی روح انہیں جا کر تسلی دیگی۔ لیکن یہ اس کے حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آئیگا کہ اس ظلم و ستم کو کسطرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہیگی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اسکے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصور۔ وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی ہے۔ لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خود داریوں کا ترک . . . . . تدسیۂ آرزو . . . . . عدم مدافعت، خاموش

> اطاعت ، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا۔ غرضیکہ اس قسم کے متشدّد (غیر فطری) ضابطہ اخلاق کا طوفان ، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا۔ لیکن ظلم و استبداد اور جو و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔
>
> (The Making of Humanity, PP 332 - 33)

جو کچھ اس پروفیسر نے عیسائیت کے متعلق کہا ہے وہ حرفاً حرفاً تصوف پر منطبق ہوتا ہے۔ اس تصوف نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا ، اس کے متعلق بڑی سے بڑی تصنیف بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتی ، جو کچھ علامہ اقبال ؒ ان چار لفظوں میں کہہ گئے ہیں کہ

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

ہماری تاریخ انہی ڈوبے ہوئے سفینوں کی حدیث الم ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے تو ان سفینوں کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کرنا۔

والسلام

جولائی ۱۹۵۹ء

پرویز

چونتیسواں خط*

(۱) انسانی فطرت کیا ہے؟

(۲) اتفاقات کسے کہتے ہیں؟

سلیم! تم جس انداز سے اعتراضات کو استفسارات کے رنگ میں پیش کرتے ہو، یہ تمہاری سلامتیٔ قلب کی دلیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ''قلب سلیم'' بڑی گراں بہا متاع ہے۔ تم اس پر جس قدر بھی ناز کرو کم ہے۔ اس انقلاب عظیم کے دور میں کہ جسے قرآن نے ''قیامت'' سے تعبیر کیا ہے اور جو انسانیت کے قیام کا دور ہے، کوئی اور متاع اس قدر گراں بہا نہیں ہوگی۔ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲۶/۹۰) یہی وہ قلب (ذہنیت و نفسیاتی کیفیت) ہے جس کی طرف جنت کی آسودگیاں خود بخود کھنچی چلی آتی ہیں وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (۲۶/۹۱)۔ تمہاری یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے میں ہزار کام چھوڑ کر بھی تمہارے استفسارات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ تم اب رفتہ رفتہ نظامِ ربوبیت کے اصول و مبانی کو سمجھتے جا رہے ہو۔ اسی سے پورے کا پورا اسلامی نظام سمجھ میں آ جائے گا۔

---

* اس خط اور اس سے اگلے خط کا صحیح مقام جلد اول میں تھا لیکن یہ اس میں شامل ہونے سے سہواً رہ گئے اس لئے انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر انہیں چھوڑ دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

تمہارے پہلے اعتراض (یا استفسار) کا صغریٰ کبریٰ قائم کیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت یوں بنتی ہے کہ

(i) خود غرضی انسانی فطرت میں ہے۔

(ii) جو کچھ انسانی فطرت کے مطابق ہے وہ عین اسلام ہے۔

(iii) جو کچھ عین اسلام ہے اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔

(iv) لہذا کوئی ایسا نظام، جس میں انفرادی مفاد کی جگہ کلی بہبود کو مقدم رکھا جائے، اسلامی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے

نتیجہ مستخرجہ یہ ہوا کہ نظامِ ربوبیت تقاضائے اسلام نہیں ہو سکتا۔

اس استفسار میں تم نے ایک بہت بڑی بات چھیڑ دی ہے جس کا خط و کتابت کے کے ذریعے سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔ ایک طرف تو اس لئے کہ یہ مسئلہ بنیادی اور اساسی ہے اور دوسری طرف اس لئے کہ ہمارے ہر اہم مسئلہ کی طرح یہ بھی تہ در تہ غلط فہمیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کا صحیح مقام تو سلسلۂ معارف القرآن کی ایک الگ جلد ہے۔ لیکن چونکہ تمہاری بیتابی تمنا حریفِ انتظار نہیں ہوا کرتی، اسلئے مجبوراً اسے اسی مقام پر مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اسے توجہ سے سمجھنا۔ بات مشکل ہے اور گنجائش بہت کم۔

گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اعتراض کا محرکہ جذبہ (غیر شعوری طور پر) یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ امور بطور مسلمات مانے جاتے ہیں کہ

(الف) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔

(ب) لہذا انسان کی فطرت عین خدا کی فطرت ہے۔

(ج) اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی عین انسانی فطرت کے مطابق۔

(د) لہذا کوئی کام جو انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔

اسی بنا پر ھمارے ھاں سب سے بڑا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا جاتا ھے کہ ''اسلام دین فطرت'' ھے۔ یہ الفاظ بڑے خوش آیند ھیں اور چونکہ انہیں بطور مسلمات تسلیم کیا جاتا ھے اس لئے ان پر کسی غور و فکر کی ضرورت ھی نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن سلیم! تم میرے مسلک کو جانتے ھو۔ میں ھمیشہ یہ تاکید کیا کرتا ھوں کہ جو الفاظ استعمال کرو، سب سے پہلے ان کا مفہوم متعین کر لو۔ یوں ھی اندھی تقلید میں الفاظ استعمال نہ کرتے جاؤ۔ ''انسانی فطرت،، ''انسانی فطرت،، کے الفاظ صبح سے شام تک سینکڑوں مرتبہ دھرائے جاتے ھیں۔ لیکن تم نے کبھی سلیم! یہ بھی سوچا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ھے؟۔ انسانی فطرت کہتے کسے ھیں؟ ذرا سوچ کر بتاؤ تو سہی کہ انسانی فطرت سے مفہوم کیا ھے؟ تم جسقدر سوچتے جاؤ گے، خود بخود محسوس کرتے جاؤ گے کہ ان الفاظ کا کوئی واضح مفہوم تمہارے ذھن میں نہیں ھے۔ اور ایک تم پر ھی کیا موقوف ھے دوسرے لوگ بھی جو ان الفاظ کو استعمال کرتے ھیں، ذرا ان سے پوچھ کر دیکھو کہ ''انسانی فطرت،، کیا ھوتی ھے؟ تم خود دیکھ لوگے کہ وہ بھی تمہاری طرح کورے ھوں گے۔ سلیم! ھمیں اسی چیز نے تباہ کر رکھا ھے۔ جب زندگی کے تصورات عمل سے بیگانہ ھو جائیں۔ جب الفاظ محض اصطلاحات اور اعمال محض رسوم بن کر رہ جائیں۔ جب کلمہ (نظریۂ حیات) کو استنتاجی میزان (Pragmatic Test) میں نہ تولا جائے، تو الفاظ کا استعمال روزمرہ کی عادت بن جاتا ھے۔ ان کا کوئی متعین مفہوم ذھن میں نہیں ھوتا۔ اسی کیفیت کو قرآن آسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا آنْتُمْ وَ آبَآءُكُمْ سے تعبیر کرتا ھے (یعنی محض الفاظ جو قوم میں متوارث چلے آتے ھیں) اور اسی کو میں ''شاعری،، کہا کرتا ھوں۔

''انسانی فطرت'' کیا ھے؟ یہ سوال ایسا اھم اور مشکل ھے کہ انسانی فکر ابھی تک اسکا جواب متعین نہیں کر پایا۔ مشرق میں تو خیر، ان امور کے متعلق غور و خوض اور تحقیق و تدقیق سے کام ھی نہیں لیا جاتا (مشرق نے صدیوں سے سوچنا ھی چھوڑ دیا ھے۔ تقلید اور بے عملی کی افیون کا یہی خاصہ ھوا کرتا ہے۔

مغرب میں جہاں آئمۂ فکر و خبر نے انسانی نفسیات (Human Psychology) کے متعلق اسقدر تحقیق و کاوش سے کام لیا ھے اور نفس انسانی کے امیال و عواطف اور مدرکات و احسسات کی بابت اسقدر ریسرچ کی ھے، وہ بھی اس بات میں کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کہ ''انسان کی فطرت'' کیا ھے؟ اُن کے ھاں ایک مکتب فکر کا خیال ھے کہ اگر انسان کو خارجی اثرات سے متاثر نہ ہونے دیا جائے تو اس کے بعد وہ جن خصوصیات کا حامل ھوگا انہیں غیر ملوّث انسانی فطرت (Un-adultereted Human nture) کہا جائیگا۔ لیکن یہ نظریہ محض تصور ھی تصور میں پرورش پا سکتا ھے۔ عملی دنیا میں اس کا وجود نہیں مل سکتا۔ یعنی کسی تمدنی دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں مل سکتا جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ خارجی اثرات سے متاثر نہیں ھوا۔

خارجی اثرات، جو انسان پر اثر انداز ھوتے ھیں' دو طرح کے ھوتے ھیں۔

(i) وہ اثرات جو انسانی بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ھے اور

(ii) وہ اثرات جو اس پر تعلیم و تربیت (ماحول) سے مرتب ھوتے ھیں۔

یہ ھو سکتا ھے کہ ھم کسی بچے کو کسی ایسے صحرا یا جنگل میں تنہا چھوڑ دیں جہاں کسی دوسرے انسان کے خیالات اس پر اثر انداز نہ ھوں اور اس کے بعد دیکھیں کہ وہ کن خصوصیات کا حامل بنتا ھے۔ تاکہ ان خصوصیات کو ''انسانی فطرت'' کے اجزاء کہا جاسکے۔ اول تو یہ بھی ناممکن ھے۔ لیکن بفرض محال سے ممکن بھی تصور کر لیا جائے تو ھم ان اثرات کو کہاں لے جائینگے جنہیں وہ بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ھے۔ اس کی ''فطرت،، کو ان اثرات سے منزہ و معرّا کر دینا محال ھے۔ یہ اثرات تو اس کے خون کے ذرات اور قلب و دماغ کے ریشہ ریشہ میں حلول کئے ھوئے ھیں۔ بلکہ اگر اسکے ساتھ آئمہ علم الابدان کے اس نظریہ کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ انسان کے عادات و اطوار، اس کے غدود اور ان غدودوں سے رسنے والی رطوبات سے متشکل ھوتے ھیں اور یہ غدود اس کی جسمانی ساخت کا لاینفک حصہ ھوتے ھیں جو اسے وراثت میں ملتی ھے، تو انسانی بچہ کو

ان عوامل کے اثرات سے غیر متاثر رکھنا یکسر ناممکن ہوجاتا ہے۔ لہذا کسی ایسے بچہ کا (عملاً) تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جسے ان عوامل سے الگ تھلک رکھا جا سکے جن سے اس کی عادات و خصائل اور امیال و عواطف ترتیب پاتے ہیں۔ اور جب یہی ناممکنات سے ہے تو پھر "غیر ملوث انسانی فطرت،، کا تعین بھی ناممکن ہے۔

باقی رہا یہ کہ اگر کسی بچے کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایسی جگہ رکھا جائے جہاں وہ دوسرے انسانوں کے خیالات سے متاثر نہ ہو، تو وہ حقیقی فطرت کا آئینہ دار ہوگا۔ تو اسکے لئے ہمارے سامنے کئی عملی مثالیں موجود ہیں۔ تم نے کئی مرتبہ اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ فلاں جنگل میں ایک بچہ ملا جسے بچپن سے بھیڑئیے اٹھا کرلے گئے تھے۔ وہ وہیں جنگل میں بڑھا۔ اس بچے کو اٹھا کر لائے تو دیکھا کہ وہ الکل درندوں جیسا وحشی حیوان تھا۔ اس میں ان باتوں کی بھی تمیز نہ تھی جو وحشی قبائل کے بچوں کو ہوتی ہے۔ وہ جانوروں کی طرح کھاتا پیتا اور رہتا سہتا تھا۔ اب اگر اسی کا نام "صحیح انسانی فطرت" ہے تو اس میں اور حیوانی فطرت میں کیافرق ہے؟

دوسرے مکتب تحقیق کا خیال ہے کہ "انسانی فطرت،، کو متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ شروع سے آجتک مختلف ادوارو امصار کے تمام انسانوں کی تاریخ کا غیر جاندارانہ مطالعہ کیا جائے اور اسطرح جو انسانی خصوصیات ہر زمانہ اور ہر مقام پرنوع انسانی میں مشترک پائی جائیں انہیں الگ کر لیا جائے ان کے مجموعے کا نام "فطرت انسانی،، ہوگا۔ لیکن غور کیجئے کہ یہ طریق کار جہاں اس قدر ناممکن لعمل ہے وہاں کس قدر ناقص بھی ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ انسانی دل و دماغ کے معمولات (Activities) کاریکارڈ۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی میلانات و رحجات کن کن عوامل سے ترتیب پاتے ہیں اور کن کن عناصر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ مختلف ادوار کے انسانوں کے معمولات کے اقدار مشترک کا (Common Facors) مجموعہ "انسان کی فطرتِ اصلیہ،، کہلائے گا، خود

فریبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ چنانچہ اس طریقِ عمل سے آج تک کوئی حتمی نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو سکا۔

ایک تیسرا مکتب فکر، علمائے علم الانسان (Anthropology) پر مشتمل ہے جن کا خیال ہے کہ جب انسان اپنے ابتدائی زمانہ میں سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور تہذیب و تمدن کی حضریاتی زندگی سے ہنوز نا آشنا تھا ۔ اس وقت وہ اپنی اصلی فطرت پر تھا ۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ افریقہ کے حبشیوں، امریکہ کے احمر ہندیوں یا آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں کی زندگی ’’فطرت انسانی‘‘ کی مظہر ہے ۔ لیکن اول تو خود ان آئمۂ تحقیق کے اکتشافات کے مطابق مختلف ممالک کے قدیم (جنگلی) انسانوں کے عادات و خصائل مختلف ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ان میں جو شے قدر مشترک رہ جاتی ہے وہ ان کی جہالت اور توہم پرستی ہے ۔ لہذا اس نظریہ کی رو سے ’’جہالت اور توہم پرستی،، کے مجموعے کا نام ’’انسانی فطرت،، قرار پا سکے گا ۔

بعض علماء نفسیات کا خیال ہے کہ انسانی بچہ اپنے ایام طفولیت میں ’’فطرت انسانی،، سے بہت قریب ہوتا ہے ۔ لیکن سلیم! ذرا کسی بچے کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ اس میں کون کون سی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں ۔ یہی نا کہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے اسے توڑ ڈلتا ہے ۔ دوسرے کی چیز کو جھپٹ کر چھین لینے کی کوشش کرتا ہے ۔ وہ نہیں ملتی تو چیختا چلاتا ، ضد کرتا ہے ۔ دوسرے بچوں کو پیٹتا ہے ۔ اگر کسی دوسرے بچے سے پیار کیا جائے تو اس پر حسد کے مارے جل اٹھتا ہے ۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے ، کبھی منہ میں مرچ ڈال لیتا ہے ۔ ہاتھ سے چاقو چھینئے تو چیخنے لگ جاتا ہے ۔ لہذا اس طریقِ فکر کے مطابق ’’ فطرت انسانی ،، کے لانیفک اجزا یہی کچھ قرار پا سکتے ہیں ۔

اب سلیم ! ان چیزوں کو لو ، جو عام طور پر تمام انسانوں میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں ۔ یعنی تحفظِ خویش (Preservation Of Self) اور بقائے نسل کا جذبہ ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان چیزوں کو ’’ انسانی فطرت ،، قرار دیا جا سکتا ہے ؟

انسان کیا ھے؟ حیوان کی ارتقاء یافته شکل! جس طرح نباتات کی جڑیں زمین میں اور شاخیں فضا کی پہنائیوں میں ھوتی ھیں، اسی طرح انسان کی طبعی اصل، حیوانی ھے اور ’’ انسانی اصل ،، اس سطح سے بلند۔ اس کی طبعی زندگی کا انحصار ان ھی عوامل پر ھے جن پر دوسرے حیوانوں کی زندگی کا دارو مدار ھے۔ سانس لینا، کھانا پینا، سونا، سردی گرمی کے شدید اثرات سے محفوظ رھنا۔ اسی طرح تحفظ خویش اور بقائے نسل کا جذبه بھی حیوانی سطح کی چیز ھے۔ یه جذبه ھر انسان میں پایا جاتا ھے۔ لہذا یه جذبه بھی ’’انسانی فطرت،، نه ھوا بلکه ’’حیوانی فطرت،، کا مظہر ٹھہرا۔ جس طرح حیوانات میں یه چیزیں جبلی طور پر (Instinctively) موجود ھوتی ھیں، اسی طرح یه چیزیں انسان میں بھی موجود ھوتی ھیں۔ اس لئے یه چیزیں انسانی فطرت (Human Nature) نہیں، بلکه حیوانی جبلّت (Animal Instinct) قرار پا سکتی ھیں۔

تم نے غور کیا سلیم! که جو بات بظاھر اس قدر آسان دکھائی دیتی تھی، ذرا سے غور و فکر کے بعد وہ کس قدر مشکل نظر آنے لگی۔ یعنی ’’ انسانی فطرت،، اول تو متعین ھی نہیں ھو سکتی، اور اگر وہ متعین ھوتی ھے تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا قرار پاتے ھیں؟ جانوروں کی سی زندگی جو ان بچوں میں پائی گئی جن کی پرورش جنگلوں میں ھوئی تھی۔ یا جہالت اور توھم پرستی (قدیم زمانه کے وحشی انسانوں کے خصائص) یا شکست وریخت، ضدوحسد، غلبه واستیلا، ناعاقبت اندیشی، اپنے نفع ونقصان سے بھی نا آگہی (بچے کی ابتدائی زندگی کی خصوصیات)۔ سلیم! غور کرو که اگر یہی ’’ انسانی فطرت ،، ھے تو کیا یه کوئی ایسی چیز ھے جسے باعث عزوشرف قرار دیا جا سکے؟ کیا یه اس قابل ھے که اس کے متعلق کہا جائے که

(۱) یه عین خدا کی فطرت (فطرت اللہ) ھے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ھے۔ اور

(۲) اسلام اسی فطرت کے تقاضے پورے کرنے کا دین ھے۔

سوچو سلیم! که یه سوچنے کی بات ھے!! اور اگر یه انسانی فطرت نہیں

تو بتاؤ وہ کونسی فطرت ہے جو خود اللہ کی فطرت ہے اور جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق دین اسلام ہے؟ اور پھر یہ بھی سوچو کہ اس فطرت انسانیہ کا پتہ اور نشان کہاں سے لیا جائے اور اسے متعین کسطرح کیا جائے؟

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم اکتا تو نہیں گئے؟ بات تم نے چھیڑ دی ہے بہت مشکل۔ اور جو نتائج تمہارے سامنے آرہے ہیں وہ ہیں یکسر غیر مانوس اور غیر متوقع۔ اس لئے اس بحث سے طبیعت کا اکتا جانا مستبعد نہیں۔ لیکن اب یہ کمبل تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے تو آخر تک سننا اور سن کر سمجھنا ہی ہوگا۔

وہ اگلا قدم یہ ہے کہ خود قرآن کریم میں بھی انسان کی بعض خصوصیات کا ذکر آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان خصوصیات کے مجموعے کو ”انسانی فطرت“ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اگر وہی انسانی فطرت کے اجزا ہیں تو کیا اس قسم کی فطرت کو ”فطرت اللہ“ کا مظہر اور اسلام کو اس فطرت کا دین سمجھا جا سکتا ہے؟ ان خصوصیات میں سب سے پہلے وہ ”خصوصیت کبریٰ“ ہے جو قصۂ آدم کے ضمن میں مذکور ہے اور جس کی طرف ملائکہ یہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) کیا تو زمین کی جانشینی اس کے اس کے سپرد کرے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے اس اعتراض کی تردید نہیں کی بلکہ صرف اتنا کہا کہ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ ”ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے“ لہٰذا۔ انسان کی سب سے پہلی خصوصیت ”فساد اور خونریزی“ ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ یہ خصوصیت فی الواقعہ، بلاقید زمان و مکان، عمومی طور پر انسانوں میں قدر مشترک کہلا سکتی ہے۔

پھر قرآن کریم میں انسان کے متعلق ہے کہ یہ بڑا جھگڑالو ہے وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) خَصِيمٌ مُّبِينٌ (۳۶/۷۸)۔ ظَلُومًا جَهُولًا

ہے ($\frac{۳۳}{۷۲}$)۔ ھلوعاً ہے۔ یعنی ایسا جس کی نیت ھی نہیں بھرتی ($\frac{۷۰}{۲۰}$)۔ نا شکرا ہے ($\frac{۸۰}{۱۷}$)۔ خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے ($\frac{۱۷}{۱۱}$)۔ جلد باز ہے۔ ($\frac{۱۷}{۱۱}$) وغیرہ۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ یہ کونسی خصوصیات ھیں؟ کیا یہ وھی خصوصیات نہیں جو بچے کی ابتدائی زندگی یا دنیا کی وحشی اقوام میں پائی جاتی ھیں؟ یعنی وہ خصوصیات جن کا مظاھرہ اس وقت ھوتا ہے جب انسان کو ”علیٰ حالہٖ“ چھوڑ دیا جائے (علیٰ حالہٖ کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔ اگر یہ خصوصیات، انسان کی ”فطرت اصلیہ“ کی مظاھر ھیں تو انہیں ”فطرت اللہ“ کا مظہر کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ خصوصیات کم از کم اس خدا کی ”فطرت“ تو کسی طرح بھی قرار نہیں دی جا سکتیں جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اور نہ ھی اسلام، اس ”فطرت“ کا دین قرار دیا جا سکتا ہے؟

تم جی میں کہتے تو ھوگے کہ میں نے بات کیا پوچھی اور سلسلہ کلام کس طرف چل نکلا۔ لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں ھی نہیں آسکتی۔ اس تمہید کے بعد سلیم! اس آیت جلیلہ کو سامنے لاؤ جسے اس مسلّمہ کے لئے بطور سند پیش کیا جاتا ہے کہ

(۱) انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ اس لئے انسانی فطرت، فطرت اللہ کی مظہر ہے۔ اور

(۲) اسلام دین فطرت ہے۔

وہ آیت یہ ہے

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ($\frac{۳۰}{۳۰}$) اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ”اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ھو سکتی۔ یہ دین قیّم (اسلام) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے“۔ اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت، فطرت اللہ پر متفرع ہے۔ یعنی جو اللہ کی فطرت ہے، وھی انسان کی فطرت ہے۔ اور اسلام اس فطرت کے مطابق دین ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی کوششیں فطرت انسانیہ کے تعین میں یکسر ناکام ہیں۔ باقی رہا قرآن کریم، سو اس میں انسان کی جن خصوصیات کا عمومی طور پر ذکر ہے وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ انہیں ”فطرت اللہ“ قرار دیا جائے یا اس ”فطرت“ پر فخر کیا جا سکے (یہ یاد رکھو کہ ذکر مومنین کی صفات کا نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا ہو رہا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ”فطرت“ کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال ہی نہیں کیا جن معانی میں یہ آج مستعمل ہے۔ قرآن اس عربی مبین میں نازل ہوا جو عہد نزول قرآن میں عربوں کی زبان تھی۔ اس زمانہ کے عربوں میں (جو بالعموم بدوی زندگی بسر کرتے تھے) فلسفہ، مابعدالطبیعیات، تصوف، ایتھکس کی اصطلاحات رائج ہی نہ تھیں (بدو تو ایک طرف، اس زمانے کے شہری زندگی بسر کرنے والے عرب بھی ان اصطلاحات سے نا آشنا تھے)۔ یہ اصطلاحات بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ یا کم از کم عربی زبان میں ان کا عمل دخل بہت بعد میں ہوا ہے۔ یعنی اس زمانہ میں جب عربوں کی سادہ زندگی کی جگہ عجمی تصوراتِ حیات نے لے لی اور اس طرح ان کی زبان (عربی مبین) کے سیدھے سادے الفاظ، عجمی نظریات کے اصطلاحی مفہوم کے لئے استعمال ہونے لگے۔ یاد رکھو سلیم! جب کوئی قوم سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہو تو اس کی زبان کے الفاظ ٹھوس اشیاء (Concrete Things) کا مفہوم ادا کریں گے۔ تجریدی گفتگو (Abstract Talk) کے لئے وہ استعمال نہیں ہونگے۔ کیونکہ سیدھی سادی زندگی بسر کرنیوالی قوم تجریدی گفتگو سے نا آشنا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت قرآن کا جو مفہوم مروج ہے وہ ان اصطلاحات کی رو سے متعین کیا گیا تھا جب اسلام پر غیر اسلامی تصورات چھا گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص دور میں قرآن کو اس طرح سمجھا گیا تھا۔ لیکن ہم نے اسی مفہوم کو ”قرآن“ سمجھ لیا اور اس طرح ایک خاص دور کا مفہوم، ازلی، ابدی اور غیر متبدل تصور کرلیا گیا۔ جب تک ہم اس بنیادی غلطی سے نہیں نکلتے، قرآن ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں کے تمام الجھاؤ اسی غلط فہمی

کے پیدا کردہ ہیں۔ اسی سے وہ تمام اختلافات پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے لئے اس درجہ پریشانیٔ فکر و نظر کا باعث بن رہے ہیں۔ یعنی ہم نے انسانی تعبیرات کو خدا کا ازلی قرآن سمجھ رکھا ہے۔ اور چونکہ انسانی تعبیرات میں اختلاف ناگزیر ہے اس لئے ہمارے ہاں خود ’’قرآن‘‘ میں اختلاف محسوس ہو رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کرلیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے معانی ان کے مادوں کی رُو سے متعین کریں اور ان معانی کی روشنی میں، اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق، قرآن کا مفہوم متعین کریں۔ جب تک ہم قرآنی الفاظ کے ماخذ (Origin) تک نہیں پہنچیں گے اور بعد کے اصطلاحی مفہوم ہی کو ازلی اور ابدی سمجھتے رہیں گے، قرآنی مطالب ہماری نگاہوں سے اوجھل رہیں گے۔

ہمارے ہاں لفظ فطرت کا ترجمہ نیچر (Nature) کیا جاتا ہے۔ لفظ نیچر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ علم طبیعیات (Physics) میں نیچر، عالم آفاق کو کہتے ہیں۔ اور اس سے متعلقہ قوانین کو قوانین فطرت (Laws of Nature)۔ مابعد الطبیعات (Metaphysics) میں اس سے مُراد وہ قوت ہوتی ہے جو کائنات کو چلا رہی ہے۔ فلسفہ میں اس کا مفہوم کسی شے کی وہ خصوصیت ہے جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے ممیز ہوتی ہے۔ علم النفس کی رو سے نیچر، جبلی استعداد یا قلبی رجحانات و میلانات کو کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ لفظ (نیچر) انگریزی زبان میں متعدد دیگر معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی سے پہلے خود ہمارے ہاں کے متکلمین اور حکماء کے ہاں لفظ فطرت ان ہی اصطلاحی معانی میں استعمال ہوتا تھا۔ لفظ فطرت کے یہی معانی اس وقت ہمارے ہاں رائج ہیں۔ اور چونکہ یہ معانی ایک عرصہ سے مروج چلے آ رہے ہیں اس لئے یہ ہمارے قلب و دماغ میں اسطرح پیوست ہو چکے ہیں کہ ادھر لفظِ فطرت ہمارے کانوں میں پڑا اور ادھر بلا کد و کاوش، اس کا ایک خاص مفہوم ہمارے سامنے آ گیا۔ ’’اس شخص کی فطرت ہی ایسی ہے‘‘۔ ’’وہ فطرةً اس قسم کا واقع ہوا ہے‘‘۔ ’’انسانی فطرت کا خاصہ ہے‘‘۔ یہ فقرے ہماری روزمرہ کی زبان میں داخل ہیں اور ان سے لفظِ فطرت کا ایک خاص مفہوم

ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہی الفاظ بولتے بولتے جب ہمارے سامنے قرآنی آیت میں "فطرت اللہ" کے الفاظ آتے ہیں تو اس سے وہی مفہوم ہمارے سامنے آجاتا ہے جس سے ہمارا ذہن اس درجہ مانوس ہو چکا ہے۔ اور اس مفہوم کے مطابق ہم قرآنی آیت کا مفہوم متعین کرلیتے ہیں اور پھر "اللہ کی فطرت جس پر انسانی فطرت* متفرع ہے" کو بطور ایک حقیقت ثابتہ پیش کر دیتے ہیں اور اسلام کو دینِ فطرت قرار دے دیتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس لفظ فطرت کا وہ مفہوم جو اس وقت ہمارے ذہنوں میں پیوست ہے کیا قرآن میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، لفظِ فطرت کا موجودہ مفہوم بعد کے زمانے کا ہے، جب یونان کا فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور لفظ نیچر کا ترجمہ "فطرت" کیا گیا۔ لفظِ فطرت کے بنیادی معنی کسی چیز کو پھاڑنا، شگاف دینا ہیں۔ لہذا اس سے مراد ہے کسی شے کو پھاڑ کر اس میں سے کسی نئی چیز کو پیدا کرنا۔ چنانچہ کسی جگہ پہلی مرتبہ کنواں کھودنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اس کے معنی ہیں تخلیق، ایجاد، ابداع (To Originate)۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لئے آیا ہے فاطر السمٰوٰت و الارض (پستیوں اور بلندیوں کا پیدا کرنے والا)۔ لہذا "فطرت اللہ" کے معنی (Nature of God) نہیں، بلکہ خدا کا قانون تخلیق ہے۔ اسی قانون تخلیق کے مطابق اس نے عالم آفاق کو پیدا کیا (الَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ) اور اسی کے مطابق انسان کو (قُلِ الَّذِی فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ) لہذا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا کے معنی ہوئے، اللہ کا وہ قانون تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا ہے، وہی قانون تخلیق جس کے مطابق خارجی کائنات وجود میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قانون کی رو سے کائنات کی ہر شے میں کچھ امکانی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں جن کی نمود و

---

* "خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے" یہ تصور در حقیقت یہود سے مستعار لیا گیا ہے جن کے ہاں (توریت کی رو سے) عقیدہ یہ ہے کہ "خدا نے انسانوں کو اپنی شکل پر پیدا کیا"۔

تکمیل اس شے کی زندگی کی غایت ھوتی ھے ۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی کچھ صلاحیتیں مضمر ھیں ۔ ان صلاحیتوں کی نشو و نما انسانی زندگی کا مقصود ھے ۔ عالم آفاق اور عالم انسان میں فرق یہ ھے کہ اول الذکر کی صورت میں نشو و نما کا قانون ان اشیا پر مسلط کردیا گیا ھے ۔ وہ بلا اختیار و ارادہ اس قانون کی پابندی کرتی ھیں ۔ انہیں اس امر کا اختیار نہیں کہ چاھیں تو اس قانون کی پابندی کریں اور چاھیں تو اس سے سرکشی اختیار کرلیں ۔ ان کے برعکس، انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ھے ۔ اس لئے اس پر کوئی قانون مسلط کرکے نہیں رکھ دیا گیا ۔ یعنی کوئی قانون ایسا نہیں جو اس کی "فطرت" کے اندر رکھ دیا گیا ھو اور یہ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ھو (حتیٰ کہ اس کی کیفیت یہ ھے کہ وہ جبلی پابندیاں، جو اس میں حیوانی زندگی سے منتقل ھوکر آتی ھیں، یہ ان کے اتباع پر بھی مجبور نہیں) ۔ بکری کا بچہ بھوک سے مر جائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا ۔ مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ھی خشکی کی طرف دوڑے گا اور بطخ کا بچہ پانی کی طرف ۔ لیکن انسن کے بچے کا یہ عالم ھوتا ھے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی بھی اسی بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ھے جس طرح مصری کا ٹکڑا ۔ وہ کبھی پانی میں جا گرتا ھے ۔ کبھی آگ کے شعلے کو پکڑ لیتا ھے ۔ اس سے ظاھر ھے کہ انسان کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جو اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور کردے ۔ اس لئے انسان خارجی راھنمائی کا محتاج ھے ۔ یہ خارجی راھنمائی وحی کے ذریعہ ملتی ھے ۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) ۔ انسانوں کی طرف من جانب اللہ ھدایت آتی رھے گی ۔ جو شخص یا قوم بھی اس راہ نمائی کا اتباع کرے گی اسے نہ خوف ھوگا نہ حزن ۔ اس ھدایت خداوندی کے آخری اور مکمل مجموعے کا نام ھے قرآن ۔

یہیں سے سلیم! ایک اور اھم بات بھی نکلتی ھے ۔ (لیکن مجھے اندیشہ ھے کہ تم کہیں اس موضوع کی "یبوست" سے گھبرا نہ جاؤ ۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ھوں، اس مرتبہ تم نے بات بڑی مشکل چھیڑ دی ھے ۔ لیکن اگر

تم نے ذرا ضبط اور صبر سے، ذہن پر زور دیکر بات کو سمجھ لیا تو اس کے بعد، تمہاری راہ کے بہت سے کانٹے صاف ہو جائیں گے) ۔ وہ نئی بات کیا ہے؟ ذرا غور سے سنو۔ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تصور کہ انسان کی فطرت، خدا کی فطرت ہے، قرآنی تصور نہیں ہے ۔ اسی سے ملتا جلتا (بلکہ اسی پر متفرع) یہ تصور بھی ہمارے ہاں عام طور پر مسلّمہ ماناجاتاہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز خود فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے ۔ یہ تصور بھی بوجوہ غلط ہے ۔ کہایہ جاتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت اپنی اصلی حالت پر ہو اور خارجی اثرات سے ملوث نہ ہو چکی ہوتو وہ نیکی اور بدی میں از خود تمیز کرلیتی ہے ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابھی تک یہی متعین نہیں ہوسکا کہ انسانی فطرت ہے کیا؟ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ایسی '' فطرت ،، کا ملنا ناممکنات سے ہے جو خارجی اثرات (وراثت و ماحول) سے غیر متاثر ہو ۔ (میں اس وقت سلیم! حضرات انبیاء کرام[۴] کا ذکر نہیں کر رہا، عام انسانوں کا ذکر کر رہا ہوں ۔ (نبوت کی حقیقت کا سمجھنا ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے) لہذا بات یوں ہوئی کہ

(i) کہا جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کا علم غیر ملوث انسانی فطرت کے اندر مضمر ہے ۔

(ii) لیکن غیر ملوث انسانی فطرت کہیں نہیں مل سکتی ۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس '' فطرت ،، کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دینے سے فائدہ کیا ہوا جس '' فطرت ،، کا کہیں وجود ہی نظر نہیں آتا؟ یاد رکھو سلیم! نیکی اور بدی کا علم '' فطرتِ انسانی ،، کے اندر نہیں ۔ اس کا علم وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے ۔ اور وحی قرآن کے اندر ہے ۔ اگر نیکی اور بدی کا علم انسان کی فطرت میں ہوتا تو انسان کو اس کی فطرت کے اتباع کا حکم دیا جاتا ۔ لیکن حکم وحی کے اتباع کا ہے، انسانی فطرت کے اتباع کا نہیں ۔ وحی کے اتباع سے نفس انسانی کی نشو و ارتقاء ہوتی ہے ۔ اور اسکی مضمر صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے ۔

انسان کے اندر تعمیر و تخریب دونوں کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی تعمیر و تخریب کو قرآن نے فجور و تقویٰ (Integration and Disintegration) سے تعبیر کیا ہے وَالنَّفْسِ وَمَا سَوّٰهَا (۹۱/۷) ”نفس انسانی اور اسے ہموار رکھنے والی قوتیں اس پر شاہد ہیں“، کہ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ”اس میں اسکے فجور و تقویٰ کے امکانات ودیعت کرکے رکھ دیئے گئے ہیں“۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ”جس نے اس کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچایا اس کی کھیتی بار آور ہو گئی“۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ”جس نے اس کی صلاحیتوں کو دبا دیا، وہ تباہ ہو گیا۔“ لہذا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر نہیں۔ صرف ”نیکی اور بدی“ (یعنی نفس انسانی کی تعمیر و تخریب) کے امکانات اس کے اندر موجود ہیں۔ ان ممکنات کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کا طریق کیا ہے؟ اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

بات یہاں تک پہنچ چکی ہے سلیم! کہ

(i) خدا کا تخلیقی قانون (فطرت اللہ) کائنات اور انسان دونوں میں کارفرما ہے۔

(ii) اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی کسی شے کو اختیار نہیں کہ وہ قانون خداوندی سے انحراف کر سکے (اسے تقدیر کی پابندی کہتے ہیں)۔

(iii) انسان کے اندر اس کی ذات کی نشو و نما کی صلاحیت بھی رکھدی گئی ہے۔ اور اسے تباہ و برباد کر دینے کی استعداد بھی۔

(iv) انسان کی نشو و نما اس نظام کے اندر ہوتی ہے جو ہدایت خداوندی کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام اس کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

(v) انسان کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے بالیدگی اور ارتقاء کی راہ اختیار کرے اور چاہے بربادی اور تباہی کے عمیق غاروں کی طرف چلا جائے۔

جب انسان ، نظامِ خداوندی کے بجائے دوسری راھیں اختیار کر لیتا ھے تو اسے ''اتباع ھویٰ'' کہتے ھیں ۔ یعنی ''نیچے کی طرف لیجانیوالی قوتوں کا اتباع ۔ اپنے اپنے جذبات کا اتباع ۔ انفرادی مصالح کا اتباع ۔ اس روشِ زندگی سے وہ خصوصیات اُبھر کر سامنے آ جاتی ھیں جن کا ذکر پہلے آ چکا ھے ۔ یعنی شکست و ریخت ۔ فتنہ و فساد ، ناھمواریاں اور نا استواریاں ۔ جنگ و جدل ۔ ظلم و جہول ۔ کفران و ھلوعت ۔ خود غرضی اور مفاد پرستی وغیرہ ۔ اس سے ظاھر ھے کہ یہ ''فطرتِ انسانی ،، کے مظاھر نہیں بلکہ اس روش زندگی کے نتائج ھیں جسے انسان، وحی کی روشنی کو چھوڑ کر، تنہا جذبات کی رو سے اختیار کرتا ھے ۔ یعنی اگر انسان کو وحی کی روشنی کے بغیر ''علیٰ حالہٖ ،، چھوڑ دیا جائے تو اس سے اسی قسم کی خصوصیات کا ظہور ھوگا ۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم ! سورۂ روم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ھے جو ''فطرت اللہ ،، ''انسانی فطرت ،، اور ''دین فطرت ،، کے تصورات کی بنیاد قرار دی جاتی ھے ۔ سلسلۂ کلام یوں ھے

> بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْآ اَھْوَآءَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۔ فَمَنْ یَّھْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۳۰/۲۹)
>
> جو لوگ ھر شے کو اس کے اصلی مقام پر نہیں رکھتے ان کی حالت یہ ھوتی ھے کہ وہ علم (وحی) کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتے ھیں اور اس طرح زندگی کی صحیح راہ سے بھٹک جاتے ھیں ۔ یوں بھٹکنے والوں کو کون صحیح راستہ پر لا سکتا ھے ؟ ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ھو سکتا ۔

ان کے برعکس صحیح راہِ حیات پر چلنے کی آرزو رکھنے والوں سے کہا گیا کہ

> فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۰/۳۰)

تم، ہر دوسرے ضابطۂ حیات سے منہ موڑ کر، اس ضابطہ (الدین) کو اپنا نصب العین بناؤ، جو اللہ کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے۔ وہ قانون جس کی رو سے انسان کی خلقت عمل میں آئی ہے۔ یہ تخلیقی قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر متبدل ہے۔ یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو خود بھی محکم ہے اور وجۂ قیامِ انسانیت بھی۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہ ضابطہ حیات (الدین) کیا ہے؟

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ۔ وَ اتَّقُوْهُ۔ وَاَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ($\frac{۳۰}{۳۱-۳۲}$)۔

سفر زندگی میں ہر قدم اُس کی طرف اٹھے۔ اس کے قوانین کی نگہداشت کی جائے۔ نظام صلٰوۃ سے اپنی وحدت کو قائم رکھا جائے اور دین میں تفرقہ انگیزی پیدا کرکے مشرکانہ مسلک نہ اختیار کرلیا جائے۔ تفرقہ شرک ہے جس میں قانون خداوندی کو معیار حق و باطل تسلیم کرنے کے بجائے ہر گروہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ برسر حق ہے اور یوں اس فریب نفس میں مگن رہتا ہے۔

غور کیا تم نے سلیم! صحیح راہ یہ ہے کہ سفر زندگی میں انسان کا ہر قدم، ضابطۂ خداوندی کے مطابق اٹھے۔ نہ یہ کہ تنہا عقل (یا جذبات) کے اتباع میں، ناقۂ بے زمام کی طرح، جدھر منہ اٹھا چل دئے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے معاشرتی نظام کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر لیں۔ یہی بلندیوں کی راہ ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا (ہمارا قانون مشیت یہ ہے کہ قرآن کے مطابق چلنے سے بلندیاں حاصل ہوتی ہیں) وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ ($\frac{۷}{۱۷۶}$)

لیکن اپنے جذبات کا اتباع کرنے والا پستیوں کی طرف جانا چاھتا ھے۔ اس کا کیا علاج؟ لیکن یہ بلندیاں، نظامِ ربوبیت کے بغیر ناممکن ھیں۔ دیکھو قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کی صراحت کرتا ھے۔ وہ کہتا ھے

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی

انسانی کوششوں کے رخ مختلف ھوتے ھیں۔ لیکن دیکھو کونسا رخ کس منزل کی طرف لے جاتا ھے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی

جو دیتا ھے اور خدا کے قانون ربوبیت کی نگہداشت کرتا ھے۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی

اور اسطرح معاشرہ میں صحیح توازن و تناسب قائم رکھنے کے دعوے کو سچ کر دکھاتا ھے۔

فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی

تو اس کے لئے کشادگی کی راھیں آسان ھو جاتی ھیں۔

وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی

لیکن جو مال کو روک رکھتا ھے اور اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ کر اجتماعی نظام سے مستغنی ھو بیٹھتا ھے

وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی

اور اسطرح معاشرہ کے توازن کی عملی تکذیب کرتا ھے۔

فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی

تو اس کے لئے عسرت کی راھیں کھل جاتی ھیں

وَیُغْنِیْ مَا عَنْہُ مَالُہٗ اِذَا تَرَدّٰی (۹۲/۵-۱۰)

اور جب معاشرہ کا توازن بگڑنے سے تباھی آتی ھے تو اس کا انفرادی مال و متاع اسے اس تباھی سے بچا نہیں سکتا۔

اس تمہید کے بعد سلیم! اب تم آؤ اپنے اعتراض کی طرف ۔ تم کہتے ہو کہ جب خود غرضی ''انسانی فطرت،، کا تقاضا ہے تو پھر کوئی ایسا اقدام جو اس خود غرضی کی جگہ کلی مفاد کی طرف لے جائے ''خلاف فطرت،، ہوگا ۔ جہاں تک ''فطرت،، کا سوال ہے، امید ہے کہ گذشتہ تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہوگی ۔ اب لو اس تقاضا کو ۔ میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ انسان، حیوان ہی کی ایک ارتقا پذیر شکل ہے ۔ اس لئے انسان اور حیوان میں چند اقدار مشترک ہیں ۔ اگر ان اقدار مشترکہ کو کم از کم درجے تک لے جائیں تو نظر آئیگا کہ تحفظِ خویش اور افزائش نسل' دو نمایاں خصوصیات ہیں جو حیوانات اور انسان دونوں میں موجود ہیں ۔ جہاں تک تحفظِ خویش کا تعلق ہے، میں اپنے کسی سابقہ خط میں بتا چکا ہوں کہ حیوان اپنی وقتی ضروریات کے پورا ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے، لیکن انسان وقتی ضروریات کے بعد بھی بہت کچھ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے ۔ اسی طرح افزائش نسل کے جذبہ کو لیجئے ۔ حیوانات میں جنسی اختلاط محض افزائش نسل کی خاطر ہوتا ہے اور اس کے لئے خدا کے تخلیقی قانون نے ان پر ایسی پابندی عائد کر رکھی ہے جس سے سرکشی ممکن نہیں ۔ حیوانات کے جوڑے ہر وقت ساتھ ساتھ پھرتے رہتے ہیں ۔ لیکن جنسی قوتوں کی موجودگی کے با وصف، انہیں جنسی اختلاط کا خیال ہر وقت دامنگیر نہیں رہتا ۔ یہ جذبہ اسی وقت روبہ کار آتا ہے، جب افزائش نسل کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس اس کے برعکس انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے، جس وقت جی چاہے، جنسی اختلاط میں مشغول ہو سکتا ہے ۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ (تحفظِ خویش اور افزائش نسل کے) ان دونوں بنیادی تقاضوں میں حیوان اور انسان میں کس قدر فرق ہے ۔ انسان، اس باب میں، کسی ''اندرونی قاعدے،، کی رو سے مجبور نہیں، بلکہ اسے اختیار حاصل ہے کہ ان تقاضوں کو جس طرح جی چاہے پورا کرے ۔ لیکن انسان، تمدنی زندگی (Social Life) بسر کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کا عمل دوسرے افراد کو بھی متاثر کرتا ہے ۔ اس لئے انسانی اختیار و ارادہ کو بلا حدود و قیود نہیں چھوڑا جا سکتا ۔ اس کے اختیار

کو صحیح سواحل (Channels) میں مقید رکھنے کے لئے وحی کی رو سے تحدید کی گئی ہے ۔ اگر ’’افزائش نسل ،، کی قوتوں پر تحدید عائد نہ کی جائے تو انسانی معاشرہ میں جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور اگر تحفظِ خویش کے جذبہ کو بے زمام چھوڑ دیا جائے تو اس سے معاشی فساد (ناہمواریاں) نمودار ہو جاتی ہیں ۔ تحفظِ خویش کے جذبہ کو بے لگام چھوڑ دینے کا نام ’’خود غرضی ،، ہے ۔ ہدایتِ خداوندی کی رو سے عائد کردہ تحدیدات ، افزائش نسل اور تحفظ خویش کے تقاضوں کی تسکین کا انتظام بطریق احسن کر دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی معاشرہ کو ان ناہمواریوں سے بچا لیتی ہیں جو ان جذبات کو بلا تحدید چھوڑ دینے سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں ۔

اب سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ خود غرضی ’’فطرتِ انسانی ،، کا تقاضا نہیں بلکہ تحفظِ خویش کے حیوانی (اور انسانی) تقاضا کو ، ذاتی جذبات کے مطابق پورا کرنے کی کوششِ بے مہار کا نام ہے ۔ ذاتی جذبات ، انفرادی تحفظ خویش کی اندھی کوششوں میں ، کلی مفاد انسانیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور وحی کی رو سے متعین کردہ نظام ، تحفظ خویش کا ایسا انتظام کرتا ہے جس میں تمام نوعِ انسان کی پرورش اور ہر فرد کی امکانی صلاحیتوں کا نشو و نما (یعنی تعمیر ذات) بطریقِ احسن ہو جائے ۔ اس کا نام نظامِ ربوبیت ہے ۔ پھر سن رکھو سلیم! کہ مقصود حیات صرف طبعی زندگی کی پرورش نہیں ۔ اگر مقصود یہی ہوتا تو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کیا ہی نہ جاتا ۔ یہ حقیقت کہ انسان حیوانی سطح سے بلند ہے ، اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مقصودِ حیات طبعی زندگی کی پرورش سے آگے ہے ۔ اسی کا نام انسانی صلاحیتوں یعنی اس کی ذات یا (Personality) کا نشو و نما پانا ہے اور اس کا انتظام نظام ربوبیت کی رو سے ہوتا ہے جس کا ضابطہ قرآن ہے ۔

اب سلیم! تمہارا دوسرا اعتراض سامنے آتا ہے ۔ تم کہتے ہو کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کچھ زیادہ تگ و تاز بھی نہیں کرتا ۔ لیکن یوں

هی کچھ ''اتفاق،، ایسا هو جاتا هے که اسے بے شمار دولت مل جاتی هے ۔ چونکه اس قسم کے اتفاقات (Chances) کی کوئی منطقی توجیه سمجھ میں نہیں آتی اس لئے اس سے انسان اس نتیجه پر پہنچ جاتا هے که ایسا خدا کی طرف سے هوتا هے ۔ اس کے بعد یه سمجھ لیا جاتا هے که جب خدا کا منشاء یه هے که اس شخص کو اس قدر فراواں دولت دیدی جائے تو اس پر تحدید منشائے خداوندی کے خلاف هوگی ۔

تمہارا یه اعتراض بھی سلیم! بہت سی بنیادی غلط فہمیوں پر مبنی هے ۔ تم نے ''اتفاق،، (Chance) کا ذکر کر کے ''تقدیر،، کا مسئلهٔ چھیڑ دیا اور تم جانتے هو که یه مسئله ایسا نہیں جو خطوں میں طے هو جائے ۔ بایں همه جہاں تک تمہارے زیر نظر اعتراض کا تعلق هے، اس کے متعلق مختصراً اس خط میں لکھنا مناسب هے ۔

میں اوپر لکھ چکا هوں که هماری کائنات کے دو حصے هیں ۔ ایک حصه عالم آفاق (یعنی انسانوں کی دنیا کے علاوه باقی ساری کائنات) اور دوسرا حصه، انسانی دنیا ۔ سلیم! اگر تم اس بنیادی فرق کو پیش نظر رکھو تو مسئلهٔ تقدیر کی بہت سی پیچیدگیاں خود بخود حل هو جائینگی ۔ عالم آفاق میں خدا کا قانون از خود کارفرما هے اور کسی کو اس سے سرتابی کی مجال نہیں ۔ (کل له قانتون) لیکن انسان کو صاحب اراده پیدا کیا گیا هے ۔ یه اپنی مملکت میں آپ صاحب اختیار هے ۔ لیکن جس طرح عالم آفاق کی نشو و ربوبیت ایک قانون کے تابع هوتی هے اسی طرح عالم انسانی کی نمو و ارتقاء بھی ایک نظام کے ماتحت کارفرما هوتی هے ۔ عالم آفاق میں هر شے کو اس قانون کی پابندی طوعاً و کرهاً کرنی پڑتی هے، اس لئے یه کہا جا سکتا هے که وه ''تقدیر،، کے پابند هیں ۔ یعنی اُن اندازوں کے پابند جو ان کی نقل و حرکت اور نشو و نما کے لئے مقرر هیں اور جن سے انہیں کسی صورت میں بھی مفر نہیں ۔ اس کے بر عکس عالمِ انسانیت میں یه قانون، هدایتِ خداوندی کی شکل میں موجود رهتا هے، لیکن انسان کو یه اختیار حاصل

ہوتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات تخلیقی قانون کی پابندی مجبوراً کرتی ہیں، جو ان کے اندر ودیعت کر کے رکھدیا گیا ہے۔ لیکن انسان، قانون خداوندی کی پابندی اپنے اختیار سے کرتا ہے جو اسے انبیاء کی وساطت سے ملتا ہے۔ بقول اقبال

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اب آگے بڑھو۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ خارجی کائنات سے بھی متعلق ہے۔ یعنی اس کی طبعی زندگی یا اس کا نظامِ بدن انہی قوانین کے مطابق چلتا ہے جو حیوانات کی طبعی زندگی میں کار فرما ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کائنات ہی کی فضاؤں میں سکونت پذیر ہے، اس لئے کائناتی حوادث بھی اس کی زندگی کے نظام طبعی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی جگہ زلزلہ آ جاتا ہے تو ہزاروں انسان دب کر مر جاتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بستیوں کی بستیاں خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی ہیں۔ انسان کائنات کی ان خارجی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ لیکن جو قوتیں ہنوز اس کے دام تسخیر سے باہر ہیں، وہ ضرور اس پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ جس چیز کا نام تم نے ”اتفاق،، رکھا ہے اس کا ایک حصہ ان ہی قوتوں کے غلبہ سے متعلق ہے۔ یہ ”اتفاق،، محض اس وقت تک ”اتفاق،، (Chance) رہتا ہے جب تک کائنات کی ان قوتوں کے اسباب و علل انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں جب یہ اسباب و علل انسان کی سمجھ میں آ جاتے ہیں تو یہ قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور تسخیر شدہ قوتیں، قاعدے اور قانون کے مطابق کارفرما رہتی ہیں۔ ان میں ”اتفاق،، کا طلسم ختم ہو جاتا ہے۔

”اتفاق،، کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے اور یہی وہ حصّہ ہے جس کی طرف تم نے اپنے اعتراض میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمہارا کہنا یہ ہے کہ عام قاعدے کے مطابق، ثمر، محنت کے ماحصل کا نام ہونا چاہئیے،

لیکن ھم دیکھتے ھیں کہ انسانوں کے بیشتر ثمرات ان کی سعی و کاوش کا ماحصل نہیں ھوتے، بلکہ ایسی راھوں سے آتے ھیں جنہیں سعی و کاوش اور جد و جہد سے کچھ علاقہ نہیں ھوتا۔ ان ھی کا نام تم نے ”اتفاقات“ رکھا ھے۔ لیکن اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت واضح ھو جائیگی کہ یہ ”اتفاقات“ دراصل ھمارے غلط معاشری نظام کا نتیجہ ھیں۔ صحیح معاشری نظام میں ھر نتیجہ قاعدے اور قانون ھی کے مطابق مرتب ھوتا ھے۔ اس میں ثمرات، سعی و کاوش ھی کا ماحصل قرار پاتے ھیں۔ جس طرح کائنات کی مسخر شدہ قوتوں میں ”اتفاقات“ کا طلسم باقی نہیں رھتا اسی طرح صحیح معاشری نظام میں بھی ”اتفاقات کا سم سم“ ختم ھو جاتا ھے۔ وھاں ”مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ“ ($\frac{۹۹}{۷-۸}$)۔ کا بے لاگ قانون کارفرما ھوتا ھے جس میں عمل انسانی کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ھوتا ھے اور بے عملی کوئی ثمر پیدا نہیں کرتی۔ نہ ھی غلط عمل، صحیح نتیجہ مرتب کرتا ھے۔ ھم نے اپنے اوپر غلط نظام مسلط کر رکھا ھے اور اس کے نتائج کو ”اتفاقات“ کا نام دیکر انہیں ”فضل خداوندی“ کی طرف منسوب کر دیتے ھیں۔ ذرا غور کرو سلیم! ”ھذا من فضل ربّی“ کے یہ بڑے بڑے درخشندہ اور مقدس کتبے کیا اس غلط معاشری نظام کے ”اتفاقات“ ھی کے مظہر نہیں ھیں؟

اب یہ بات سامنے آنی چاھئیے کہ غلط نظام میں یہ ”اتفاقات“ وقوع پذیر کس طرح ھوتے ھیں؟ ھم کہتے یہ ھیں کہ غلط نظام طاغوتی نظام ھوتا ھے۔ اس میں ”ابلیس“ کا قانون کار فرما ھوتا ھے۔ ذرا سوچو کہ ”ابلیس“ کرتا کیا ھے؟ وہ کسی دوسری دنیا سے، دولت یا قوّت لا کر ”اتفاقات“ کے ذریعے بہم نہیں پہنچا دیتا۔ وہ کرتا صرف یہ ھے کہ دولت اور قوت کی تقسیم ناھموار طریق سے کر دیتا ھے۔ یعنی قانونِ بقائے توانائی (Law of Censervation of Energy) کی طرح دولت یا قوّت کی مقدار تو اتنی ھی رھتی ھے۔ صرف اسکی تقسیم ناھموار ھو جاتی ھے (اسی کا نام فساد ھے)۔ وہ ایک طبقہ سے اس کی محنت کا ماحصل چھین کر، دوسرے

طبقہ کو بلاسعی و محنت دیدیتا ہے (اسی بلاسعی و محنت یافت کا نام ''اتفاق،، ہے)۔ یہ ''معاشی فساد،، ہے۔ اسی طرح وہ ایک طبقہ کی اختیاراتی قوتوں کو چھین کر دوسرے طبقہ کو دیدیتا ہے۔ اس کا نام ''سیاسی فساد،، ہے۔ (چھین کر کیا دیدیتا ہے۔ وہ اس مقصد کے لئے ایسے ایسے غلط تصورات پیدا کر دیتا ہے جس سے ایک طبقہ اپنی قوتوں کو از خود دوسرے طبقہ کے حوالے کر کے ان کے رحم و کرم پر جینے کا خوگر ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اس کا نام ''مقدّر،، رکھ لیتا ہے)۔ یہی وہ معاشی فساد ہے جس کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ

فرنگ آئینِ رزاقی بداند   بایں بخشد از و و اسی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند   کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اسی طرح اقبال سیاسی فساد کے پیدا کردہ خداؤں کے متعلق کہتا ہے کہ ان کی قوت بھی اپنی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ

ایں صنم چو سجدہ اش کردی خداست   تا یکے اندر قیام آئی فنا ست

یہ سب کچھ لازمی نتیجہ ہے اس غلط نظام کا جو وحی سے الگ ہٹ کر قائم کیا جاتا ہے۔ اگر سلیم! انسان اپنے معاشرتی نظام کو وحی کی متعین کردہ بنیادوں پر استوار کر لے تو اس میں نہ ''غلط تقسیم،، ہوتی ہے اور نہ ہی وہ ''اتفاقات،، باعث فریب نگاہ بنتے ہیں، جن کا نام معاشی دنیا میں ''فضل ربّی،، رکھ کر دھوکے کا جال بچھایا جاتا ہے اور سیاسی دنیا میں ''ظل الٰہی،، اور ''نیابتِ خداوندی،، کے سحرِ مقدس سے اپنی ہوس خون آشامی کی تسکین کی جاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ انسان کی معاشری دنیا میں جن چیزوں کو ہم ''اتفاقات،، قرار دیکر ''منجانب اللہ،، تصور کر لیتے ہیں، وہ در حقیقت ہماری معاشری ناہمواریوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطے میں ''اتفاقات،، کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جس خدا کے تخلیقی قانون کی یہ کیفیت ہو کہ آسمان کے محیّر العقول کرّے اس قدر حیرت انگیز جسامت اور حیران کن رفتار کے باوجود ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے برابر بھی ادھر ادھر

نہیں ہوسکتے، کیا اسی خدا کے قانون کا وہ حصہ جو انسانی اعمال اور ان کے نتائج سے متعلق ہے (معاذاللہ) اس قدر ''سکھا شاھی'' کا قانون ہوجائے گا کہ جسے چاہے بلا قاعدہ اور قانون فراوانیٔ رزق عطا کر دے اور جس پر چاہے روزی کے دروازے بند کر دے؟ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔ اللہ تعالیٰ جہاں ''مَنۡ یَّشَآءُ'' کہتا ہے اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جسے چاہا ''موج میں آ کر'' خزانے بخشدیئے اور جسے چاہا ''خفگی میں آ کر'' نان شبینہ تک سے محتاج کر دیا۔ خدا کی مشیت اس کے قانون کائنات کا دوسرا نام ہے۔ اور انسانوں کی دنیا میں اس کا قانون مشیت انسانوں ہی کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ یعنی جب انسانی نظام خدا کے ضابطے کے مطابق متشکل ہوگا تو اس کے نتائج قانون مشیت کے مطابق خوشگوار مرتب ہوں گے۔ اور جب یہ نظام غیر خدائی ضابطے کے مطابق ہوگا تو اس کے عواقب قانون مشیت کے مطابق ناخوش آیند ہوں گے۔ یہ خدا کا قانون ہے ولن تجد لسنۃاللہ تبدیلا۔ اور تم خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے*۔ لہذا جو قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل اور غیر متبدل ہو، اس میں ''اتفاقات'' کا کیا دخل اور بلا سعی و محنت ثمرات حاصل کرنے کی توقع کیسی؟ اس میں قدم قدم پر جزاءبما کانو یعملون کا قانون خوشگواریوں اور بدحالیوں کی میزان بنتا ہے۔

قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

اس کے برعکس یہ ''ابلیسی نظام'' کے کرشمے ہوتے ہیں کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

تمہاری بیتابیٔ تمنا مجھ سے رہ رہ کر پوچھتی ہے کہ قرآن کا یہ نظام ربوبیت، جو نوع انسان کے لئے آیۂ رحمت ہے، کس سر زمین میں متشکل ہوگا اور کب ہوگا؟ اس کے متعلق میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ اس نظام کی تشکیل کے لئے اولیں مرحلہ یہ ہے کہ اس کا صحیح اور واضح تصور ذہنوں میں جاگزیں ہو جائے۔ اس لئے کہ انسان کی خارجی دنیا میں کوئی انقلاب وقوع پزیر نہیں ہوسکتا جب

---

* تفصیل اس اجمال کی ''من و یزداں'' میں ملیگی۔

تک پہلے اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ اندرونی تبدیلی کے بغیر ہنگامے تو رونما ہو سکتے ہیں، انقلاب ظہور میں نہیں آ سکتا۔ مجھے اس ذہنی تبدیلی کے آثار اسلامی ممالک میں کہیں نظر نہیں آتے۔ میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے اربابِ فکر سے ملا ہوں اور جن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ان کے فکر کا مطالعہ کیا ہے۔ تم حیران ہو گے سلیم! مجھے خالص قرآنی فکر کہیں دکھائی نہیں دی اور خالص قرآنی فکر کے بغیر، قرانی نظام کی تشکیل کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہاں یا تو اس فکر کا نام اسلامی فکر رکھا جاتا ہے جو ہم میں ہزار برس سے متوارث چلا آرہا ہے، اور جس کے متعلق میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ وہ یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کے تصوراتِ حیات اور نظریات زندگی سے اس حد تک متاثر ہے کہ اس میں خالص قرآنی فکر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اور یا، اسلام کو ایک نجی عقیدہ قرار دے کر، عملی دنیا میں مغرب کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس باب میں ہم پاکستانی مسلمان فی الجملہ خوش بخت واقع ہوئے ہیں کہ یہاں خالص قرآنی فکر کی تابناک شعاعیں ضوفشاں ملتی ہیں۔ مبدأ فیض کی کرم گستری سے یہیں اقبال پیدا ہوا جس نے اسلامی فکر پر چھائے ہوئے عجمی تصورات کو نمایاں کر دینے کی کوشش میں اپنی عمر صرف کر دی اور اپنی نوائے شوق سے ملت اسلامیہ کو مجموعی حیثیت سے قرآن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ یہی سر زمین حافظ سید محب الحق (مرحوم ومغفور) کی بصیرتِ قرآنی کی جلوہ گاہ بنی کہ جنہوں نے قریب ساٹھ ستر برس مسلسل قرآن کی طرف دعوت دی۔ آج اسی سر زمین میں علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ، العالی* کی قرآنی فکر برگ و بار لا رہی ہے، جنہوں نے اپنی عمر عزیز اسی جہاد کے لئے وقف کر رکھی ہے۔—(اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے تاکہ ہم ان کے تدبر فی القرآن کے نتائج سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں*)۔ میرے کاشانۂ فکر میں سلیم! اگر کوئی چمکتی ہوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ ان ہی کے جلائے ہوئے چراغوں کا نور ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں ان حضرات کی اندھی تقلید کرتا ہوں۔ اندھی تقلید قرآن کی رو سے جرم عظیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان حضرات

---

* آپ کا انتقال دسمبر ۱۹۵۵ء میں ہو گیا۔ علیہ الرحمۃ

نے قرآن فہمی کے سلسلے میں جسقدر راستے ہموار کئے ان سے میرا سفرِ زندگی بڑا سہل اور آسان ہوگیا۔ یہی ان کی وہ قرانی خدمت ہے جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کا اسقدر احترام ہے۔ ویسے میں، اپنی بصیرت کے مطابق، ان کی فکر کو بھی قرآن کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہرحال جو قرآنی فکر فضائے پاکستان میں نور پاش دکھائی دیتی ہے اس کی مثال مسلمانوں کے کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے میری توقعات اسلامی ممالک میں سے اسی سر زمین سے وابستہ ہیں۔ یہی میری آرزؤں کی محور اور میری تمناؤں کی مرکز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس فضا پر بھی بڑے بڑے دبیز بادل چھارہے ہیں تاکہ آفتابِ قرآنی کی یہ تابندہ شعاعیں، اندھیرے میں جینے والی چمگادڑوں کے لئے وجہٗ خیرگیٔ نگاہ نہ بن جائیں۔ لیکن بایں ہمہ اسلامی ممالک میں اگر اس فکر کی تابانی کے کہیں امکانات ہیں تو وہ یہی سرزمین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سلیم! تمہیں اور تمہاری وساطت سے تمام نوجوانانِ ملّت کو تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اس سر زمین کی حفاظت اور استحکام کے لئے اپنی جانیں تک وقف کر دو۔ یہ محض اس لئے کہ اگر اسلامی ممالک میں سے کسی سر زمین میں قرآنی نظام کی تشکیل کے امکانات (زود یا بدیر) ہو سکتے ہیں تو وہ یہی خطۂ زمین ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ نامساعد حالات کے ان جھکّڑوں میں کسی نہ کسی طرح اس دئیے کو جلائے رکھوں۔ وہ دیا جو تیل کی جگہ خون جگر سے روشن ہوتا ہے۔ اگر غیر قرآنی اسلام کی علمبردار ملائیت کی تندو تیز ہواؤں نے اسے سرِ بام نہ جلنے دیا تو تہِ داماں جلاؤں گا اور اگر ان کی یورشیں وہاں تک بھی پہنچ گئیں تو اسے سینہ کے محراب میں، فانوسِ قلب میں روشن رکھوں گا کہ وہاں تو کوئی قوت اسے بجھا نہیں سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ سلیم! تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگونگا تاکہ مرتے وقت اس گران بہا امانت کو تمہارے سپرد کرکے اطمینان کی موت مروں۔ یاد رکھو سلیم! دنیا میں فروغِ آدمیت صرف قرآنی چراغ سے ہوسکے گا اور بس! واللہ علٰی مانقول شہید۔

کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس پیغامِ خداوندی کی اشاعت کے لئے ہم اپنے آپ کو اسلامی ممالک میں ہی کیوں مقید رکھیں۔ یہ پیغام تمام

نوع انسانی کے لئے ہے۔ اس لئے اگر اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی فضا زیادہ سازگار ہے تو اسے وہاں کیوں نہ عام کیا جائے؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ، مسلمانوں کی نسبت مغربی اقوام کے غیر مسلم قرآن کی آواز کو زیادہ توجہ سے سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ جو کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے اسے کس طرح چھوڑ دیا جائے؟ غیر مسلموں کے سامنے یہ سوال ہی نہیں۔ وہ قرآن کو اس کی ذاتی قیمت (Intrinsic Value) کے لحاظ سے پرکھیں گے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس نے، جب اور جہاں قرآن کو اس کی ذاتی قیمت سے (On Its Merits) پرکھا، وہ قرآن کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس اعتبار سے مجھے مغربی اقوام کی سر زمین، قرآنی پیغام کے لئے زیادہ سازگار معلوم ہوتی ہے کیوں کہ وہاں عقل ہے، ملّا ازم کی جہالت اور تنگ نظری نہیں۔

اب رہا یہ کہ ایسا کب ہوگا؟ سو اس کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ "جب اللہ چاہے گا"۔ اور میں جب اللہ سے یہی سوال کرتا ہوں تو وہاں سے جواب ملتا ہے کہ "جب تم چاہو گے"۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱)۔ اللہ کا قانون اس وقت خارجی انقلاب لایا کرتا ہے جب قوم میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔ یہی وہ "داخلی انقلاب" ہے جس کے لئے سب سے پہلے نوجوانانِ ملّت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنی ضروری ہے۔ اور یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کے سامنے وہ قرآنی تصورات بے نقاب کئے جائیں جن سے عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ میں وہ انقلاب پیدا ہو گیا تھا جس کی مثال پھر سامنے نہیں آئی۔ میری زندگی کا مقصد انہی قرآنی تصورات کا عام کرنا ہے۔ ولو کرہ المشرکون۔

والسلام

جون ۱۹۵۱ء پرویز

پینتیسواں خط

انسانی صلاحیتوں کی
نشو و نما کیسے ہو سکتی ہے؟

ہاں سلیم! تمہاری اطلاع درست تھی۔ میں پچھلے دنوں اچھا نہیں رہا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ۱۹۴۲ء میں مجھے لو لگ گئی تھی۔ اس کے بعد آج تک میری حالت یہ ہے کہ ذرا سی گرم ہوا بھی اثر کر جاتی ہے۔ اگلے دنوں یہی ہوا۔ ایک رات سخت تکلیف رہی۔ درد سے تڑپتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا دوائیوں کا بکس میرے سرہانے رکھا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ اس کے لئے کونسی دوائی چاہئے۔ صبح وہ آئے اور اسی ڈبے میں سے ایک دوائی نکال کر دی جس سے مجھے فوراً آرام ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے مصائب و نوائب کا شکار ہو رہے ہیں۔ مختلف نوعیتوں کے درد اور آلام میں مبتلا ہیں۔ قرآن ان کے سرہانے رکھا رہتا ہے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس نسخے کا استعمال کیسے کیا جائے۔ ''نیم حکیم'' کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ نہ شفا ہوتی ہے، نہ رہائی۔ ورنہ اگر یہ کبھی قرآن کھول کر دیکھ لیتے تو اس میں سے انہیں شفا کا نسخہ اس طرح مل جاتا جس طرح برادرانِ حضرت یوسفؑ کو بوریوں میں سے اپنی پونجی مل گئی تھی۔ لَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ (۱۲/۶۵)

کیسی بد بختی ہے سلیم! اس مریض کی جو تڑپ تڑپ کر جان دیدے دراں حالیکہ دواؤں کا بکس اس کے سرہانے رکھا ہو!

مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے ”فطرت اللہ“ کا صحیح مفہوم سمجھ لیا۔ ورنہ وہ بات مشکل بھی تھی اور روشِ عامہ سے ہٹی ہوئی بھی۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید اتنی جلدی تمہاری سمجھ میں نہ آسکے۔ دیکھا تم نے سلیم! ایک بات کے واضح ہو جانے سے کتنی اور باتیں خود بخود صاف ہو جاتی ہیں؟ قران فی الواقعہ بہت آسان ہے (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ) بشرطیکہ اسے سلیقے سے سمجھا جائے۔ اور اگر اسے چیستان بنا دیا جائے تو پھر اس میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے مکتبوں کے اٹھارہ علوم تو ایک طرف، دنیا بھر کے علوم زندگی کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتے۔ لیکن یہ گتھیاں خود ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ خود ہی اندر سے کواڑ بند کر رکھا ہے اور خود ہی رو رہے ہیں کہ باہر کیسے نکلیں۔ ہاتھ بڑھاؤ۔ کواڑ کھولو۔ باہر نکلنے کا راستہ خود بخود مل جائے گا۔

تم نے ٹھیک سمجھا ہے کہ خدا کا جو قانونِ تخلیق، عالمِ آفاق میں کارفرما ہے، وہی انسانوں کی دنیا میں نافذ العمل ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں یہ قانون ازخود کار فرما ہے اور یہاں انسان کو اختیار ہے کہ چاہے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے کوئی دوسرا قانون اختیار کر لے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہی ہے جو حیوانات سے متعلق ہے۔ یعنی انسان کی طبعی زندگی۔ اس میں بد یہی طور پر وہی قانون کارفرما ہے جو عام حیوانات میں جاری وساری ہے۔ حیوانات ہی کی طرح اس کی زندگی کا دارومدار بھی ہوا اور غذا پر ہے۔ سونا اور جاگنا بھی ان ہی کی طرح ہے۔ اس کے جسم کی مشینری بھی اسی طرح چلتی ہے۔ اسی قانون کے مطابق یہ زندہ رہتا ہے اور اسی کے مطابق مر جاتا ہے۔ لہذا جس قدر معاملات اس کی طبعی زندگی سے متعلق ہیں وہ اس کی انسانی زندگی نہیں بلکہ حیوانی زندگی کا حصہ ہیں۔ لیکن اس نے اس حصۂ زندگی میں بھی اپنے لئے اس قدر مصیبتیں پیدا کر لی ہیں کہ وہ مسائل جو حیوانات کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے، اس کے لئے زندگی کی اہم ترین مشکلات

(Problems) بن گئے ھیں ۔ جنگل کے جانوروں کو یہ سوچنے کی کبھی ضرورت ھی نہیں پڑتی کہ آج کھائیں گے کیا اور رات کو رھیں گے کہاں ؟ ھم بیمار پڑیں گے تو دوائی کون لا کر دے گا ۔ اور مر گئے تو بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا ؟ ان میں سے کسی کو اس کی فکر نہیں ستاتی ۔ لیکن یہ حضرت ”اشرف المخلوقات“ ھیں کہ ان کی زندگی کی ساری تگ و تاز انہی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ھو جاتی ھے اور اس پر بھی یہ سلجھنے میں نہیں آتیں ۔ ذرا غور کرو سلیم ! آج ساری دنیا انہی خود پیدا کردہ مسائل کے حل کرنے میں مصروف ھے اور مسائل ھیں کہ جس قدر حل کرو اور پیچیدہ ھوتے چلے جارھے ھیں ۔ کچھ لوگ ایسے ھیں جنہوں نے کسی حد تک کھانے پینے کے مسئلہ کا حل پالیا ھے ۔ وہ اسے انسانیت کا منتہائے کمال اور زندگی کی معراج سمجھتے ھیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اتنا بھی نہیں کر پائے اُن کے مقابلے میں یہ لوگ اپنی کاوش پر بجا طور پر فخر کر سکتے ھیں ۔ لیکن ذرا سوچو سلیم ! کہ کیا اس سے انسانیت کے مسائل حل ھوگئے ؟ کیا انسانی زندگی کا مقصود یہی ھے ؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ھے ، یہ مسائل انسانی زندگی کے اس حصہ سے متعلق ھیں جو انسان اور حیوان میں مشترک ھے ۔ لہذا زیادہ سے زیادہ یہ کہو کہ اس سے حیوانی زندگی کے مسائل حل ھوگئے ! انسانی زندگی کو تو اس نے ابھی چھوا تک بھی نہیں ۔ وہ مقام اس سے آگے ھے ۔ قرآن کا اعجاز یہ ھے کہ وہ انسانی زندگی کے معاشی پہلو (طبعی زندگی سے متعلق مسائل) کا حل بھی پیش کرتا ھے اور اس کی انسانی زندگی کے نشوونما اور ارتقاوبالیدگی کا نظام بھی متشکل کرتا ھے ۔ خدا کا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) ان تمام مسائلِ حیات کو محیط ھے ۔

میں نے تمہیں پچھلے خط میں بتایا تھا کہ خدا کے قانون تخلیق کی ایک شق یہ ھے کہ ھر شے میں کچھ امکانی قوتیں ودیعت کرکے رکھ دی گئی ھیں ، اور ان مضمر قوتوں کے نشوونما کے بعد انہیں تکمیل تک پہنچانا ، ان اشیاء کا مقصودِ حیات ھے (اسے قانون ربوبیت کہا جاتا ھے) ۔ ”بَڑ“ کے ایک ننھے سے بیج کو دیکھو ۔ اس میں کتنی عظیم القدر امکانی وسعتیں مضمر ھوتی ھیں ۔ اس میں سے کونپل

پھوٹتی ھے۔ کونپل پودا بنتی ھے۔ پودا بڑھ کر پیڑ بنتا ھے اور رفتہ رفتہ ایک تناور بڑ کی شکل اختیار کر لیتا ھے۔ اس میں پھل لگتا ھے جس کے اندر بیشمار ویسے ھی ننھے ننھے بیج ھوتے ھیں۔ ان میں سے ھر بیج اسی قسم کا بڑ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ھے۔ عالمِ آفاق میں یہ لامتناھی سلسلہ جاری و ساری ھے۔

بڑ کے بیج کا بڑ بن جانا، اس کا مقصودِ حیات ھے۔ یہی اس کی صلاحیتوں کا پیمانہ ھے، اسی کو اس کی تقدیر کہتے ھیں۔ وہ اگر اس انتہا تک نہیں پنچہتا، تو اپنے مقصد حیات میں ناکام رہ جاتا ھے۔ اس کی مضمر قوتیں تمام و کمال مشہود نہیں ھوتیں۔ لیکن وہ اپنے آخری مقام سے آگے بھی نہیں بڑھ سکتا کیونکہ اس میں اس سے آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ھوتی۔ یہ آخری مقام اس کی منزلِ مقصود ھے۔ اس کی سعی و کاوش کا رُخ اسی آخری مقام کی طرف ھوتا ھے۔ اس کی تمام تگ و تاز اسی نہج پر ھوتی ھے۔ وہ اسی کے لئے متشکل کیا گیا ھے۔ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ($\frac{۱۷}{۸۴}$)۔

پھر، اس پر بھی غور کرو سلیم! کہ مختلف اشیاء کی امکانی وسعتیں مختلف ھوتی ھیں۔ تمہاری کوٹھی کی باڑ کس قدر خوبصورت ھے، لیکن اس بیل میں نہ پھول آتے ھیں نہ پھل۔ پتوں کی تروتازگی اس کی آخری منزل ھے۔ اس کے ساتھ ھی چنبیلی کی شاخیں ھیں کہ بہار میں ھر شاخ عطر بیز اور عنبر فشاں بن جاتی ھے۔ لیکن اس کی منزل بھی پتوں اور پھولوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس سے آگے بڑھو تو آم کے پیڑ ھیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

انگبیں کے ھیں سر بمہر گلاس

اس سے آگے ببول ھے کہ بیچارے کا منتہائے کمال چند کانٹے ھیں جو قیس عامری کے لباس برھنگی کی بخیہ گری کرتے یا اس کی صحرا نوردیوں میں سامان آبلہ شکنی بنتے ھیں۔ لیکن پتے ھوں یا پھل، پھول ھوں یا کانٹے، کامیاب درخت وھی کہلاتا ھے جو اپنے انتہائی مقام تک جا پنہچے۔ جو راستہ میں سوکھ جائے وہ کاٹ کر جلا

دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی مضمر قوتیں بہ تمام و کمال نشوونما نہیں پاتیں۔ اس کی ممکناتِ زندگی تزکیہ یاب نہیں ہوتیں۔ (Un-developed) رہ جاتی ہیں۔ قانون حیات یہی ہے کہ جو بیج نشو و نما پا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ جو مٹی کے تودے کے نیچے دب کر رہ گیا وہ نامراد رہا۔ لہذا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی پہلی شق یہ ہے کہ ہر شے کی مضمر قوتیں اسکی آخری منزل تک نشو و نما پا کر مشہود ہو جائیں۔ چونکہ انسان کی خلقت بھی اسی قانون تخلیق کے مطابق ہوئی ہے۔ (فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا)۔ اس لئے جس انسان کی مضمر صلاحیتیں بہ تمام و کمال نشو و نما پا گئیں، وہ کامیاب ہوگیا۔ جس کی صلاحیتیں دب کر رہ گئیں وہ ناکام رہا۔ زندگی کی علامت، ذوق نمو۔ اور اس کا معراج، اس کے جوہروں کی برومندی اور ثمرباری ہے۔ رشکِ صد فردوس ہے وہ معاشرہ جس میں یہ شادابیاں اور سیرابیاں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا اور جہنم کی آگ ہے وہ ماحول جس میں یہ سرسبز شاخیں جل کر متحجر ہو جائیں وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو اور دیکھو کہ ایک ننھا سا بیج کس طرح تناور درخت بن جاتا ہے۔ بیج کو میز پر رکھ چھوڑو۔ اس میں قیامت تک آثار نمو دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کے لئے اسے مٹی میں ملانا ہوگا۔ مٹی میں نمی کا ہونا بھی ضروری ہے، پھر اسے حرارت بھی درکار ہے۔ اس کے بعد ہوا بھی۔ آب و خاک و باد و نار کے امتزاج سے بیج میں شگفتی پیدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے یہ مختلف عناصر باہمی تعاون ہی نہیں پیدا کرتے بلکہ ان میں ائتلاف کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام عناصر اپنے آپ کو بیج کے اندر جذب کر دیتے ہیں اور جسے ہم کونپل کہتے ہیں وہ در حقیقت ان تمام عناصر کے امتزاج سے عبارت ہوتی ہے۔ ان عناصر کو الگ الگ رکھئے۔ کسی میں بالیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ جب یہ اپنے آپ کو ایک دوسرے میں جذب کر دیں گے تو ہر ایک میں جوش نمو ابھر آئے گا۔ جسے ہم پھل کہتے ہیں وہ تنہا

بیج کی ارتقا یافتہ صورت نہیں ہوتی۔ نہ معلوم اس میں کس قدر مٹی کے نمک، پانی، ہوا اور حرارت کے مرکبات باہمد گرمدغم ہوتے ہیں۔ پھل، گویا ان سب کی ارتقایافتہ شکل کا نام ہے۔ جو سینکڑوں گردشوں کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

لہذا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی دوسری شق یہ ہے کہ کوئی قوت انفرادی طور پر ارتقائی منازل طے کر کے نشو ونما نہیں پا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسری قوتیں بھی اپنے آپ کو اس کے اندر جذب کر دیں۔ اور اس طرح یہ تمام قوتیں ایک دوسرے میں سمو کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ نشوونما (Development) کا راز ربط باہمی میں ہے۔

انسانی زندگی میں اس ربط باہمی کا نام اجتماعی نظام یا معاشرہ ہے۔ جس نظم کے ماتحت یہ اجتماعی نظام وجود میں آتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں اسے "الدین" کہاجاتا ہے۔ قانونِ تخلیق کی اس شق کے مطابق، افراد انسانیہ، انفرادی طور پر، اپنی مضمرصلاحیتوں کونشوونمادے ہی نہیں سکتے۔ اس کے لئےضروری ہے کہ مختلف افراد اپنی اپنی صلاحیتوں کو ایک کلُ میں سمو دیں۔ (اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ) اور اس عمل ائتلاف سے نشووارتقا کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔ اس کا نام امّت، یا ملّت یا جماعت ہے۔ یہ کلُ ان افراد کی قوتوں میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لیتا۔ اس کا دراصل وجود ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح مشین پرزوں کے مجموعہ کےسوا کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن مشین کی مجموعی قوت، یا تخلیقی نتیجہ (Creative Outcome) پرزوں کی مجموعی قوت سے زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مشین میں قوت کی یہ زیادتی کہاں سے آجاتی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ دراصل نتیجہ ہوتی ہے اس نظم (Order) کا جس میں وہ پرزے رکھ دئیے جاتے ہیں۔ ان پرزوں سے اس نظم کو الگ کر دیجئے۔ ان کی تمام قوت معدوم ہو جائے گی۔ وہ نظم جو افراد (کے پرزوں) کو جماعت (کی مشین) کی صورت میں متشکل کر دیتا ہے الدین کہلاتا ہے۔ "دیندار" وہ افراد ہیں جو نظمِ باہمی سے جماعت (مشین) کی صورت میں مربوط ہوجائیں اور اس طرح ان کی ہر حرکت ایک خاص نتیجہ

پیدا کر دے۔ پرزوں کی اس ہم آہنگی (ایک قانون کے تابع نقل و حرکت) کو اسلام کہتے ہیں۔ جب چار چار گھوڑے اکٹھے چلیں، اس طرح کہ ان کے قدم ایک ساتھ اٹھیں اور ایک ساتھ جھکیں تو اسے تسالم کہتے ہیں۔ اسی سے اسلام کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی وارکعوا مع الراکعین۔ جھکنے والوں کے ساتھ جھکنا۔

میں نے پرزوں اور مشین کی مثال محض سمجھانے کی خاطر دی ہے۔ ورنہ افراد کے نظم و ضبط باہمی کا تعلق پرزوں کے ربط و ترتیب سے مختلف اور بلند ہوتا ہے۔ پرزوں کا ربط زیادہ سے زیادہ تعاون کہلاتا ہے، لیکن مسلم افراد کا ربط باہمی (آلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ) یعنی اس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو جانا جس طرح ایک بادل دوسرے بادل میں سمو جاتا ہے

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی اور یک نگہی کی یہ آخری منزل ہے جسے تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۱۹۹) فلاحت، یعنی ”کھیتی کے بارآور“ ہونے (بیج کے درخت بن کر ثمر بار ہو جانے) کے لئے اس قسم کا ارتباط و ائتلاف ناگزیر ہے۔ اس میں ہر فرد، دوسرے افراد کی ربوبیت کا سامان بن کر خود اپنی نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے، جس طرح مٹی اور پانی، حرارت اور ہوا، بیج کی ربوبیت کا ذریعہ بن کر درحقیقت خود اپنی نشوو ارتقاء کا موجب بنتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کون کس کی ربوبیت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ تمام افراد اپنی اپنی مضمر صلاحیتوں کو ایک مشترک منزل کے حصول کے لئے روبہ عمل لاتے چلے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کی صلاحیتیں نشوونما پا کر خود بخود (Develop) ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی کا نام مساعی کا مشکور ہو جانا ہے۔ (کان سعیکم مشکورا)

قانون تخلیق خداوندی (فطرت اللہ) کی یہ دوسری شق ہے۔ اس کے بغیر امکانی صلاحیتیں کبھی نشوونما نہیں پا سکتیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ھم نے دیکھا ھے کہ بیج کی نشو و نما کے لئے، مختلف اور متضاد قوتوں کے باھمی امتزاج و ادغام کی ضرورت ھے۔ پانی اور حرارت۔ ھوا اور مٹی۔ سب کا باھمی امتزاج۔ لیکن اس کے ایک اور پہلو پر بھی غور کرو۔ آغوشِ خاک، بیج کے لئے سامانِ زیست ھے۔ لیکن وھی مٹی اگر ذرا زیادہ مقدار میں بیج کے اوپر آجائے تو اس سے بیج کا گلا گھٹ جاتا ھے اور وہ وھیں دب کر رہ جاتا ھے۔ پانی، کونپل اور پودے کے لئے ذریعۂ حیات ھے۔ لیکن اگر پانی ذرا بھی اپنی حد سے بڑھ جائے تو پودے کی کشتیٔ حیات اس میں غرق ھو جاتی ھے۔ حرارت کے بغیر رگِ تاک میں خونِ زندگی موجزن نہیں ھوسکتا۔ لیکن یہی حرارت اگر ایک قدم آگے بڑھ جائے تو ھری بھری کھیتیوں کو جھلسا کر رکھ دیتی ھے۔ ھوا، ھر پودے کے لئے نفسِ حیات ھے لیکن اسی ھوا کی تیزی اسے جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتی ھے۔ اس سے ظاھر ھے کہ ان متضاد عناصر کا باھمی ارتباط و امتزاج ھی ضروری نہیں۔ بلکہ اس امتزاج کے لئے ایک خاص توازن و تناسب بھی لاینفک ھے۔ جہاں یہ توازن بگڑا، نہ صرف نشو و نما رک گئی بلکہ بیج کی تمام امکانی قوتیں سلب ھو کر رہ گئیں۔

اعتدال اور تناسب کے ساتھ ھی، ایک چیز موقع اور محل بھی ھے۔ پودے کی برومندی کے لئے کبھی حرارت کی زیادہ ضرورت ھوتی ھے، کبھی ٹھنڈک کی۔ کبھی پانی کی ضرورت ھوتی ھے، کبھی خشکی کی۔ موسم اور بے موسم کی کاشت اسی فرق کی مظہر ھوتی ھے۔ لہذا قانون تخلیق کی تیسری شق یہ ھے کہ مختلف قوتوں میں خاص تناسب قائم رھے اور جس وقت جس قوت کی خاص طور پر ضرورت ھے اس وقت وھی قوت، اپنے خاص توازن کو لئے ھوئے، بروئے کار آئے۔

انسانی زندگی میں متضاد قوتوں کا تصادم، ایک تو ھر فرد کے اپنے سینے میں ھوتا ھے اور دوسرے، مختلف افراد میں۔ با ھمدگر متضاد قوتوں کی کشمکش جو انسان کے اپنے سینے میں موجزن ھوتی ھے، اُس سے کہیں زیادہ گہری اور شدید ھوتی ھے جو دو افراد کے درمیان وجۂ کشاکش ھوتی ھے۔ افراد کی متضاد

قوتوں کی کشاکش محسوس اور مشہود ھوتی ھے ، اس لئے انہیں اس کا علم بدیہی طور پر ھو جاتا ھے۔ برعکس اس کے جن قوتوں کی رزمگاہ انسان کا اپنا سینہ ھوتا ھے وہ بڑی غیر محسوس اور یکسر غیر مرئی ھوتی ھیں۔ اس لئے ان کا تضاد بدیہی طور پر نظر نہیں آتا ۔ یہی وجہ ھے کہ انسان دوسروں کے فریب کے مقابلہ میں خود اپنے نفس کے فریب میں بہت جلد آجاتا اور اس سے بڑی مشکل سے نکل پاتا ھے۔

متضاد قوتوں میں کشمکش پیدا ھوتی ھے عدم توازن سے۔ اگر ان میں توازن قائم رھے تو ان کی باھمی کشمکش ختم ھوجاتی ھے اور وہ باھمی امتزاج و ائتلاف سے وجۂ بالیدگی نفس بن جاتی ھیں ۔ یعنی خود اپنے نشو و نما کا ذریعہ ۔ اس توازن کو قائم رکھنے کا نام ''حسنِ عمل'' ھے ۔ سلیم ! تم جانتے ھو کہ ''حسن'' کسے کہتے ھیں ؟ حسن ، صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ھے ۔ کسی شے کے مختلف اجزاء میں جس قدر صحیح تناسب ھوگا ، وہ اتنی ھی حسین کہلائے گی ۔ اور جب وہ تناسب اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے گا تو وہ شے جمالیاتی معراج تک جا پہنچے گی ۔ تاج محل کا حُسن ، کہ جسے دیکھ کر تم نے کہا تھا کہ جی چاھتا ھے اسے گلے سے لگالوں اور خوب زور سے بھینچوں، اس کے تناسب کے سوا اور کیا ھے ؟ اس میں تناسب اپنی انتہا تک پہنچ گیا ھے جس کی وجہ سے اس کا حسن بے مثال ھوگیا ھے ۔ دھلی کی جامع مسجد ، کہ جس کے متعلق حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ وہ تو ''بیگم'' ھے ، اسی صحتِ تناسب سے حسنِ مجسّم بن گئی ھے ۔ یہی تناسب جب انسان کی مضمر قوتوں میں رونما ھوتا ھے تو اُسے قرآن ''حسنات'' سے تعبیر کرتا ھے ۔ اس کی ضد ''سیئات'' ھے ، جس کے معنی تناسب کا بگاڑ ھیں ۔ جب ان قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ھوجائے تو اس کا نتیجہ خیر ھے ۔ جب توازن بگڑ جائے تو اُسے شر سے تعبیر کیا جاتا ھے ۔ انسانی قوتوں میں سے کوئی قوت نہ بجائے خویش خیر ھے نہ شر ۔ انسان کی امکانی قوتوں میں سے ھر قوت، حصولِ مقصدِ حیات کے لئے ضروری ھے ۔ اس لئے اِن تمام قوتوں کی کامل نشو و نما لاینفک ۔ اس نشو و نما کے بعد ، جب ان قوتوں میں باھمی تناسب پیدا ھو جائے تو وہ وجۂ

ربوبیت بن جاتی ہیں ۔ اس کا نام خیر ہے ۔ جب ان کا تناسب بگڑ جائے تو وہ باعث تخریب ہوجاتی ہیں ۔ اسے شر کہا جاتا ہے ۔ گویا ہر شے کی ایک شرّی کیفیت ہوتی ہے اور ایک خیر کی حالت ۔ خیر کی حالت وہ ہے جب اس میں توازن و اعتدال ہو اور شر کی حالت وہ ہے جس میں توازن بگڑ جائے ۔ ایک گلاس پانی باعثِ حیات ہے ۔ یہ اس کی خیر کی کیفیت ہے ۔ لیکن وہی پانی جب اپنے اعتدال سے بڑھ جائے اور انسان اس میں ڈوب کر مر جائے تو موجبِ ہلاکت ہو جاتا ہے ۔ یہ پانی کی شرّی کیفیت ہے ۔ لہذا پانی اپنی ذات میں نہ خیر ہے نہ شر ۔ اس میں دونوں پہلو موجود ہیں ۔ یہی حالت کائنات کی ہر شے کی ہے ۔ خدا کا قانون یہ سکھاتا ہے کہ ہمیشہ اشیائے کائنات کے خیر کے پہلو سے متمتع ہو اور شر کے پہلو سے مجتنب رہو ۔ غور کرو سلیم ! ”قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ“ (۱۱۳/۱) میں پناہ مانگی گئی ہے ”من شر ما خلق“ —— اشیائے کائنات کے شرّی پہلو —— سے ۔ کائنات اور انسان کی مختلف قوتوں میں صحیح تناسب، قانونِ خداوندی کے مطابق پیدا ہوتا ہے ۔ اس لئے جب بھی آفاقی اور انسانی قوتیں قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہوں گی، ان کا خیر ہی کا پہلو مشہود ہوگا ۔ (بِيَدِكَ الْخَيْرُ) انسان کے صحیح اختیار کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ معاشرہ میں خیر کے پہلو کو سامنے لائے ۔

جب افراد کے اندر، مضمر قوتوں کی نشو و نما بطریق احسن ہوتی ہے اور ان میں صحیح صحیح تناسب بھی پیدا ہوجاتا ہے تو اس سے انسان کی اپنی ذات پر جو کیفیت مرتب ہوتی ہے اسے قرآن نے ”اطمینان قلب“ سے تعبیر کیا ہے ۔ اطمینان، کسی منفی کیفیت (Negative Condition) کا نام نہیں ۔ یہ ایک ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے ۔ مثلاً جس انسان کی تندرستی ٹھیک ہو اور اسے کسی قسم کا فکر بھی دامن گیر نہ ہو، اس میں ایک عجیب قسم کے بھاری بھر کم، ثقاہت اور متانت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ۔ جسے یہ نصیب ہوتی ہے وہ اس کے سرور سے کیف اندوز ہوتا ہے اور

دوسرے لوگ صرف اس کے مظاھر سے اس کا اندازہ لگا سکتے ھیں ۔ اسی طرح جس انسان کی مضمر قوتیں پورے نشو و نما کے بعد ، متناسب و متوازن ھوجائیں اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ھو جاتی ھے جو اسے دوسرے انسانوں سے نمایاں طور پر متمیز کر دیتی ھے ۔ اسی کو قرآن ، مومن کا امتیازی نشان قرار دیتا ھے ۔ لیکن اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ کیفیت انفرادی طور پیدا نہیں ھوسکتی ۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے ، انسانی مضمر قوتوں کی نشو و نما انفرادی طور پر ناممکن ھے ۔ اس کے لئے اسے اجتماعی نظام کی ضرورت ھے ۔ جس اطمینان قلب کو کسی انفرادی عمل کا نتیجہ بتایا جائے وہ خواب آور افسوں ھوتا ھے ۔ اور تصوف میں یہی کچھ ھوتا ھے ۔ دوسرے یہ کہ جن افراد میں اطمینانِ قلب کی یہ کیفیت پیدا ھو جاتی ھے وہ اس کیفیت سے خود ھی لذت اندوز نہین ھوتے رھتے ۔ اس کیفیت کے معنی یہ ھیں کہ وہ افراد ، معاشرہ کا جزو بنکر اس کیفیت کو پورے معاشرہ میں مشہود کریں ۔

بالفاظ دیگر ، قرآنی اطمینان قلب کی کیفیت پیدا بھی معاشرے کے اندر ھوتی ھے ۔ اور معاشرہ ھی اس سے متمتع بھی ھوتا ھے ۔

جس طرح ایک فرد کی زندگی کی مضمر قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب ناگزیر ھے ، اسی طرح معاشرہ (اجتماعی زندگی) میں مختلف قوتوں میں تناسب بھی نہایت ضروری ھے ۔ جب کسی معاشرہ میں یہ تناسب قائم ھو جاتا ھے تو اسے ’’اصلاح‘‘ کی حالت کہتے ھیں اور جب یہ تناسب بگڑ جاتا ھے تو اسے حالتِ ’’فساد ،، سے تعبیر کرتے ھیں ۔ اصلاح کے معنی ھمواری ۔ اور فساد کے معنی ناھمواری ۔ ’’مصلحین ،، معاشرہ کے ان افراد کا نام ھے جن میں اس قسم کا تناسب و توازن قائم رھتا ھے ۔ مفسدین انہیں کہتے ھیں جن میں یہ توازن موجود نہیں ھوتا ۔ اصلاح کا نتیجہ اجتماعی ربوبیت ھے ۔ یعنی اس معاشرہ میں تمام افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کا سامان موجود ھوتا ھے (اس قسم کا معاشرہ خود ھی اس نشو و نما کا ذریعہ بن جاتا ھے) ۔ اس کے بر عکس ’’مفسدین ،، کے معاشرہ میں بڑی ناھمواریاں

ہوتی ہیں اور اجتماعی ربوبیت کے بجائے ہر فرد سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔

دوسری چیز موقعہ اور محل کا سوال ہے۔ یعنی ان قوتوں کی نشو و نما کے بعد، اس چیز کا فیصلہ کہ کس موقعہ پر کس قسم کی قوت کا رو بعمل آنا ضروری ہے۔ قرآن اس قسم کی قوتِ تمیز کو ’’بصیرت،، سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مردانِ مومن کے متعلق کہتا ہے کہ وہ ’’اولی الا یدی و الا بصار‘‘ صاحبان قوت و بصیرت ہوتے ہیں۔ یہ بصیرت قرآن میں غور و فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن جتنا کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے پہلے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو، پھر بات آگے چلے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کہتا چلا جاؤں اور تم بابا فتّے خاں کی طرح سوتے ہی میں ’’ہوں ہوں،، کرتے رہو۔ تم سلیم! بابا فتّے خاں پر تو ہنسا کرتے تھے لیکن اگر غور کرو تو دنیا میں اکثریت فتّے خانوں ہی کی پاؤ گے۔ سو رہے ہیں اور ’’ہوں، ہوں‘‘ کر رہے ہیں۔ بات سمجھنے والے بہت کم دکھائی دیں گے۔ اور پھر، جب تم بات بھی ایسی چھیڑ دو جو دنیا جہان سے نرالی ہو تو اس پر کان دھرنے والے کتنے مل سکیں گے؟ ایک وہ تھے جو کہتے تھے کہ

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اور ایک ہم ہیں کہ کہانی کہہ رہے ہیں، اور اول تو اسے سننے والے ہی نہیں ملتے، اور جو سن کر ’’ہنکارا‘‘ بھر رہے ہیں ان کے متعلق بھی شبہ ہے کہ نہ معلوم جاگ رہے ہیں یا سوتے ہی میں ’’ہوں ہوں‘‘ کئے جا رہے ہیں! بہر حال تمہارا تقاضا ہوتا ہے تو میں کہانی شروع کر دیتا ہوں۔ اب سننا نہ سننا تمہارا کام ہے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا کے جس قانون تخلیق (فطرت اللہ) کے مطابق انسان کی تخلیق ہوئی ہے اس کے مطابق

(i) مقصود تگ و تازیہ ہے کہ ہر انسان کی امکانی وسعتوں (Human Faculties) کی پوری پوری نشوونما (Development) ہوجائے۔

(ii) یہ نشوونما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اسکے لئے نظامِ اجتماعی لاینفک ہے۔

(iii) اور نظامِ اجتماعی میں ان کی صحیح نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے جب ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب قائم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ کس موقع پر کس قسم کی قوت رو بہ عمل آنی چاہیئے۔

اب آگے بڑھو۔ عالمِ آفاق (باہر کی دنیا) میں خدا کا قانون اس طرح کارفرما ہے کہ کائنات کی متضاد قوتوں میں کبھی تصادم واقعہ نہیں ہوتا۔ ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب بھی قائم رہتا ہے اور جہاں جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ قوت اتنی ہی مقدار میں بروئے کار آ جاتی ہے۔ کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن سلیم! انسان کی دنیا میں یہ قانون اس طرح نافذالعمل نہیں۔ انسان کو آزادی حاصل ہے۔ اسے صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس نے صحیح اور غلط راستے کو اپنے فیصلے سے اختیار کرنا ہے۔ اس باب میں انسان نے اپنے جذبات کی رو سے کیا فیصلہ کیا، یہ داستان دلخراش بھی ہے اور تبسم خیز بھی۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ انسان کے اندر بعض قوتیں شر کا موجب ہیں اس لئے ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں دبا دیا جائے۔ اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ انسان کی ساری تاریخ اسی لفظ "دبانے" (Suppression) ہی کی تفصیل ہے۔ انفرادی دنیا میں یہ "دبانا"، رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ رہبانیت کیا ہے؟ ان قوتوں کے دبانے (اور دبا دبا کر بالآخر اُنہیں، بزعم خویش فنا کر دینے) کا فلسفہ اور عمل۔ لیکن یہ انسان کی بھول تھی۔ انسان کے اندر نہ تو کوئی ایسی قوت ہے جو بجائے خویش شرانگیز ہے اور نہ انسانی قوتیں دبانے سے فنا ہوتی ہیں۔ انہیں ایک طرف سے دبائیے تو نمعلوم کتنے غیر معلوم "چور دروازوں"

کے راستے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لہذا رہبانیت (جو آگے چل کر خانقاہیت اور تصوف کے نام سے منصۂ شہود پر آئی) انسان کی غلط نگہی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ تو تھا انسان کی انفرادی زندگی کے متعلق۔ اس کی اجتماعی زندگی میں یہی ”دبانے“ کا عمل، استبداد ملوکیت کی شکل میں ظہور پزیر ہوا۔ استیلاء پسند انسانوں نے جب دیکھا کہ فلاں فلاں قوتیں ان کے مفاد کی راہ میں حائل ہیں، تو انہوں نے ان قوتوں کو دبانے اور دبا کر فنا کر دینے کی تدابیر سوچنی شروع کر دیں۔ (قانون خداوندی کے بجائے) انسانی ہاتھوں کا تراشیدہ نظام حکمرانی اسی ”دباؤ کے عمل“ کی منظم شکل ہے۔ نام مختلف ہیں۔ صورتیں بھی متنوع ہیں۔ لیکن روح ہر جگہ وہی کارفرما ہے۔ اس مقصد کے لئے انسان نے ”عہد جاہلیت“ میں لوہے کے شکنجے وضع کر رکھے تھے۔ اب تہذیب و تمدن کا دور ہے اس لئے آہنی شکنجوں کی جگہ آئینی شکنجوں نے لے لی ہے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ تم نے پڑھا ہوگا سلیم! جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر کے خلیفہ کو گرفتار کر لیا تو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ خلیفہ کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ہلاکو خاں نے کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے مشیروں نے اس سے کہا کہ مسلمانوں میں خلیفہ کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بڑی مقدس۔ ہم نے سنا ہے کہ اگر خلیفہ کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر جائے تو زمین شق ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس خلیفہ کی خونریزی خطرہ سے خالی نہیں۔ اس پر ہلاکو متردد ہوا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ چنانچہ حل یہ سوچا گیا کہ خلیفہ کو بڑے بڑے نمدوں میں لپیٹ کر کچل دیا جائے تاکہ اس کے مقدس خون کا کوئی قطرہ زمین پر گرنے نہ پائے۔ انسان کے دور جہالت اور زمانۂ تہذیب میں، سلیم! بس اتنا ہی فرق ہے۔ ”دباؤ“ کے استبدادی شکنجے اب بھی وہی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اب کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جسے کچلا جائے اس کے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی نہ دیں۔

قرآن نے آ کر کہا کہ یہ ”دبانے کا عمل“ یکسر غلط ہے۔ نہ رہبانیت

کا دباؤ درست ہے، نہ ملوکیت کا۔ (قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا) جس نے انسانی قوتوں کو دبایا وہ تباہ ہو گیا۔ اسے یہ قوتیں دبانے اور کچلے جانے کے لئے نہیں دی گئیں۔ انسان یوں ہی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آ گیا کہ اس میں کار آمد اشیاء کے ساتھ ساتھ کچھ مضر عناصر بھی رہ گئے ہوں جنہیں تباہ کرنا ضروری ہے۔ اس کی تخلیق خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق عمل میں آئی ہے اور خدا کا قانون ایسا ناقص نہیں کہ وہ مفید کے ساتھ مضر اور خیر کے ساتھ شر کو بھی لگا رہنے دے۔ اور اس کے بعد اس کی ایسی صفائی کی ضرورت پڑے کہ مضر کو مفید اور شر کو خیر سے الگ کر دیا جائے۔ تزکیہ نفس کا یہ تصور انسان کا خود تراشیدہ اور رہبانیت کا پیدا کردہ ہے۔ تزکیۂ نفس کے معنی انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہے (وَقَدْ آفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا) اسی کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو ان قوتوں کو کامل نشوونما دیتا ہے۔ فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تم ان کا تناسب بگاڑ دیتے ہو۔ معاشرہ (Society) کے مختلف افراد کی صلاحیتوں میں صحیح صحیح توازن (Balance) قائم رکھنا، یہی معاشرہ کا حسن ہے۔ قیام تناسب کا نام احسان ہے (یعنی حسن قائم کرنا)۔ بالفاظ دیگر افراد کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کا رخ اس طرف پھیر دینا جہاں ان صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اور اس طرح معاشرہ میں ہمواری پیدا کر دینا۔ اسلامی معاشرہ میں مرکزِ ملّت اسی قسم کی ہمواریاں پیدا کرتا ہے. اس سے تمام افراد معاشرہ کی مضمر قوتوں کی ربوبیت کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ نہ بڑھی ہوئی قوتیں بیجا مصرف سے موجب تخریب بنتی ہیں، نہ پیچھے رہ جانے والے سامانِ ربوبیت کی کمی سے مرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ کیا ہوتا ہے؟ یوں سمجھو کہ ایک (Blood Bank) ہے، جو ان افراد سے خون لے کر جہاں اس زیادتی سے رگیں پھٹ جانے کا احتمال ہو، ان جسموں میں داخل کر دیتا ہے جو کمی خون کی وجہ سے کمزور ہو رہے ہوں۔ اس سے اوّل الذکر افراد کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور ثانی الذکر میں احسان (یعنی کمی کو پورا کر کے تناسب کا قیام)۔ اس طرح معاشرہ کی تشکیل عدل و احسان کی رو سے قائم ہو جاتی ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ)۔

اب سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ

(۱) انسان کو کیسے معلوم ھو کہ اس کے اندر کون کون سی قوتیں مضمر ھیں جن کا تزکیہ (نشوونما) ضروری ھے؟

(۲) ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھا جائے؟

(۳) اور یہ کیسے معلوم ھو کہ کس موقع پر کس قوت کا مظاھرہ ضروری ھے؟

شق (۱) کیلئے ضروری ھے کہ انسان کے سامنے کوئی خارجی معیار (Objective Standard) ھو جس سے وہ ان قوتیں کا اندازہ کرتا جائے۔ وہ معیار، قرآن کی رو سے، ذاتِ خداوندی (اللہ) ھے۔ اللہ کی جو صفات قرآن میں مذکور ھیں وہ دو قسم کی ھیں۔ ابک کو صفات ذاتی (Personal Attributes) کہئے اور دوسری کو صفات اخلاقی (Ethical Attributes)۔ مثلاً ھُوالاوّل میں صفتِ اولیت پہلی قسم کی ھے۔ یہ صفات بہت تھوڑی سی ھیں۔ دوسری قسم کی صفات یہ ھیں جن کے متعلق فرمایا کہ صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً اللہ کے رنگ میں رنگے جاؤ اور اللہ کے رنگ سے زیادہ متناسب اور متوازن رنگ اور کونسا ھوگا۔ یہ وہ تمام قوتیں ھیں جو انسان کے اندر مضمر ھیں اور جن کی نشوونما بدرجہ اتم (Maximum Development) اس کی زندگی کا مقصود۔ یہ ھے وہ خارجی معیار جس کے مطابق یہ دیکھنا چاھئے کہ انسان کے اندر کن کن صفات (قوتوں) کی نشوونما کا امکان ھے اور ان کی نشوونما کس حد تک ھو رھی ھے۔ اللہ اس آئیڈیل کا نام ھے جس میں تمام صفات اپنے انتہائی نقطہ تک تکمیل یافتہ ھیں اور ایک ایسے تناسب و توازن سے سموئی ھوئی ھیں جس سے بہتر تناسب تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ لہ الاسماء الحسنیٰ۔*

باقی رھا یہ کہ انسان اپنی ذات اور اپنے معشرہ میں ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھے، سو اس کا ذریعہ، قرآنی اوامر و نواھی ھیں۔ یعنی کس حد تک بڑھا جائے اور کہاں پہنچ کر رکا جائے۔ ان ھی کا نام حدود اللہ ھے۔ اسی کو قرآنی نظام حیات کہا جاتا ھے۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آئیگا کہ کس مقام پر کونسی صفت

---

* تفصیل اس اجمال کی ''من و یزداں'' میں ملگی۔

(قوت) روبعمل آنی چاهئے۔ سو اس کے لئے قرآن کے ان مقامات پر غور کرنا ضروری هے، جن میں امم سابقه اور انبیائے گذشته کے احوال و کوائف مذکور هیں۔ ان سے یه حقیقت سامنے آجائے گی که کس موقعه پر خدا کی کونسی صفت ظهور میں آتی هے۔ اسی سے یه متعین کرنا هوگا که کون سے مقام پر هماری کس قسم کی قوت کو روبکار آنا چاهئے۔ جب کسی معاشره کا انداز اس کے مطابق هو جائے تو اس وقت کها جائیگا که اس معاشره کی تشکیل فطرت الله (خدا کے تخلیقی قانون) کے مطابق هے۔ یهی وه معاشره هوگا جس میں هر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما هوگی اور انهیں ٹھیک ٹھیک مقام پر، صحیح اندازه کے مطابق صرف میں لایا جائے گا۔ جب انسانی معاشره ان خطوط پر متشکل هوگا تو اس کا فطری نتیجه (یعنی قانون تخلیق کے مطابق نتیجه) یه هوگا که (وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا) زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور یهی وه نور هوگا جس کی روشنی میں انسانیت اپنے بلند مقامات کی طرف رواں دواں چل پڑے گی۔ لهذا سلیم! سب سے پهلے الله کے اسماء حسنیٰ کا قرآنی مفهوم سمجھنا نهایت ضروری هے۔ اس لئے که قرآنی تعلیم کی بنیاد یهی هے۔ اسی لئے قرآن نے "الله پر ایمان" لانے پر اس قدر زور دیا هے۔ الله پرایمان لانے کا عملی نتیجه اپنے آپ کا صحیح صحیح اندازه لگانا اور اپنی منزل مقصود کو پهچاننا هے۔ اس نقطۂ نگاه سے دیکھو تو اسماء حسنیٰ حدود بشری کے اندر انسان کی اپنی صفاتِ حسنه (مضمر جوهروں کے متناسب امتزاج) کا بیان نظر آئیں گے۔ اسی لئے حضرت علامهؒ نے کها تھا که

محمدؐ بھی ترا۔ جبریل بھی۔ قرآن بھی تیرا
مگر یه حرفِ شیریں، ترجماں تیرا هے یا میرا

امید هے سلیم! ان تصریحات سے فطرت الله کے متعلق اور گوشے بھی نکھر کر تمهارے سامنے آگئے هوں گے اور اب اس عنوان پر تمهیں کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نهیں رهی هوگی۔

اگست ۱۹۵۱ء

والسلام
پرویز

چھتیسواں خط

جنسی تعلقات کا تمدن پر اثر

سلیم میاں! تم نے بالآخر اس موضوع پر بھی بات چھیڑ دی جس سے تم اسوقت تک اتنی جھجک محسوس کر رہے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ (تمہارے الفاظ میں) میرے احترام کے جذبہ پر اس موضوع کی اہمیت غالب آگئی۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات کرتے وقت اس روایتی حجاب کو آڑے نہیں آنے دیا جو اس باب میں اکثر نوجوانوں کے گلوگیر ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم عنوان پر صحیح راہ نمائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور یہی حجاب ان کی تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جنسی تعلقات کے موضوع کو اسقدر شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے کہ "شریفوں کی مجلس" میں اس کا نام تک لینا بھی بے حیائی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ غیر شعوری طور پر نتیجہ ہے اس خانقاہی ضابطۂ اخلاق (Mystical Ethics) کا جو عیسائیت کی رہبانیت سے، تصوف کا لبادہ اوڑھ کر ہمارے ہاں آ پہنچا اور جس نے ہمارے تمام تصورات کو متاثر کر دیا۔ چونکہ رہبانیت میں جنسی تعلقات کو سخت معیوب اور وجۂ ذلتِ انسانیت سمجھا جاتا ہے، اس لئے ہمارے ہاں بھی جنسیات کو نہایت شرمناک تصور کیا جاتا ہے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر آجانے سے

پسینے چھوٹ جاتے ھیں ۔ جب ھمارے معاشرے میں جنسیات کے ذکر تک کو اسقدر شرمناک سمجھا جاتا ھو تو ظاھر ھے که اس موضوع پر ھمارے ھاں لٹریچر کس طرح مل سکتا ھے! چنانچه جہانتک میری معلومات یاوری کرتی ھیں ھمارے ھاں اس موضوع پر ایک کتاب بھی ایسی نہیں جسے سنجیدگی سے کسی نوجوان کے ھاتھ میں دیا جا سکے ۔ اس کا نتیجه یه ھے که ھمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) چوری چھپے اس سطحی (Cheap) جنسی لٹریچر کا مطالعه کرتے رھتے ھیں جو آوارگانِ مغرب کی بد لگام ذھنیت کا پیدا کردہ ھوتا ھے اور جس سے طرح طرح کے ذھنی، اعصابی اور جسمانی مفسدات پیدا ھوتے چلے جاتے ھیں (حالانکه یورپ میں اس موضوع پر سائنٹفک، سنجیدہ اور بلند پایه لٹریچر کی بھی کمی نہیں لیکن چونکه ھمارے نوجوان اس موضوع پر بات کرنے سے شرماتے ھیں اسلئے ان کی صحیح رھنمائی ھو نہیں سکتی اور ان کی رسائی صرف سطحی لٹریچر تک ھوتی ھے)۔ بہر حال تم نے اچھا کیا که اس موضوع کے متعلق بے تکلفی سے بات چھیڑ دی ۔ میں کوشش کرونگا که یه نہایت نازک، لیکن بڑا اھم مسئله، اچھی طرح تمھاری سمجھ میں آجائے ۔ لو سنو ۔

جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ھوئی' حیوانی سطح سے انسانی پیکر میں پہنچی تو وہ حیوانی زندگی کے بعض خصائص و لزومات بھی اپنے ساتھ لائی ۔ کھانا ۔ پینا ۔ سونا وغیرہ (جسم کا طبعی نظام) حیوان اور انسان میں مشترک ھیں ۔ بالفاظ دیگر، یه انسانی زندگی کی حیوانی سطح کے مظاھر ھیں ۔ انھی میں افزائش نسل (Procreation) اور اس کے لئے جنسی جذبه (Sexual Instinct) بھی شامل ھے ۔

کھانے پینے کے معامله میں، حیوانات پر بعض پابندیاں فطرت کی طرف سے ازخود عاید ھوتی ھیں ۔ مثلاً بکری گھاس کھاتی ھے ۔ گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی ۔ شیر گوشت کھاتا ھے، گھاس نہیں کھاتا ۔ بطخ کے بچے انڈوں سے نکلتے ھی پانی کی طرف لپکتے ھیں ۔ مرغی کے بچوں کو پانی کی طرف گھیر کر بھی لے جائیں تو وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے ۔ حیوانات پر یه پابندیاں از خود عائید ھوتی

ہیں اور وہ انہیں توڑنے کا اختیار ہی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس، انسانی بچے کو دیکھئے۔ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی طرح بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح شاخِ نبات (مصری کی ڈلی) کو۔ وہ کبھی دھکتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے اور کبھی پانی میں ڈبکیاں لگاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس پر فطرت کی طرف سے از خود ایسی پابندیاں نہیں عاید ہوتیں جیسی حیوانات پر عاید ہوتیں ہیں۔ لیکن چونکہ پابندیوں کے بغیر زندگی دوبھر ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن بھی ہو جاتی ہے اس لئے انسان پر بھی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں یا تو معاشرہ کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں اور یا مذہب کی طرف سے۔ (مذہب کے بجائے وحی کا لفظ زیادہ موزوں ہے اس لئے آئندہ صفحات میں اسے وحی ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ وحی سے مراد ہے ایسی پابندیاں جو انسانی معاشرہ کی طرف سے عائید کردہ نہ ہوں بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوں)۔

معاشرتی پابندیاں

معاشرہ کی طرف سے عائید کردہ پابندیوں اور وحی کی رو سے متعین کردہ پابندیوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی پابندیاں بعض مصالح کی بناء پر بدلی بھی جا سکتی ہیں، لیکن وحی کی رو سے عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً معاشرہ کسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ لوگوں کو سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہئے۔ اس فیصلہ کی رو سے (Keep to the left) سڑک کا قانون قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وقت معاشرہ اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس قانون کو بدل کر ”دائیں طرف چلو“ کا قانون بھی نافذ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جب وحی خداوندی نے کہا ہے کہ (مثلاً) لحمِ خنزیر حرام ہے تو کوئی انسان اس قانون میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ وحیٔ خداوندی کے ماننے والوں کو لحمِ خنزیر سے اسی طرح پرہیز کرنا ہوگا جس طرح بکری گوشت سے پرہیز کرتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بکری ایسا اپنی مرضی سے نہیں کرتی، لیکن انسانوں کو ایسا اپنے اختیار و ارادہ سے کرنا ہوگا۔

کھانے پینے کے علاوہ، جنسی جذبہ کی تسکین کے سلسلہ میں بھی

جنسی جذبہ پر پابندیاں

حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عاید ھوتا ھے۔ ایک بیل ھر روز گایوں کے گلے میں پھرتا رھتا ھے لیکن کبھی جنسی اختلاط نہیں کرتا، تاوقتیکہ اسے گائے کی طرف سے استقرارِ حمل کا طبعی تقاضا اس کی دعوت نہ دے۔ لیکن انسان پر اس قسم کا کوئی کنٹرول نہیں عائید کیا گیا۔ وہ جب جی چاھے، اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کرسکتا ھے۔

حیوانات پر اس طبعی کنٹرول کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ھے) کسی قسم کا اخلاقی کنٹرول عاید نہیں کیا گیا (حیوانات کی صورت میں اخلاقیات کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا)۔ لیکن انسان پر اس ضمن میں اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ھیں۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے) یہ پابندیاں معاشرہ کی طرف سے بھی عاید کی جاتی ھے اور وحی کی رو سے بھی۔ معاشرتی پابندیوں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ پابندیاں مختلف اقوام و ممالک میں مختلف نوعیتوں کی ھیں۔ نیز، کسی ایک ھی قوم میں، مختلف زمانوں میں، ان پابندیوں میں رد وبدل ھوتا رھتا ھے۔ مثلاً انگلستان میں اگر ایک بالغ لڑکا اور لڑکی، باھمی رضامندی سے (شادی کے بغیر) جنسی اختلاط کی صورت پیدا کرلیں تو معاشرہ کی نگاھوں میں یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ نہ ھی ایسا کرنا قانوناً جرم ھے۔ اسی طرح اگر ایک شادی شدہ مرد یا عورت کسی اور سے جنسی تعلق پیدا کرلے تو یہ کوئی معاشرتی جرم نہیں۔ یہ اسی صورت میں جرم قرار پائے گا جب میاں یا بیوی کو اس پر اعتراض ھو۔ ان پابندیوں میں رد و بدل بھی ھوتا رھتا ھے۔ مثلاً اس وقت تک وھاں یہ صورت ھے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ لڑکی کے ھاں بچہ پیدا ھو جائے اور بچے کا باپ اس لڑکی سے شادی نہ کرے تو وہ بچہ حرامی قرار پاتا اور سوسائٹی میں ذلّت کی نگاھوں سے دیکھا جاتا ھے۔ لیکن پچھلے دنوں وھاں ایک تحقیقاتی کمیٹی نے سفارش کی ھے کہ ایسے تعلقات کو جائز سمجھا جائے، ان سے پیدا شدہ بچوں کو معاشرہ کا صحیح جزو قرار دیا جائے اور انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ وقس علیٰ ھذا۔ (اس وقت ان فیصلوں پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں۔

مقصود صرف یہ بتانا ھے کہ اگر معاشرہ چاھے تو اپنی عائد کردہ پابندیوں میں تبدیلی بھی کر سکتا ھے۔

وحی کی پابندیاں

اس کے برعکس، اس باب میں وحی (یعنی قرآن کریم) نے بھی کچھ پابندیاں عاید کی ھیں۔ ان پابندیوں کا ماحصل یہ ھے کہ معروف طریقہ پر شادی کے بغیر کسی لڑکے یا لڑکی (مرد یا عورت) کو جنسی اختلاط کی قطعاً اجازت نہیں۔ اور شادی کے بعد، نہ بیوی کسی غیر مرد سے اختلاط پیدا کر سکتی ھے، نہ میاں کسی اور عورت سے۔ اس قسم کا اختلاط، فرد کا نہیں بلکہ، معاشرہ کا جرم ھے۔ اس (جرمِ زنا) کی سزا معاشرہ کی طرف سے دی جاتی ھے۔ اور ان پابندیوں میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا جا سکتا۔

مغرب کی جنسی بے باکیوں سے متاثر ھو کر، ھمارے ھاں کے نواجون طبقہ میں بھی یہ خیال عام ھو رھا ھے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ایک طبعی تقاضے کی تسکین یا افزائشِ نسل کے لئے ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ھے اور بس۔ اس معاملہ کو لڑکی اور لڑکے کی باھمی رضامندی پر چھوڑ دینا چاھئے۔ اور نکاح وغیرہ کی پابندی، محض قانونی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ھونی چاھئے، نہ کہ بالغ مرد اور عورت کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے۔ ان خیالات کا نتیجہ یہ ھے کہ ھمارے ھاں بھی (مغرب کی طرح) جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) کی فضا عام ھوتی جا رھی ھے اور وحی کی طرف سے عائید کردہ پابندیوں [یعنی عفت و عصمت (Chastity) کے مطالبہ] کو غیر فطری جکڑبندیاں قرار دیا جا رھا ھے۔

ان پابندیوں کی مصلحت

سوال یہ ھے کہ کیا وحی کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں محض معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے ھیں یا ان کا تعلق عالمِ انسانیت کے اجتماعی مصالح سے ھے؟ اگر ان کا مقصد محض معاشرتی نظم وضبط ھے تو بے شک معاشرہ کو اس کا حق

ہونا چاہئے کہ وہ (اپنے مصالح کے پیش نظر) ان میں رد و بدل کرسکے۔ لیکن اگر ان کا تعلق انسانیت کے کسی بنیادی مسئلہ سے ہے تو پھر کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ، اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے، ان پابندیوں میں تبدیلی کرکے، انسانیت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچائے۔ قرآن نے جب زنا کو معاشرہ کا جرم قرار دیا ہے تو اس سے مطلب یہی ہے کہ اس کے نزدیک جنسی تعلق محض ایک انفرادی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر اجتماعی انسانیت پر پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب اس نے کہا کہ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ .... هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (۲۳/۵) تو اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ عفت و عصمت کا، قوموں کی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ جو قوم عصمت کی حفاظت نہیں کرتی وہ زندگی کے میدان میں فائز المرام (Prosperous) نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت کیا ہے؟ جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے ان تمام دعاوی کو سچا مانتے ہیں۔ لیکن سوال ان لوگوں کا نہیں۔ سوال تو ان کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دعوے کو بطور ایمان (Faith) ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اس کے ثبوت میں علمی تائید اور شہادت چاہتے ہیں۔ ان لوگوں (بالخصوص ہمارے نوجوان طبقہ) کا یہ مطالبہ ایسا نہیں جسے ہم لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیں اور انہیں ملحد و بے دین کہہ کر تیوریاں چڑھا لیں۔ قرآن اپنے ہر دعوے کی بنیاد علم و بصیرت پر رکھتا ہے اور اسے دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی، قرآنی حقائق کھل کر سامنے آتے چلے جائیں گے سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاآنکہ یہ چیز نکھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ لہذا دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جنسی تعلقات کے متعلق جس قدر تحقیقات ہمارے زمانے میں ہو چکی ہیں وہ

قرآنی دعوے کی دلیل

قرآن کے دعوےٰ کی کس حد تک تائید کرتی ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور وقت کا نازک ترین مسئلہ۔ اس لئے اس قابل کہ اس پر بڑی توجہ اور گہری فکر سے غور و غوض کیا جائے۔

غو و فکر

علمائے مغرب کی تحقیقات

جنسیات کے متعلق ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں ہوئی اس لئے اس کے نتائج کو سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو! حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو اور تقلید کہن زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو، ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں۔ لہذا ہمیں اس مقصد کے لئے بھی مغرب کے محققین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔ یورپ میں (دیگر شعبوں کی طرح) جنسیات نے بھی ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے لئے وہاں تحقیقاتی ادارے قائم ہیں۔ علمائے عمرانیات (Sociologists)، تہذیب کے مورخ، علمائے جنسیات اور ماہرین علم تجزیۂ نفس (Psycho-Analysts) وغیرہ ہم نے اس موضوع پر کافی چھان بین کی ہے، اور جنسیات سے متعلق لٹریچر خاصی مقدار میں شائع ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی تحقیقات کا بالعموم انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے قدیم باشندوں (Primitive Tribes) کے احوال و کوائف، بود و ماند، رسوم و معاشرت اور اجتماعی اعمال و معتقدات کا مطالعہ کرتے اور اس طرح حاصل کردہ مسالہ (Data) سے نتائج مستنبط کرتے ہیں*۔ اس مقصد کے لئے انہیں جن صبر آزما اور مشقت طلب مراحل سے گزرنا پڑتا

---

* واضح رہے کہ ان کا انداز، اس طریق سے مختلف ہے جو آجکل (بالخصوص) امریکہ میں رائج ہے اور جسکی رو سے ایک خاص خطہ یا طبقہ کے لوگوں کو سوالنامہ دیدیا جاتا ہے اور ان کے جوابات سے اعداد و شمار (Statistics) مہیا کرکے نتائج اخذ کر لئے جاتے ہیں اور ان نتائج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عالمگیر اور فطرت انسانی کے ترجمان ہیں۔ آجکل امریکہ میں (Kinsley) کی قسم کے ''محقق'' اسی انداز سے جنسیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ طریق کار کبھی عالمگیر (Universal) نتائج بہم نہیں پہنچا سکتا۔

ڈاکٹر اَنوِن

ھے اس کا ھم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ھیں جنھوں نے اپنی ساری عمر افریقہ کے صحراؤں، جنوبی امریکہ کے جنگلوں، قطبین کے برفانی میدانوں اور ھمالیه کے پہاڑوں میں گزار دی۔ وہ وھاں کے وحشی قبائل میں جا کر رھے۔ انھی کی معاشرت اختیار کی۔ وھی کچھ کھایا جو وہ کھاتے پھے۔ وھی کچھ پہنا جو وہ پہنتے تھے۔ انھیں کے ساتھ کبھی درختوں کے کھو کھلے تنوں میں، کبھی ان کی شاخوں کے اوپر۔ کبھی پہاڑوں کے غاروں میں اور کبھی درندوں کے بھٹوں میں زندگی بسر کی۔ بعض اوقات انھی میں شادیاں بھی کیں اور اس طرح انھی میں گھل مل کر ان کی معاشرت اور معتقدات کا دِقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور یوں ان کے متعلق براہِ راست معلومات بہم پہنچائیں۔ ان محققین نے دنیا کے قبائل کی معاشرت اور معتقدات کے مطالعه کے بعد جن موضوعات کے متعلق اصول متعین کئے ھیں ان میں جنسیات کو ایک خاص اھمیت حاصل ھے۔ ان کے مرتب کردہ نتائج ھمیں اس حقیقت تک پہنچاتے ھیں کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا معاملہ محض شہوانی جذبہ کی تسکین تک محدود نہیں ھوتا۔ اس کا اثر بڑا دور رس ھوتا ھے۔ ان کی تحقیق یہ ھے کہ کسی قوم کے تمدن (Culture) کا اس سوال سے بڑا گہرا تعلق ھے کہ اس قوم نے جنسی تعلقات کو آزاد چھوڑ رکھا تھا یا اس پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ اور اگر پابندیاں لگا رکھی تھیں تو وہ کس نوعیت کی تھیں۔ انھی محققین میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر (J. D. Unwin) کا نام خاص شہرت کا حامل ھے۔ ڈاکٹر انون نے دنیا کے مختلف حصّوں میں بسنے والے اسّی غیر مہذب (قدیمی) قبائل کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا ھے کہ انسانی زندگی میں جنسیات اور کلچر کا کیا تعلق ھے؟ اگر ان میں ایک قبیلہ جنوبی امریکہ کا ھے، تو دوسرا قطب شمالی کا۔ ایک آسٹریلیا کا ھے، تو دوسرا صحرائے افریقہ کا۔ اس کے بعد اس محقق نے سولہ مہذب اقوام کی معاشرت کا مطالعہ کیا ھے اور اپنے نتائجِ تحقیقات کو اپنی گراں بہا کتاب (Sex And Culture) میں پیش کیا گیا ھے۔ اس کتاب کا پہلا فقرہ یہ ھے:-

> دنیا کی مہذب اقوام ھوں یا غیر مہذب قبائل - سب کے ھاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ھے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے - میری اس تحقیق کا ماحصل، اور اس سے مستنبط کردہ نتائج اس کتاب میں پیش کئے گئے ھیں -

اصل کتاب سے پہلے، دیباچہ میں لکھا ھے کہ

> اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ھوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ھے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ھو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ھے - ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بناء پر حاصل ھوتی ھے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ھوں - (XIV)

اسی کلیہ کو اس نے اصل کتاب میں ان الفاظ میں بیان کیا ھے -

> کوئی گروہ کیسے ھی جغرافیائی ماحول میں رھتا ھو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ھے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے - (ص ۳۴۰)

آپ نے غور کیا کہ یہ محقق اپنی تحقیقات کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ھے؟ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ھے کہ جنسی تعلقات محض ایک حیوانی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دارومدار اسی جذبہ کی تحدید و تادیب پر ھے - حتٰی کہ ڈاکٹر انون یہ بھی لکھتا ھے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ھوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ھوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا - (۲۰۳)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں (ص ۳۳۰)۔

اس لئے اگر کسی قوم میں تمدنی تبدیلی واقع ہو۔ یعنی اسے دنیا میں عروج حاصل ہو یا اس پر زوال آجائے، تو اس عروج و زوال کے اسباب کے لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ اس قوم نے سو سال پہلے اپنے ہاں جنسی تعلقات کے ضوابط میں کس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔ جیسی وہ تبدیلیاں ہونگی اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے۔

سب سے پہلے تجرد کی زندگی (Celibacy) کو لو، جسے عیسائیت (اور اس سے متاثر شدہ مسلکِ خانقاہیت) روحانی ارتقاء کے لئے اولین شرط قرار دیتی ہے۔

جبری تجرد

اسکے متعلق ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> جبری تجرد (Compulsory Celibacy) کے اثرات انسانی تمدن پر ہلاکت انگیز ہوتے ہیں (ص ۸۴)۔

جبری تجرد سے مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز انسانی عقائد یا معاشرتی ضوابط میں شامل کر دی جائے کہ تجرد کی زندگی وجہٴ شرف و تقدس ہے اور اس طرح لوگوں کو ذہنی طور پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں (Nuns) اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

عیسائیت یا مسلکِ خانقاہیت میں جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تجرد کی زندگی ہی شرفِ انسانیت کی زندگی ہے، تو دوسری طرف آجکل عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر جنسی جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں کسی قسم کی بھی پابندی عائد کی جائے تو اس سے انسان کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اس سے خطرناک قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال یکسر غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عاید کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ xii)

اس تمہید کے بعد آگے چلو۔ ڈاکٹر آنون نے قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ سب سے نچلے درجے کا نام (Zoistic) رکھتا

تین گروہ

ہے۔ اس سے اوپر (Manistic) کا درجہ ہے، اور سب سے اوپر (Deistic) کا درجہ۔ اس کے بعد وہ اسّی (۸۰) قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچتا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) جس گروہ نے کنوار پن (Pre-Nuptial) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

(۲) جن قبائل میں، زمانۂ قبل از نکاح میں، جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجہ پر تھے اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت (Chastity) کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے (۳۰۰-۳۲۵)

اس کے بعد ڈاکٹر انون، شادی کے بعد کے جنسی ضوابط سے بحث کرتا ہے۔ لیکن اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے وہ اس حقیقت پر پھر زور دیتا ہے کہ

> شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔ (۳۴۳)

اس مقصد کے لئے وہ شادی کو چار بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی

(۱) عورت اپنی ساری زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی میں ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے۔

اس کا نام، اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (Absolute Monogamy) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لئے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو۔ اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (Modified Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اُسکے نزدیک مطلق تعدد ازواج (Absolute Polygamy) ہے۔ اور

(۴) اگر مرد، دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے) تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعدد ازواج (Modified Polygamy) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

> آج تک کوئی قوم شق (۱) کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی (۳۴۴)

اس لئے کہ یہ شکل اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب معاشرہ میں عورت کی کوئی حیثیت تسلیم نہ کی جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہمیشہ اپنے خاوند کی مطیع وفرمانبردار لونڈی بن کر رہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا رد عمل ایسا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (۳۴۵)

بہترین تمدن کی حامل قوم

اس کے بعد ڈاکٹر انون نے کہا ہے کہ تاریخ اس وقت تک جن اقوام وقبائل کے حالات محفوظ رکھ سکی ہے ان میں سب سے بہتر تمدن کی حامل وہ قوم تھی جو شادی سے قبل جنسی اختلاط کی مطلقاً اجازت نہیں دیتی تھی اور شادی کے بعد شق (۲) کی ترمیم شدہ وحدتِ زوج کی پابند تھی۔ یعنی جن کا عام اصول یہ تھا کہ شادی کے بعد بھی جنسی تعلق صرف میاں بیوی میں رہے۔ رشتۂ نکاح محکم و استوار ہو، لیکن نا قابلِ تنسیخ نہ ہو۔ بلکہ بعض حالات کے ماتحت منقطع بھی ہوسکتا ہو۔ یہ بعینہٖ وہ شکل ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنسی تعلقات پر اس قسم کی قیود و حدود عاید کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق ڈاکٹر انون نے، مختلف ماہرینِ علوم کی شہادات سے اہم نتائج مستنبط کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

> جنسی تعلقات کی حد بندی سے ایک قسم کا ذہنی اور عصبی تناؤ (Tension) پیدا ہوتا ہے جس سے جذباتی توانائی میں ارتکاز (Compression) پیدا ہو جاتا ہے۔ (۳۱۳)

یہ مرتکز شدہ معاشرتی توانائی اپنی نمود کے مختلف راستے تلاش کرتی ہے۔ اس نفسیاتی عمل کو، ڈاکٹر فرائڈ کی اصطلاح میں کظامت (Sublimation) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ

> نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (۳۱۷)

بہتر ہو کہ اس موقعہ پر خود فرائڈ کے الفاظ ہمارے سامنے آجائیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

فرائڈ کی تحقیق

> ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ لوگوں نے اپنے قدیم

> جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ھے اور یہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رھی ھے، کیونکہ ھر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رھتا ھے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اھمیت حاصل ھے۔ (جب ان کی بے باکانہ تسکین ھی مقصدِ زندگی نہ بن جائے تو) یہ اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتے ھیں (جسے Sublimation کہتے ھیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی، جنسی گوشوں کی طرف سے ھٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ھو جاتی ھے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ھوتے ھیں۔

تم نے دیکھ لیا کہ، فرائڈ کی تحقیق کے مطابق، اگر جنسی توانائیوں کو بے محل ضائع نہ کیا جائے تو یہ انسانی تہذیب و تمدن کے قصرِ حسین کی تعمیر میں کس قدر ممد و معاون بن جاتی ھیں*۔

فرائڈ نے اس طریق عمل کا نام (Sublimation) رکھا ھے۔ یہ علم تجزیۂ نفس (Psycho-Analysis) کی ایک اھم اصطلاح ھے اور دورِ حاضر کی ایک گراں قدر نفسیاتی تحقیق۔ لیکن آپ یہ سنکر حیران ھونگے کہ انسانی ذھن نے جہاں اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا ھے، قرآن نے چھٹی صدی عیسوی میں (جسے عام طور پر ازمنۂ مظلمہ (Dark-Ages) کہا جاتا ھے) کس طرح اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سورہ آلِ عمران میں مومنین کی ایک صفت ''الکاظمین الغیظ،، بتائی گئی ھے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس لفظ

قرآنی کظامت

---

* اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ھے کہ فرائڈ نے جنسیات کے متعلق اپنی تحقیق اور فکر میں جسقدر ٹھوکریں کھائی ھیں اور ان کے جو نقصان رساں نتائج مغربی معاشرہ میں نمودار ھو رھے ھیں وہ میری نگاھوں کے سامنے ھیں۔ لیکن میں اسوقت صرف فرائڈ کے اس خیال سے بحث کر رھا ھوں کہ جنسی توانائی کو اگر بے باک نہ ھونے دیا جائے تو یہ اپنا رخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ لیتی ھے یہ ایک ایسی حقیقت ھے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کے بنیادی معنی کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں پانی کی اکثر قلت رہتی ہے۔ وہ کرتے یہ تھے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کنوئیں کھودتے۔ ان میں کسی میں کم پانی نکلتا کسی میں زیادہ۔ پھر وہ ان کنوؤں کو آبدوز نالیوں (Subterranean Channels) کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیتے۔ اس طرح جس کنوئیں میں پانی زیادہ ہوتا اس کا فالتو پانی دوسرے کنوئیں کی طرف منتقل ہو جاتا اور یوں تمام کنوؤں میں پانی کی تقسیم یکساں ہو جاتی۔ اس طریق عمل کو ان کے ہاں کظامَت کہا جاتا تھا۔ لہذا کاظمینَ الغیظ کے معنی ہوئے وہ لوگ جو اپنی اس حرارت اور توانائی کو جو غصّے کی شکل میں باہر نکلنا چاہتی ہے، کسی دوسری طرف منتقل کرکے اس سے تعمیری نتائج کا کام لیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصر حاضر کے ماہرین تجزیۂ نفس نے (Sublimation) سے تعبیر کیا ہے۔

اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ ڈاکٹر انون نے بتایا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل اور محاسبۂ خویش کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برعکس

> جو قوم اپنے مرد اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلاقیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی باقی نہ رہی۔ (۳۹۸)

اضمحلال

قرآن کریم نے ایک جگہ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَا یَزْنُوْنَ وہ زنا کے قریب تک نہیں جاتے۔ اس لئے کہ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذَالِکَ یَلْقَ اَثَاماً (۲۵/۶۸) جو قوم ایسا کرتی ہے اسے اثمؔ سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ عربی زبان میں 'اثیمَۃ' اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو تھک کر مضمحل ہو جائے اور اس میں اتنی توانائی نہ رہے کہ وہ باقی

قطار کے ساتھ چل سکے۔ اس لئے وہ ان سے پیچھے رہ جائے۔ تم غور کرو کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ کے اندر اس تمام حقیقت کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس تک دور حاضر کی تحقیق اس قدر تجربات کے بعد پہنچی ہے۔ یعنی یہ کہ جنسی جذبات کو آزادانہ چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مضمحل ہو جاتی ہے اور زندہ اقوام کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس میں وہ معاشرتی توانائیاں نہیں رہتیں جو قوموں کو تمدنی بلندیاں عطا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انون نے یہ بھی کہا ہے کہ

> مردوں کی عصمت اسی صورت میں معاشرتی توانائی پیدا کر سکتی ہے جب عورتیں با عصمت ہوں اور ان کی عصمت، شادی سے قبل اور بعد دونوں زمانوں میں محفوظ رہے۔ (۳۲۳)

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآن مردوں اور عورتوں دونوں کی عصمت پر یکساں زور دیتا ہے۔ وہ اَلۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ (وہ مرد جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوں) کے ساتھ والۡحٰفِظٰتِ ($\frac{۳۳}{۳۵}$) بھی کہتا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے دامنِ عفت کو داغدار نہ ہونے دیں۔ اور جرم زنا کی سزا بھی مرد و عورت دونوں کے لئے یکساں تجویز کرتا ہے ($\frac{۲۴}{۲}$)

قرآنی حد بندی

قرآن کی رو سے جنسی اختلاط کی صرف ایک ہی صورت جائز ہے۔ یعنی نکاح۔ لہذا قبل از نکاح جنسی اختلاط اور نکاح کے بعد عورت کا کسی دوسرے مرد سے، یا مرد کا کسی دوسری عورت سے، جنسی اختلاط (خواہ وہ تراضیٔ مابین ہی سے کیوں نہ ہو) زنا ہے۔ نکاح کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ''ہنگامی جنسی اختلاط کی رضامندی،، نہیں ہوتی، بلکہ معاہدہ ہوتا ہے اس امر کا کہ ہم (میاں بیوی) ان تمام قیود و حدود اور حقوق و فرائض کے مطابق جو ہم پر قرآن نے عائد کی ہیں مستقل رفاقت کی زندگی بسر کریں گے۔ اسی سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر انون نے اپنے ہاں زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا (اسے اس لفظ کے استعمال کی ضرورت بھی

وحدت ازدواج

نہیں تھی۔ اس لئے کہ وہ مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں کر رہا بلکہ جنسی مسئلہ کے متعلق علمی اور نظری تحقیق کررہا ہے۔ لہذا اس کا انداز سائنٹیفک ہونا چاہئیے تھا) اس نے اپنے ہاں جنسی اختلاط کے مواقع (Sexual Opportunities) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ جس قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوں گے وہ قوم تمدنی سطح میں بہت پست ہوگی اور جس میں یہ مواقع کم از کم حد تک رکھے جائیں گے، وہ تمدنی سطح کی بلندیوں تک پہنچ جائے گی۔ قرآن نے صرف زنا ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ جنسی اختلاط کے مواقع کو کم سے کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ اس میں قبل از نکاح ' جنسی اختلاط کے مواقع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ زنا ہے۔ نکاح کا معاہدہ، اس کے نزدیک عمر بھر کی رفاقت (Life - Long Companionship) کا معاہدہ ہے۔ لہذا اس میں وقتی جنسی اختلاط کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا، خواہ وہ باہمی رضامندی ہی سے کیوں نہ ہو۔ پھر اس نے نکاح کو میثاقاً غلیظا (پختہ عہد) کہا ہے۔ بچوں کا کھیل نہیں کہا ہے کہ جب جی چاہا کھیل کھیل لیا اور جب طبیعت اکتا گئی تو اس مٹی کے گھروندے کو پامال کر دیا اور دوسرے وقت پھر نیا گھر بنا لیا۔ علاوہ بریں اس نے وحدت زوج (Monogamy) کو بطور اساسی اصول مقرر کیا ہے اور تعدد ازواج کو، محض ایک ہنگامی تمدنی مشکل کے حل کے لئے، بطور عارضی علاج جائز قرار دیا ہے (اس کی بھی محض اجازت ہے۔ حکم نہیں)۔ شادی کی یہ (قریب قریب) وہی شکل ہے جسے انون نے مطلق وحدت زوج (Absolute Monogamy) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ میں نے ''قریب قریب،، اس لئے کہا ہے کہ ڈاکٹر انون کے نزدیک ''مطلق وحدتِ زوج'' میں شادی صرف اسی صورت میں منقطع ہو سکتی ہے جب عورت جنسی (اخلاقی) جرم کی مرتکب ہو جائے۔ لیکن قرآن نے نباہ نہ ہو سکنے کو بھی فسخ معاہدہ (طلاق) کی معقول اور جائز وجہ قرار دیا ہے۔ بہرحال، یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیا ہے۔ وہ زمانہ قبل از نکاح میں جنسی اختلاط کے کسی ایک موقع کو بھی جائز قرار نہیں دیتا۔ اور نکاح کے بعد عام حالات میں

صرف ایک جوڑے کو باہمد گر وابستہ رکھتا ہے۔ تنوع (Change) کی خاطر تنوع (Change) کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن نے تو نکاح کی صورت میں بھی محصنین کے ساتھ غیر مسافحین ($\frac{۴}{۲۴}$) کا اضافہ کیا ہے۔ حصن کے معنی ہیں محفوظ رکھنا اور سفح کے معنی ہیں پانی وغیرہ کا بہا دینا۔ لہذا جہاں اس حکم میں زنا سے ممانعت مقصود ہے وہاں اس سے یہ بھی متصور ہے کہ نکاح کا مقصد بھی شہوت رانی نہیں۔ اس سے نکاح کی تمام ذمہ داریوں کی حفاظت اور بقائے نسل کا تحفظ مقصود ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف وہی قوم زندگی کی کامرانیوں سے بہرہ یاب (مفلح) ہو سکتی ہے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک لے جائے۔ اور یہ کم از کم مواقع بھی صرف معروف (Recognised) طریق سے مہیا کئے جائیں۔ ڈاکٹر انون کی تحقیق یہ ہے کہ

> ’انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت ”مطلق وحدت زوج “ کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقدِ نکاح، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو۔ اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا، تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس پر شاہد ہے کہ جن اقوام نے ایسی معاشرتی رسوم اختیار کرلی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب قریب پہنچ گئی ہوں (اس لئے کہ اس وقت تک

> زندگی بھر کی جبری رفاقت تک کوئی قوم بھی نہیں پہنچ سکی۔ اور جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔ (صفحہ ۸۴)

آپ نے دیکھا کہ زمانے کی علمی شہادتیں کس طرح قرآنی حقائق کی تائید کرتی چلی جا رہی ہیں اور دنیا کس طرح (غیر شعوری طور پر خود بخود) قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے!

عربوں کی تاریخ

ڈاکٹر انون نے اپنی تحقیق کے دوران میں ضمناً مسلمانوں (عربوں) کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں بتاتا ہے کہ قدیم عرب، قبل از نکاح عصمت و بکارت پر زور نہیں دیا کرتے تھے۔ بعد میں (اسلام کی تعلیم کے ماتحت) انہوں نے اس عصمت پر شدت سے زور دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے محدود ملک سے نکل کر گرد و نواح کی دنیا پر پھیل گئے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اپنے حرم میں عورتوں کی بھرمار شروع کردی تو ان کی فتوحات کی وسعتیں رک گئیں (صفحہ ۴۲۹)۔ اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ایک اور تاریخی عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کی لڑکیوں سے شادی کی اجازت کیوں دی تھی۔ ڈاکٹر انون کے اس اصول کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ کسی قوم کی تمدنی تعمیر میں عورت کی محفوظ توانائی کا بہت بڑا اثر ہے، بلکہ مردوں کی توانائی بھی اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب ان کی عورتیں با عصمت ہوں۔ ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ جب عربوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر میں جاکر رک گیا تو انہوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ ان لڑکیوں کی تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں جنسی ضبط پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی مرتکز توانائیاں عربوں کی مزید وسعتوں

اور تمدنی بلندیوں کا باعث بن گئیں - یہی کچھ مصر میں ہؤا اور یہی کچھ اسپین میں (صفحہ ۴۲۹)- کسی کو ڈاکٹر انون کی تحقیق کے اس نتیجے سے اختلاف ہو یا اتفاق، لیکن یہ حقیقت بہر کیف اپنی جگہ پر غیر متنازعہ رہ جاتی ہے کہ اس محقق کے نزدیک، کسی قوم کی فتوحات کی وسعتوں اور تہذیب کی بلندیوں پر اس کی عورتوں کی عصمت و ضبط کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے- اور یہی حقیقت قرآن نے بیان کی ہے جب اس نے زندگی کی کامرانیوں کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کے "محصن" (قلعہ بند) ہونے کو بنیادی شرط قرار دیا ہے - مرد اور عورت دونوں کا محصن ہونا جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم درجے تک لے آتا ہے (یعنی زمانہ قبل از نکاح میں مطلق عصمت - نکاح میں وحدت زوج (Monogamy) بطور اساسی اصول - اور نکاح کے بعد، میاں اور بیوی کا کسی غیر عورت اور مرد کے ساتھ اختلاط ناجائز)- لیکن جب کسی قوم میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہو جائیں (جس کی شکل صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس ہنگامی ضرورت کے بغیر جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے، بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں - طلاق کی رخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ تبدیلیٔ ازواج* - اور قرآن کے کھلے کھلے حکم کے خلاف لونڈیوں کی بھرمار سے سینکڑوں عورتوں سے اختلاط، یہ سب جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے کی شکلیں ہیں) تو پھر اس قوم میں نہ تو آگے بڑھنے کی توانائیاں رہ جاتی ہیں، اور نہ ہی اپنے تمدن کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کی صلاحیتیں - اس قسم کی قوم زندگی کی کس سطح پر پہنچ جاتی ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر انون لکھتا ہے کہ

جنسیات میں الجھی ہوئی قوم کی حالت

---

* رابرٹ برفا Briffault نے جنسیات کے متعلق ایک بڑی وقیع اور ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے The Mother - اسمیں وہ ایک کرد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے عمر بھر بیک وقت ایک ہی بیوی رکھی لیکن وہ (غالباً) چالیس کے قریب بیویاں بدل چکا تھا - یہ جنسی اختلاط کے متنوع مواقع کی ایک مثال ہے - اس سے اور مثالوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے -

اس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی*۔ وہ واقعات کے اسباب و علل (Causes) کیمتعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں)۔ ...... وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ...... اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیرالعقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے (اسکے بعد ڈاکٹر انون نے ان توہم پرستیوں کی تفصیل بتائی ہے جو نذر نیاز۔ گنڈہ تعویذ۔ اکابر پرستی اور قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ) اس قسم کے معتقدات، اس قوم میں نسلاً بعد نسل متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا

---

* دیکھئے یہ الفاظ کس طرح ترجمہ ہیں قرآن کی اس آیت کا کہ لھم قلوب لا یفقھون بہا ان کے پاس سمجھنے کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

> جاتا ہے تو نسیاً منسیا ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے، بالکل حیوان ہوتے ہیں*۔ (صفحہ ۳۴۶-۳۴۵)

تم نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آرہی اور کیا آج بھی ساری دنیا میں ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھا گئی تھی۔ اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کر دیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا جسے قرآن روکنے کے لئے آیا تھا تو ان کی ساری توانائیاں ضائع ہو گئیں۔ پھر ان میں نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی۔ اور یہی حالت اس وقت تک چلی جارہی ہے۔ ان کے ممالک میں لونڈیاں آج تک سر بازار بکتی ہیں۔

ہمارا نوجوان طبقہ

یہ تو ہے ہمارے اس طبقہ کی حالت جسے قدامت پرست کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوانوں کا طبقہ ہے جنہوں نے مغرب کی دیکھا دیکھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جنسی تعلقات پر پابندیاں عائد کرنا، انفرادی آزادی کو مقید کرنا ہے۔ اس لئے "ازمنۂ مظلمہ" کے ان اغلال و سلاسل کو جتنی جلدی توڑ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عملاً اسے توڑنا بھی شروع کر دیا ہے۔ ان آزادیوں سے وہ سوسائٹی متشکل ہوتی ہے جس کے متعلق انون لکھتا ہے کہ

> اس میں ہر لڑکی کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا جنسی کھیل کھیلنا چاہے کھیلتی پھرے

---

* یہ بھی قرآن ہی کی ایک آیت کا ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ سامان زیست سے اسی طرح فائدہ حاصل کرتے اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان۔

> اور جس نوجوان سے چاھے جنسی اختلاط قائم کرے۔ اس کے لئے فقط ان دونوں کی رضامندی کی شرط ھے۔ نہ لڑکی پر کسی قسم کی پابندی عائد ھوتی ھے نہ لڑکے پر...... بچپن ھی سے وہ ھر ایسا جنسی کھیل کھیلنے لگ جاتے ھیں جس میں انھیں لذت ملتی ھو...... مختصراً یہ کہ وہ ایسی فضا میں رھتے ھیں جس میں جنسی حدود و قیود کا کوئی واسطہ نہیں ھوتا اور جس میں ان کی حالت یہ ھوتی ھے کہ جونہی جنسی خواھش ھوئی، اسے اسی وقت کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا۔ (۳۴۸)

اس کا نتیجہ

یہی ھیں وہ جنسی آزادیاں جن کا متمنی ھمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ھوتا جا رھا ھے۔ لیکن اِن آزادیوں کا نتیجہ کیا ھوتا ھے اسے خود ڈاکٹر انون کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ کہتا ھے کہ

> لوگ چاھتے یہ ھیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ھٹا دیا جائے اور قوم، زندگی کی ان خوشگواریوں سے بھی متمتع ھوتی رھے جو ایک بلند تمدن کا ثمرہ ھوتی ھیں۔ لیکن انسانی ھیئت تو کچھ اس قسم کی واقع ھوئی ھے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا جمع نہیں ھو سکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نقیض ھیں۔ جو ریفارمر ان میں مفاھمت (Compromise) کی کوشش کرتا ھے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ھے جو چاھتا ھے کہ وہ اپنے کیک کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔ کوئی انسانی معاشرہ ھو، اسے ان دوراھوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ھوگی۔ یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی راہ جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ھیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ھے کہ جو قوم ان دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرتی ھے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی۔ (۴۱۲)

بنابریں ۔

> کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم ازکم حد تک محدود کر دیں ۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی (۴۱۴)

پس چہ باید کرد

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کس طرح کی جائے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو کم ازکم حد تک لے جایا جائے ۔ اور پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ جنسی مواقع کی یہ شکل مستقل طور پر قائم رہ سکے تاکہ اس طرح وہ قوم انسانیت کی صلاحیت بخش توانائیوں کی حامل بنتی چلی جائے ۔ ڈاکٹر انون نے اپنی کتاب کا خاتمہ اسی سوال (اور اس کے جواب) پر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ

> تاریخ کے صفات پر کوئی سوسائٹی ایسی نظر نہیں آتی جو اس کوشش میں کامیاب ہو گئی ہو کہ وہ جنسی اختلاط کے مواقع کو ایک مدت مدید تک، کم ازکم حد تک محدود رکھ سکی ہو ۔ میں تاریخی شواہد سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی قوم نے ایسی صورت پیدا کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا کرے ۔ (۳۲ - ۴۳۱)

تم نے غور کیا کہ اس محقق کی تحقیق کے مطابق اس قسم کے معاشرہ کی تشکیل کی بنیادی شرط کیا ہے؟ یہ کہ اس میں مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجہ عطا ہو!

مرد اور عورت کی مساوی حیثیت

آج اس معاشرہ میں جس میں ہم صدیوں سے چلے آرہے ہیں، یہ کہنا کہ اسلام

نے مرد اور عورت کو قانوناً مساوی درجه عطا کیا تھا، شاید اپنی هنسی اڑانے کے مترادف هو گا۔ لیکن اس حقیقت کو کون چھپا سکتا هے که قرآن نے یه اعلان آج سے ڈیڑھ هزار سال پہلے کیا تھا که وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸)۔ قاعدے اور قانون کی رو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے هی هیں جتنے ان کے فرائض هیں۔ لہذا قانون کی نگاه میں مرد اور عورت دونوں کو مساوی درجه حاصل هے۔ لہذا همارے لئے کرنے کا کام فقط اتنا هی هے که اپنے معاشرے کو قرآنی خطوط پر متشکل کر لیں۔

آخر میں ڈاکٹر انون لکھتا هے که

> اگر کوئی معاشره چاهتا هے که اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید تک، بلکه ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رهیں تو اس کے لئے ضروری هوگا که وه پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشره میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت مدید تک، بلکه همیشه همیشه کے لئے کم ازکم حد تک محدود رهیں۔ اس طرح اس معاشره کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشنده مستقبل کی حامل هوں گی وه تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اور انسان کی توانائیاں اسکی ان روایات کو ایک ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت همارے حیطهٔ ادراک میں بھی نہیں آسکتا (صفحه ۴۳۲)

قرآن ایسے هی معاشره کی تشکیل چاهتا هے۔ اس کے لئے اس نے نہایت واضح قوانین دیئے هیں۔ وه عائلی زندگی کو کس قدر اهمیت دیتا هے اس کا اندازه اس سے لگائیے که وه جهاں صلٰوة و زکٰوة جیسے امور کے متعلق بالعموم اصولی قوانین دیتا

ہے وہاں عائلی زندگی کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے۔

ایک بنیادی حقیقت

لیکن اس ضمن میں ایک بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کا آخر میں بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جنسی جذبہ بھی بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کی طرح ایک فطری جذبہ ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے اور جس طرح بھوک، پیاس وغیرہ کی اضطراری حالت میں عام قوانین کو ڈھیلا (Relax) کر دیا جاتا ہے اسی طرح جنسی قوانین کی بندشوں کو بھی ڈھیلا کر دینا چاہئے۔ یہ تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (Natural Instinct) ہے لیکن اس میں اور بھوک پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھو۔ تم کسی کام میں منہمک بیٹھے ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ شروع میں تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر تم پانی پی لیتے ہو تو فبہا، ورنہ اس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اگر تمہیں کچھ دنوں کے لئے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی بھی ہے۔ اس سے تم نے دیکھ لیا کہ

(۱) بھوک، پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں (جان بچانے کی خاطر) ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تا وقتیکہ ہم اس کا خیال نہ کریں۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمود یکسر ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی ”اضطراری حالت“ کے لئے حرام کو حلال نہیں قرار دیا۔ بلکہ کہا یہ ہے کہ جس کے لئے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبط نفس سے کام لے۔ (۲۴/۳۳)

ضبطِ نفس

اور یہ ضبط نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لئے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو، اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ وہ نہ خیالات کو طیورِ آوارہ بنائے، نہ توجہ اس طرف جائے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ

صید خود صیاد را گوید بگیر

اس میں ایک فرد (بالخصوص نوجوان طبقہ) اپنے خیالات پر کس طرح کنٹرول رکھ سکے؟ یہ بات ایک حد تک درست ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن چور ہی کو نہیں بلکہ چور کی ماں کو بھی مارتا ہے۔ وہ صرف ارتکابِ جرم کے بعد مجرم کو نہیں پکڑتا بلکہ ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے ارتکاب کے مواقع کم از کم ہو جائیں۔ اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ لاَ تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (۶/۱۵۲) تم فواحش کے قریب تک نہ جاؤ۔ یعنی فواحش تو ایک طرف جو اسباب و ذرائع فواحش تک لے جانے والے ہوں ان سے بھی مجتنب رہو۔ ان اسباب و ذرائع میں وہ بھی شامل ہیں جو بظاہر نظر آجاتے ہیں، اور وہ بھی جو نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ یعنی دل میں گذرنے والے خیالات جو آہستہ آہستہ انسان کو فواحش تک لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ نگاہوں کی خیانت اور دل کی چوری (راز) تک سے واقف ہے۔ اس قسم کی روش کو تطہیرِ قلب و نگاہ کہتے

ہیں ۔ یعنی دل اور آنکھ کی پاکیزگی ۔ اِس مقصد کے لئے قرآن مردوں اور عورتوں کے اختلاط (میل جول) کے متعلق تفصیلی ہدایات دیتا ہے (انہیں پردے کے احکام کہا جاتا ہے) ۔ تم ان امور کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہو تو طاہرہ بیٹی سے وہ خطوط لیکر دیکھ لو جو میں نے اسے اس موضوع پر وقتاً فوقتاً لکھے ہیں*۔

بہر حال تم نے یہ دیکھ لیا سلیم! کہ مرد اور عورت کا جنسی اختلاط، محض ایک طبعی فعل (Biological Action) نہیں جس کا تعلق صرف انسان کے جسم تک ہو ۔ اس کا تعلق قوموں کی تہذیب و تمدن اور کلچر و ثقافت کے ساتھ بڑا گہرا اور بنیادی ہے ۔ لہذا یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے یونہی نظر انداز کردیا جائے ۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم تمدن اور ثقفت میں ممتاز حیثیت حاصل کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جنسی تعلقات کو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھیں ۔ یعنی ان آزادیوں کو بھی محدود کریں جو مغرب کی اندھی تقلید سے ہمارے جدت پسند طبقہ میں دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہیں، اور ان ''شرعی اجازتوں'' کو بھی حدوداللہ کا پابند بنائیں جو غلط (یعنی غیر قرآنی) مذہب کی بنا پر ہمارے قدامت پسند معاشرہ میں صدیوں سے مروج چلی آرہی ہیں ۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی ۔ سنت اللہ کسی کے لئے بدلا نہیں کرتی ۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

کچھ سمجھے سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ اچھا خدا حافظ ۔

فروری ۔ ۱۹۵۷ء

والسلام

پرویز

---

* یہ خطوط چھپ چکے ہیں ۔

سینتیسواں خط

قوموں کے عروج و زوال
کا ابدی قانون

نہیں سلیم! تاریخ کا علم اور اس کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ تاریخ محض ماضی کے واقعات اور حوادث کا ریکارڈ نہیں۔ وہ صرف اتنا بتانے کے لئے نہیں کہ اکبر فلاں سال تخت پر بیٹھا اور فلاں سال مر گیا۔ وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ قومیں کس اصول کے ماتحت زندہ رہتی ہیں اور کس قانون کے ماتحت مرتی ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے اِس قسم کی روشِ زندگی اختیار کی تو اس کا یہ نتیجہ نکلا اور فلاں قوم اُس قسم کی نہج پر چلی تو اس کا انجام یہ ہوا۔ اِسے سائنس آف ہسٹری یا فلسفۂ تاریخ کہتے ہیں۔ اور تم یہ سن کر متعجب ہو گے کہ تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ قوموں کی موت اور حیات یونہی اتفاقی طور پر واقع نہیں ہو جاتی۔ ان کا عروج و زوال اندھا دھند طریق پر ظہور میں نہیں آ جاتا۔ اس کے لئے خاص قانون اور اصول مقرر ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعضِ اوقات کوئی خاص قوم

سائنس آف ہسٹری

یا گروہ کچھ قوت جمع کر لیتا ہے اور اس کے ذریعے وقتی طور پر اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن یہ ہنگامی حادثہ ہوتا ہے جو ایک شعلۂ مستعجل کی طرح فوراً بھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ جسے قوموں کا عروج و زوال کہا جاتا ہے، وہ ارتقائی طور پر نمودار ہوتا ہے اور اسی طرح تدریجی طور پر سمٹ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

قوموں کی موت

یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب ہم کسی قوم کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس قوم کی نسل سطحِ ارض سے مٹ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایک نسل کی نسل طبعی طور پر (Physically) دنیا سے مٹ جاتی ہے لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کے افراد طبعی طور پر زندہ رہتے ہیں (اور انکی نسل بھی آگے چلتی رہتی ہے) لیکن اس قوم کا شمار زندہ اقوام میں نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی قوم کی موت اور حیات سے مقصود کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہر قوم ایک خاص نظریۂ حیات، ایک خاص تصور زندگی، ایک خاص نقطۂ نگاہ کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصود اور جدوجہد حیات کے لئے ایک خاص نصب العین ہوتا ہے۔ اس تصور حیات اور نظریۂ زندگی کو قرآن کی اصطلاح میں کلمہ اور دور حاضر کی اصطلاح میں (یوں سمجھو کہ) کلچر کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قوم ایک خاص کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ لہذا ایک قوم کی موت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کلچر کی حامی تھی اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانہ کے تصادمات (Challenges) کا مقابلہ کر سکتا۔ اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر ایک قوم کسی خاص زمانہ میں عروج پر ہے، اور اسکے بعد اس پر زوال آگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (۱) یا تو اس کلچر میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سامنے ٹھہر سکتا ور یا (۲) یہ کہ اس قوم نے اس پہلے کلچر کو چھوڑ کر کوئی اور کلچر اختیار کر لیا تھا جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں

تھی۔ مختصراً یوں سمجھو کہ جس وقت کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے اس وقت وہ کسی ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے جس میں زمانہ کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں، کلچر اور زمانہ کے تقاضوں میں، مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ جب تک ایک کلچر ان تقاضود کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اس کی حامل قوم زندہ رہتی ہے۔ جب زمانے کے تقاضے اس پر غالب آ جاتے ہیں تو وہ قوم مصافِ زندگی میں پچھڑ جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے جس میں ان تقاضوں کے سامنے ٹھہرنے کی سکت ہوتی ہے۔ اس قانون کو قرآن کی اصطلاح میں قانون استبدال و استخلافِ قومی (Law Of Substitution And Succession Of Nations) کہاجاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی فرد مرنا نہیں چاہتا، اسی طرح کوئی قوم بھی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ہمیشہ زندہ اور برسراقتدار رہنا چاہتی ہے۔ لیکن جس طرح کوئی فرد محض اس لئے زندہ نہیں رہ سکتا کہ اسے زندہ رہنے کی آرزو ہے (اسے زندہ رہنے کے لئے قانون حیات کے مطابق چلنا ضروری ہے) اسی طرح کوئی قوم بھی محض مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے زندہ رہنے کے لئے اس اٹل قانون کا اتباع کرنا ہوگا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب (صدر اول کے) مسلمانوں کا مقابلہ ان قوموں کے ساتھ ہوا جو ایسے کلچرز کی حامل تھیں جن میں آگے چلنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی (انہیں اہل کتاب کہہکر پکارا گیا ہے) تو قرآن نے انہیں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم میں سے ہر فریق کی یہ دلی آرزو ہے کہ وہ اس کشمکش میں غالب آئے اور آگے بڑھ جائے، لیکن یاد رکھو۔ اس بات کا فیصلہ محض آرزوؤں پر مبنی نہیں۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتَابِ۔ اس کا فیصلہ نہ تو تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی تمہارے فریق مقابل (اہل کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق۔ اس کا فیصلہ اس اٹل قانون کے مطابق ہوگا کہ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَ بِہٖ۔ جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا

قانون کی حکومت

کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ھوگی اس کی اس روش کے تباہ کن نتائج اس کے سامنے آکر رھیں گے۔ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴/۱۲۳) اور ان نتائج و عواقب سے اسے کوئی نہیں بچا سکے گا بجز اس کے کہ وہ قانون خداوندی ھی کو اپنی مدافعت کے لئے سپر بنائے۔ یہ اسلئے کہ کائنات میں لاقانونیت (Lawlessness) اور دھاندلی نہیں۔ یہاں زندگی اور موت کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق علٰی وجہ البصیرت ھوتا ھے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جسے ھلاک ھونا ھے وہ بھی دلائل و براھان کی رو سے ھلاک ھو۔ اور جسے زندہ رھنا ھے وہ بھی دلائل و براھان کی رو سے زندہ رھے۔ یہاں نہ کسی کو زندگی مراعاتِ خسروانہ (بادشاھوں کی بخشش) کے طور پر ملتی ھے۔ نہ کسی کی موت انتقام شاھانہ (بادشاھوں کی برھمیٔ مزاج) کی وجہ سے ھوتی ھے۔ یہاں ھر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ھے جسمیں کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ھوتی۔

ھیگل کا فلسفہ

اس تمہید کے بعد سلیم! آگے بڑھو۔ نظریاتِ زندگی کی باھمی کشمکش کے متعلق ھمارے زمانے میں ھیگل نے ایک فلسفہ پیش کیا جسے فلسفۂ تضادات کہتے ھیں۔ اس نے کہا کہ ایک نظریہ (Idea) پیدا ھوتا ھے۔ وہ بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا ھے۔ جب وہ شباب تک پہنچ جاتا ھے تو اس کے اندر سے ایک اور نظریہ ابھرتا ھے جو پہلے نظریہ کی ضد ھوتا ھے۔ اب وہ سابقہ نظریہ مضمحل ھونا شروع ھو جاتا ھے اور یہ نیا نظریہ پروان چڑھنے لگتا ھے۔ آھستہ آھستہ، وہ پہلا نظریہ محو ھو جاتا ھے اور اس کی جگہ یہ نیا نظریہ لے لیتا ھے۔ یہ نیا نظریہ اسی طرح بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا ھے اور پھر اسکے اندر سے ایک نیا نظریہ ابھرتا ھے جو اس کی ضد ھوتا ھے۔ ھیگل کا کہنا یہ ھے کہ نظریات کی یہ گردش دولابی (کہ ایک آتا ھے ایک جاتا ھے) مسلسل اور پیہم جاری ھے۔ ھرا بھرنے والے نظریہ کو کچھ وقت کے بعد، مضمحل ھونا اور دوسرے نظریہ کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی ھے۔

مارکس کا فلسفہ

ہیگل کے بعد مارکس آیا۔ اس نے بھی ہیگل ہی کے فلسفہ کی اتباع کی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مارکس نے کہا کہ یہ کشمکش، نظریات (Ideas) میں نہیں ہوتی بلکہ نظامہائے حیات (Systems) میں ہوتی ہے۔ ایک دور میں زندگی کا ایک نظام (مثلاً نظام سرمایہ داری) کار فرما ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے اندر سے ایک اور نظام پھوٹتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ نظام اس سابقہ نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس فلسفہ کو (Dialectics) کہتے ہیں۔ یہ کشمکش، تصورات (Ideas) میں ہو یا نظامہائے حیات (Systems) میں، ایک چیز دونوں میں مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ (اس فلسفہ کی رو سے) کوئی تصور یا نظام نہ ذاتی طور پر اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ نہ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت ہوتی ہے نہ فوقیت۔ یا یوں کہو کہ کسی تصور یا نظام میں ذاتی طور پر اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے یا اپنے متضاد نظریہ یا نظام پر ہمیشہ غالب رہ سکے۔ (غالب کے الفاظ میں) ہر نظریہ اور ہر نظام کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ وہ اپنے سے پہلے نظریہ یا نظام کی جگہ لیتا ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کا دور دورہ رہتا ہے اس بعد وہ یہ کہہ کر ختم ہو جاتا ہے کہ

میں اِسی لئے بنا تھا کہ خدا مجھے بگاڑے

ہیگل اور مارکس کا خیال ہے کہ قوموں کی موت و حیات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یہی وہ چکر ہے جس کے مطابق کلچرز آتے اور جاتے ہیں۔ نہ کوئی کلچر بنیادی طور پر فنا آمادہ ہوتا ہے، نہ بقا در آغوش۔ ہر ایک کی ’’موت کا ایک دن مقرر‘‘ ہوتا ہے۔ اسے نہ کوئی اس سے ایک دن زیادہ زندہ رکھ سکتا ہے۔ نہ اس سے ایک دن پہلے مار سکتا ہے۔

قرآن کا فلسفہ

اس کے برعکس، قرآن بھی کلچرز کے محو و ثبات کا ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ دنیا میں متضاد نظریات کی کشمکش جاری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں

کہ سب نظرئے ایک ھی قسم کے ہوتے ھیں۔ ایک نظریہ ایسا ہوتا ھے جس میں بنیادی طور پر غالب آنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ھوتی ھے۔ اور اس کے برعکس دوسرا نظریہ وہ ھوتا ھے جس میں بنیادی طور پر اس کی صلاحیت ھی نہیں ھوتی۔ وہ اول الذکر نظریہ کو حق کہکر پکارتا ھے اور ثانی الذکر کو باطل سے تعبیر کرتا ھے۔ قرآن کا خدا کہتا ھے کہ ھم اپنے کائناتی قانون سے کرتے یہ ھیں کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ حق کو باطل پر مارتے رہتے ھیں۔ ان کی باھم کشمکش رھتی ھے۔ فَيَدْمَغُهُ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ حق اس باطل کا بھیجا توڑ دیتا ھے۔ اس کا کچومر نکال دیتا ھے۔ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ($\frac{۲۱}{۱۸}$) اور وہ (باطل) بری طرح شکست کھا کر بھاگ جاتا ھے۔ اس لئے کہ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ($\frac{۱۷}{۸۱}$) باطل کی بنیاد ھی میں خرابی کی صورت مضمر ھوتی ھے۔ وہ حق کے مقابلے میں ٹھر ھی نہیں سکتا۔ وہ بنا ھی ایسا ھے کہ جب حق کے سامنے آئے، منہ موڑ کر بھاگ جائے۔ لہذا جو قوم حق کے کلچر کی حامل ھوگی وہ ھمیشہ اس قوم پر غالب رھے گی جو باطل کے کلچر کی نمائندہ ھوگی۔ اور اس وقت تک غالب رھے گی جب تک وہ حق پر قائم ھے۔ یہ نہیں ھوگا کہ حق کا کلچر کچھ وقت کے بعد خود بخود مرجھا کر گر پڑے۔ اور باطل کا کلچر اسکی جگہ لے لے۔ یہ ھو نہیں سکتا کہ حق کی حامل قوم پر وہ قوم غالب آجائے جو اُس کلچر کے صحیح ھونے پر ایمان نہیں رکھتی۔ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً ($\frac{۴}{۱۴۱}$)۔

حق و باطل

حق اور باطل کی قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کیا ھے۔ اس کے متعلق میں تمہیں اس سے پہلے کئی بار بتا چکا ھوں۔ مختصر الفاظ میں اسے دھرادوں کہ حق اس نظریہ (کلمہ) کا نام ھے جو انسانیت کی بلند اور مستقل اقدار (Permanent Values) کا حامل ھے۔ جو حقیقت (Reality) پر مبنی ھے۔ جس کے نتائج ھمیشہ تعمیری (Constructive) ہوتے ھیں۔ جس کے سہارے کائنات کی ھر شے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، ابھرتی اور بلند ھوتی چلی جاتی ھے۔ یہ حق ھے۔ اور جو کچھ اس کی ضد ھے وہ باطل ھے۔ یعنی تخریبی نتائج کا حامل نظریہء زندگی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے تصوراتِ حیات یا نظامہائے زندگی یا کلچرز کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا ھے وہ ھیگل یا مارکس کے فلسفہ کے کس قدر خلاف ھے؟ (یہی وہ بنیادی اختلاف ھے جو اسلام کو کمیونزم کی ضد قرار دیتا ھے)۔ وہ کہتا ھے کہ قوموں کی حیات و موت کے فیصلے اس فلسفہ اور اس قانون کی رُو سے ھوتے ھیں۔ یہی کلچرز کے محو و ثبات کا معیار ھے۔ قرآن نے اقوام سابقہ کی جسقدر داستانیں (یعنی تاریخی یادداشتیں) پیش کی ھیں ان سے مقصود ھی یہ بتانا ھے کہ فلاں قوم نے حق کی روش اختیار کی تو وہ کسطرح اس قوم پر غالب آگئی جو باطل بدوش تھی۔ اور جب اُس قوم نے جو حق پر تھی، حق کی روش کو چھوڑ دیا تو وہ کس طرح ذلیل و خوار ھو گئی۔ اس وقت مجھے اسکی فرصت نہیں سلیم! کہ میں ان تمام تاریخی نوشتوں کو اس نقطۂ نگاہ سے سامنے لا کر تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تاریخ کو کسطرح ایک سائنس اور فلسفہ کی حیثیت میں پیش کیا ھے۔ کبھی فرصت ملی تو یہ بھی ھو جائے گا۔ اِس وقت میں صرف وہ چند ایک مقامات تمہارے سامنے لا سکوں گا جن میں قرآن نے اپنے اس اصولی قانون کی مختلف انداز سے وضاحت کی ھے۔ یا یوں کہو کہ جن میں وہ اس اصل الاصول کے مختلف گوشوں (Facts) کو سامنے لاتا ھے۔ ان مقامات میں اسنے وضاحت سے بتایا ھے کہ قوموں کے استبدال و استخلاف کے قوانین کیا ھیں؟ کون سی قومیں مٹتی ھیں اور کون سی انکی جگہ لیتی ھیں۔ ذرا غور سے سنو! یہ حقائق ایسے نہیں جنہیں سطحی طور پر دیکھ کر انسان آگے بڑھ جائے۔ ان کا تعلق خود ھماری (اجتماعی) موت اورحیات سے ھے۔ اور انہی مقامات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ خود مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ھیں اور ان کی باز آفرینی کی صورت کیا؟ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

حیوانی سطح کی زندگی

سب سے پہلے قرآن یہ کہتا ھے کہ جو کلچر، انسانی زندگی کو حیوانی سطح (Animal Level) ھی پر رکھتا ھے اسے کبھی ثبات و بقا نصیب نہیں ھو سکتی۔ وہ کلچر باطل کا حامل ھے۔ قرآن کی رُو سے، انسان اور حیوان میں اتنا ھی فرق نہیں کہ

انسان، سلسلۂ ارتقا میں حیوان سے اگلی کڑی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کی سطح پر پہنچ کر، زندگی ایسے نئے امتیازات کی حامل ھو جاتی ہے جو حیوانی سطح پر قطعاً موجود نہیں ھوتے۔ انہی امتیازات کا نام شرفِ انسانیت ہے اور انہی کی نشوونما مقصودِ حیات۔ ہمارے دور میں اس نظریۂ زندگی کو جو انسانی زندگی کو محض حیوانی زندگی کی ایک بڑھی ہوئی شکل قرار دیتا ہے مادی نظریۂ زندگی (Materialistic Concept of life) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نظریہ کی حامل قومیں، خواہ کتنی ھی قوت اور ساز و سامان کیوں نہ جمع کرلیں، کامیاب و کامران نہیں ھو سکتیں۔ سورۂ محمدؐ میں ہے اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ان قوموں کا انجام کیا ھوا جو ان سے پہلے گذر چکی ھیں؟ تم نے دیکھا سلیم! قرآن تاریخی نوشتوں کے مطالعہ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس مطالعہ کو کس طرح ایک سائنس کی حیثیت دیتا ہے۔ یعنی اس نے آگے چل کر جو اصول بیان کرنا ہے اس کی صداقت کے لئے وہ اقوام سابقہ کی تاریخ کو بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ ان اقوام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قانونِ خداوندی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد ہے وَلِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا۔ اقوام سابقہ کی جس تباھی و بربادی کا ذکر کیا گیا ہے اسکے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ محض ماضی کی داستانیں ھیں جنہیں قصے کہانیوں کی طرح دھرایا جا رہا ہے اور ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ چیز بطور اصول بیان کی جا رہی ہے کہ جن اقوام نے حق کی روش سے انکار کیا ان کا حشر یہ ھوا۔ لہٰذا اب بھی جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کا انجام ایسا ھی ھوگا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ یہ اس لئے ہے کہ کائنات میں جو کچھ ھوتا ہے دھاندلی سے نہیں ھوتا۔ یہاں سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ھوتا ہے۔ سو جو قوم خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، اس کی اس روش کے نتائج اس کے پشت پناہ بن جاتے ھیں۔ لیکن جو قوم اس قانون سے انکار کر کے کوئی دوسری روش اختیار

کرتی ہے تو اس کا محافظ و کارساز کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک محکم اصول ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ اسی اصول کے مطابق اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ جو لوگ اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اسکے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ شادکامیوں اور کامرانیوں کی سدا بہار جنتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ جو لوگ اس قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں انکی زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے جس میں مقصودِ حیات کھانا، پینا اور طبعی زندگی پوری کر کے مر جانا ہوتا ہے۔ اس روش زندگی اور نظریۂ حیات کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم بہت سی قوت اور جمعیت اکٹھی کر لینگے تو ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکیگا۔ یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وَ کَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ ھِیَ اَشَدُّ قُوَّۃً مِّنْ قَرْیَتِکَ الَّتِیْٓ اَخْرَجَتْکَ۔ اَھْلَکْنٰھُمْ فَلَا نَاصِرَ لَھُمْ (۴۷/۱۳-۱۰) کتنی ہی قومیں ان سے پہلے ایسی گذر چکی ہیں جن کے پاس اِن (موجودہ) لوگوں سے جنہوں نے اے رسول! تجھے تیرے وطن سے نکال دیا ہے کہیں زیادہ قوت تھی۔ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کا کوئی ایسا حامی و مددگار نہ نکلا جو انہیں اس تباہی سے بچاسکتا۔ سو جب اُن کا حشر یہ ہوا تو ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ غلط روش، سابقہ زمانہ میں تو تباہی و بربادی پر منتج ہو اور وہی روش اس زمانہ میں کامیابی و کامرانی عطا کر دے۔

اس سے ہم نے دیکھ لیا سلیم! کہ جس تصورِ حیات کی رو سے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانی زندگی محض حیوانوں کی طرح طبعی زندگی ہے اور اس کے سامنے خورد و نوش سے بلند کوئی مقصد نہیں اس تصور (کاچر) کو بقا اور دوام نصیب

نہیں ھو سکتا اور جو معاشرہ ان خطوط پر متشکل ھو اس میں انسان کبھی امن و سکون کی زندگی بسر نہیں کرسکتا ۔ انسانی سطح پر زندگی کے معنی یہ ھیں کہ انسان کے سامنے زندگی کی مستقل اقدار ھوں اور ان کا حصول اس کا نصب العین حیات ۔ یہی وہ اقدار ھیں جن کے حصول سے انسان طبعی موت سے بھی مر نہیں سکتا بلکہ حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ھے ۔

مترفین کا نظریۂ زندگی

اب آگے بڑھو ۔ قرآن نے دوسرا اصول یہ بتایا ھے کہ جس نظام میں حالت یہ ھو کہ معاشرہ میں نچلا طبقہ دن رات محنت کرکے پیدا کرے اور اوپر کا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑائے وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ھوسکتا ۔ حق پر مبنی نظام میں کبھی یہ نہیں ھوسکتا کہ ایک (محنت کش) طبقہ کے خون کی رنگینی دوسرے (بیکار) طبقہ کی عشرت گاھوں کی تزئین و آرائش میں صرف ھو ۔ سورۃ انبیاء میں ھے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ کتنی ھی قومیں ایسی گذری ھیں کہ ھمارے قانونِ مکافات نے انہیں ان کی زیادتیوں کی وجہ سے تباہ کردیا اور ان کی جگہ اور قوموں نے لے لی ۔ چنانچہ ان کے ساتھ ھوا یہ کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهُمْ يَرْكُضُوْنَ جب انہوں نے محسوس کیا (یعنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا) کہ ھمارا عذاب سامنے آ رھا ھے تو وہ اس سے بھاگنے لگے ۔

موضوع کے تسلسل کا تقاضا ھے کہ اس سے اگلی آیت فوراً سامنے لے آئی جائے ۔ لیکن ، اس آیت میں سلیم ! ایک نکتہ ایسا آ گیا ھے جس کی وضاحت کے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاھتا ۔ غور سے سنو! آیت میں ھے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ جب انہوں نے محسوس کرلیا کہ ھمارا عذاب آرھا ھے ۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ ھمارا عذاب تو بہت پہلے سے آ رھا تھا لیکن وہ ابھی محسوس شکل میں ان کے سامنے نمودار نہیں ھوا تھا ۔ وہ ان کے حواس (Sense Perception) کی زد میں نہیں آیا تھا ۔ وہ ابھی غیرمرئی شکل میں مرتب ھو رھا تھا ۔ حقیقت یہ ھے کہ ھر

عمل کا نتیجہ اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے جب وہ عمل سرزد ہو۔ لیکن یہ نتیجہ اپنے ابتدائی مراحل میں غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتا ہے اور انسان سمجھتا نہیں کہ اسکے عمل کا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ یہ بات اسکی سمجھ میں اس وقت آتی ہے جب وہ نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ عمل کے ارتکاب اور اسکے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو اجل یا میعاد کہتے ہیں۔ اس کو مہلت کا وقفہ بھی کہا جاتا ہے (اسکی پوری تشریح ذرا آگے چل کر آئیگی)۔ غلط نظام کی حامل قومیں، اپنی عقل وفکر اور تدبر و سیاست کی رو سے ان تمام دروازوں، کھڑکیوں، روشندانوں اور رخنوں کو بند کر لیتی ہیں۔ جن کے راستے (وہ سمجھتی ہیں کہ) بربادی آسکتی ہے۔ اور جب اس طرح سے بربادی فوراً سامنے نہیں آتی تو وہ مطمئن ہو جاتی ہیں کہ ہمارا انتظام بڑا محکم اور (Fool-Proof) ہے۔ لیکن خدا کا قانون ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو آہستہ آہستہ، بتدریج ان راستوں سے لئے آتا ہے جو ان کے فہم و شعور میں بھی نہیں آسکتے (سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۷/۱۸۲) اور وہ اسے اس وقت دیکھ پاتے ہیں جب وہ محسوس شکل میں ان کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ مطلب ہے فَلَمَّا أَحَسُّوْا بَأْسَنَا کا۔

بہر حال قرآن کہہ یہ رہا تھا کہ جب ان لوگوں کے سامنے ہمارا عذاب محسوس شکل میں آگیا تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانون مکافات نے انہیں آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوْا مت بھاگو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ رکو۔ تھمو۔ تم بھاگ کر جا کہاں رہے ہو؟ وَارْجِعُوْا إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسَاكِنِكُمْ۔ رکو اور لوٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے اپنے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے اور غریبوں کی کمائی سے بڑے بڑے ذی شان محلات تعمیر کر رکھے تھے۔ چلو لوٹ کر وہیں چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ چیزیں دوسروں کی کمائی سے کیسے بنالیں؟ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا تھا؟

تا کہ تم سے پوچھا جائے

اس ٹکڑے پر ذرا غور کرو سلیم! کہ قرآن نے کیا بات کہدی ہے۔ غلط نظام میں اوپر کا طبقہ سمجھتا یہ ہے کہ ہم جو کچھ جی چاہے کریں، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اول تو وہ اپنے آپ کو قانون کی زد سے باہر سمجھتے ہیں۔ وہ ایسی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں جن سے وہ قانون کی گرفت میں آ ہی نہ سکیں۔ اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو تو وہ قانون ہی ایسا بنا لیتے ہیں جس کی رو سے وہ سب کچھ جائز قرار پا جائے جو کچھ وہ کرتے ہیں (اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴/۳۷)۔ چنانچہ نظام سرمایہ داری میں یہی کچھ ہوتا ہے کہ اوپر کا طبقہ اس قسم کے قوانین بنا لیتا ہے کہ وسائلِ پیداوار پر انفرادی ملکیت بےحد و نہایت (Un-Limited) جائز ہے۔ دوسری طرف وہ ارباب شریعت کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور وہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ اس قسم کی ذاتی ملکیت پرَ حدبندی عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے۔ اسطرح یہ سب کچھ قانوناً اور شرعاً جائز قرار پاجاتا ہے اور اس کے متعلق ان سے کچھ پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان حیلوں اور بہانوں، ان روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں، ان خدا فریبیوں اور خود فراموشیوں سے تم خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ ان سے تم اس "خطرے" سے محفوظ نہیں ہوسکتے کہ اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کا کیا جواب دینگے۔ خدا کا قانون تو پائی پائی کا حساب لیلے گا۔ جب "تم جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے"۔ (لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ) تو اس وقت لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۱۰۲/۸) تم سے ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے گا کہ وہ کیسے حاصل کی گئی تھی اور کہاں صرف ہوئی تھی۔

اس وضاحت کے بعد پھر اصل آیت کی طرف لوٹو۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ان قوموں کی طرف تباہی کا عذاب آیا۔ اور وہ اسے دیکھکر بھاگنے لگے تو ہمارے قانون نے انہیں للکارا اور کہا کہ رک جاؤ اور لوٹ کر اپنے عشرت کدوں کی طرف چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ ان پر تمہارا کیا حق تھا۔ اس کے بعد ہے کہ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ اس کے جواب میں انہوں نے (بزبان

حال کہا کہ) حقیقت یہ ہے کہ ہم واقعی زیادتی کیا کرتے تھے۔ دوسرے کے حق پر غاصبانہ قبضہ جما لیا کرتے تھے۔ اور یہ تباہی اسی وجہ سے آئی ہے۔ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوٰهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ لیکن اس وقت ان کے اس اعتراف اور اقرار سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ یہ کہتے رہے اور ہمارا قانون انہیں تباہ و برباد کرتا رہا تا آنکہ وہ ایسے ہوگئے جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا انگارہ ہو۔

اس کے بعد سلیم! قرآن ایک ایسی بات کہتا ہے جو فکر و نظر کی پوری کائنات کو اپنی طرف مرکوز کرلیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہوتا بلکہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے جسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ ساری کائنات مصروفِ گردش ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱/۱۱-۱۶) یہ کائنات اور یہ ارض و سما کا سلسلہ ہم نے یونہی کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنا دیا۔ یہ عظیم کارگہ ایک خاص مقصد کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عمل اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اس کے ایک آیت بعد وہ آیت ہے جسے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے یعنی بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)۔ یہ سلسلہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق غالب رہے اور باطل کا سر کچلا جائے۔ لہذا قوموں کے عروج و زوال کے لئے جو قانون ہم نے مقرر کیا ہے وہ نتیجہ خیز ہوکر رہتا ہے۔ اس کے راستے میں کوئی قوت مزاحم نہیں ہوسکتی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کی تباہی اور بربادی کے متعلق دوسرا اصول کیا بیان کیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ جس نظام کی رو سے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرے وہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہوسکتا۔

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اب اور آگے بڑھو۔ نظام سرمایہ داری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایک طبقہ محنت کرتا ہے اور دوسرا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑاتا ہے۔

دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد اُمتے بر اُمتے دیگر چرد

دولت سمیٹنے والے

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک طبقہ دولت کو سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کئے جاتا ہے اور اسے نوع انسانی کی نشو و نما کیلئے کھلا نہیں رکھتا۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے بخل کہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو نظام بخل کے نظریہ کو دلیل راہ بنائے اسکی حامل قوم کبھی زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور اس جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۃ محمدؐ میں ہے۔ هَاَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ سن رکھو کہ تمہاری کیفیت کیا ہے؟ تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں کہا جاتا ہے کہ تم اپنا نظام ایسا رکھو جسمیں تمہاری محنت کا ماحصل نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح کھلا رہے کہ تم اس کے معاوضے میں کسی سے کچھ لینے کے طلبکار نہ ہو۔ لیکن تم میں ایسی ذہنیت رکھنے والے پیدا ہو جاتے ہیں جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو! وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ، جو شخص دوسروں کو مال و دولت سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کو سعادتوں اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اللہ تمہارے مال و دولت سے بے نیاز ہے اور تم اپنی نشو و نما کے لئے اس کے محتاج ہو۔ بہر حال اسے اچھی طرح سن رکھو کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ اگر تم نے حق کے نظام سے منہ موڑ کر غلط روش اختیار کر لی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ آیت کے آخری ٹکڑے میں قرآن نے کتنی گہری بات کہدی ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ قوموں کی ادلا بدلی یونہی اندھا دھند نہیں ہو جاتی کہ ایک

قوم مٹا دی جاتی ہے اور اسکی جگہ اس جیسی ایک اور قوم آ جاتی ہے۔ اگر اسکی جگہ اسی جیسی قوم نے آنا ہو تو پہلی قوم کو مٹایا ہی کیوں جائے؟ محض تبدیلی کی خاطر تبدیلی (Change for Change Sake) می نسزد خدائے را (اللہ کے شایانِ شان نہیں)۔ ایک قوم مٹتی ہی اسوقت ہے جب اسمیں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ لہذا اس کی جگہ وہی قوم آسکتی ہے جسمیں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں گردشِ دولابی نہیں کہ ایک کلچر نے کچھ وقت کے بعد مٹنا ہے اور اس کی جگہ دوسرے کلچر نے لینی ہے خواہ یہ دوسرا کلچر اس پہلے کلچر جیسا یا اس سے بدتر ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں حق و باطل کی کشمکش ہے۔ مٹتی وہ قوم ہے جو حق پر نہ رہے۔ اور اسکی جگہ آتی وہ قوم ہے جو اس کے مقابلہ میں حق پر ہو۔ یہ ہیں معنی ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ کے۔ یعنی وہ قوم تمہارے جیسے کلچر کی حامل نہیں ہوگی۔

اس کے بعد قرآن ایک ایسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ نگہٗ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و مسرت سے جھوم اٹھتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں قوموں کی موت و حیات کا ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جس تک بہت کم نگاہیں پہنچتی ہیں۔ دنیا میں ہر پروگرام کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ پلان اور اسکیم کا ہوتا ہے۔ اسمیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر فکری طور پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے مالہٗ وما علیہ (Pros & Cons) کو سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کی عملی تشکیل کے مختلف نقشے بنائے جاتے ہیں۔ اس پر پوری پوری بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ محض لفظوں اور باتوں، کاغذوں اور لکیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اس پروگرام کی تکمیل کے لئے یہ ہوتا ہے نہایت ضروری۔ جب اس حصہ کی تکمیل ہوجاتی ہے، تو پھر اس پروگرام کا عملی پہلو شروع ہو جاتا ہے اور جو چیزیں اس وقت تک باتوں اور لفظوں تک محدود تھیں وہ اب رفتہ رفتہ محسوس پیکروں میں سامنے آنے لگ جاتی ہیں۔ جو قوم اس طرح پروگرام بناتی اور انہیں تکمیل تک پہنچاتی ہے وہ کامیاب و کامران رہتی ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم ساریِ عمر اسکیمیں ہی بناتی رہے۔

محض باتیں بنانے والے

تمام وقت سوچنے ہی میں صرف کر دے۔ زندگی بھر باتیں ہی کرتی رہے اور عملاً ایک قدم نہ اٹھائے۔ وہ قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔ خواہ اسکی فکر کتنی ہی ثریا بوس اور اسکی نگاہ کیسی ہی فلک رس کیوں نہ ہو۔ بالفاظ دیگر قومیں محض فلسفے کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ زندگی عمل سے بنتی ہے۔ فلسفہ، فکری صلاحیتوں کو جِلا دیتا ہے تاکہ ان سے عمل کی راہیں روشن ہو جائیں۔ لیکن اگر کوئی قوم محض فلسفی بن کر رہ جائے اور عمل کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے تو اسکی مثال اس راہ گذر کی سی ہوگی جو راستہ چلنے کے لئے شمع تو روشن کرے لیکن اس شمع کو لیکر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسافر عمر بھر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا اور اسکی لالٹین کا تیل بھی بیکار جلے گا۔ جو قومیں عمل سے بیگانہ ہو جائیں ان کے مفکر، مابعدالطبیعاتی مسائل (Metaphysical problems) کے حل کرنے میں دماغ سوزی کرتے رہتے ہیں اور انکے لیڈر اسکیمیں بنانے میں مصروف اور بیانات دینے اور تقریریں کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے کار ہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ نہ ان مفکرین کی فکر، اور نہ ان لیڈروں کے الفاظ قوم کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ جو قوم زندگی کے عملی مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرکے نظری مباحث میں الجھ کر رہ جاتی ہے، اس کی موت یقینی ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے   بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

قرآن نے اسے خوض سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں بیکار باتوں میں الجھنا۔ یونہی نظری طور پر مسائل کی گہرائیوں میں اترنا۔

اب اس حقیقت کے دوسرے پہلو کو لو۔ زندگی کا تعلق بیشتر ان معاملات سے ہے جن کی کوئی نہ کوئی افادی حیثیت (Utilitarean Value) ہو۔ لیکن انسانی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کام کے ساتھ ساتھ اعصاب کے سکون کی بھی ضرورت ہے۔ فنونِ لطیفہ (Fine Arts) کا زیادہ تعلق زندگی کے اسی پہلو سے ہے۔ انسانی زندگی میں کام کی حیثیت اگر پٹرول کی ہے تو فنونِ لطیفہ کی حیثیت موبل آئل

کی سی ہے۔ اس سے زندگی کے موٹر کے پرزے آپس میں رگڑ نہیں کھاتے۔ ان میں (Friction) نہیں پیدا ہوتی۔ لوچ اور لچک رہتی ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ اگر کسی

فنونِ لطیفہ

موٹر میں پیڑول کی جگہ بھی موبل آئل ہی ڈال دیا جائے تو وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ یہی حالت ان قوموں کی ہوتی ہے جو زندگی کے عملی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیں اور اپنی ساری توجہ فنونِ لطیفہ کی ترقی اور نشوونما پر مرکوز رکھیں۔ وہ قوم مصافِ زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتی۔ قرآن نے اسے لعب سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی کھیل تماشے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جو کلچر خوض اور لعب ہی کو مقصودِ حیات سمجھے اس کی حامل قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ سورۂ معارج میں ہے کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ہم اس پر قادر ہیں کہ (اس مخاطب قوم کی جگہ) ایک ایسی قوم کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہو۔ یہ ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے۔ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ($\frac{۷۰}{۴۱-۴۲}$) سو تو انہیں خوض و لعب میں مشغول رہنے دے۔ تاآنکہ وہ روزِ بد ان کے سامنے آجائے جس کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ آکر رہے گا۔

تاریخ کے اوراق پر یونان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس قوم کا حکمت و فلسفہ میں یہ عالم تھا کہ ان کے مفکرین کا شمار آجتک دنیائے فکر کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ (مصوری۔ مجسمہ تراشی۔ موسیقی اور شاعری) میں بھی وہ جس مقام تک پہنچ چکے تھے بہ ہیئت مجموعی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ لیکن عملی اور افادی دنیا میں ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ایک سوئی تک بھی اپنے ہاں تیار نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ قوم اس طرح نیچے گری کہ اسے پھر ابھرنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ ان کا بلند ترین فلسفہ اور لطیف ترین فنون انہیں اس تباہی سے قطعاً نہ بچا سکے۔ ان کی جگہ ان

قوموں نے لے لی جو خیرٌ منہم (ان سے بہتر) تھیں۔ استبدال اور استخلافِ قومی کا یہ بھی ایک اہم قانون ہے جسے قرآن نے اس انداز سے پیش کیا ہے۔

جدوجہد سے جی چرانے والے

اسکے بعد قرآن نے ایک ایسا قانون پیش کیا ہے جسے ان تمام قوانین کا اصل الاصول اور ان تمام اصولوں کا لب لباب کہنا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ مسلسل جدو جہد، پیہم سعی و عمل۔ غیر منقطع تگ و تاز۔ ان تھک کوشش۔ اس کا نام ہے زندگی۔

گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

جو قوم جس سانس میں جدو جہد (جہاد) سے جی چراتی ہے اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی ترکِ جہاد کا ہے۔

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن نے اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ جو قوم جہادِ زندگی سے جی چراتی ہے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین گیر ہو جاتے ہیں۔ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ کیا تم مستقبل کے مفاد کو چھوڑ کر مفادِ عاجلہ پر ریجھ گئے ہو؟ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ اگر ایسا ہی ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قریبی مفاد، مستقبل کے مفاد کے مقابلہ میں، کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا اگر تم جہادِ زندگی کے لئے باہر نہ نکلے تو یاد رکھو تم پر سخت تباہی آجائے گی وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ اور خدا کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے

گا۔ وَلَا تَضُرُّوْہُ شَیْئًا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ ($\frac{۹}{۳۸-۳۹}$) اللہ کا قانون نافذالعمل ہوکر رہتا ہے۔ اس میں اس کی قدرت ہے۔

صلاحیت بنیادی شرط ہے

استخلاف فی الارض

ان مقامات میں تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کے عروج و زوال اور انکی موت و حیات کے لئے کیا قوانین و اصول بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم تاریخ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ ہر قوم کی داستان کس طرح انہی قوانین کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب پہلے یہی کچھ ہوتا رہا ہے تو اب بھی یہی کچھ ہو گا۔ وراثتِ ارض نہ آباؤ اجداد سے ترکہ میں مل سکتی ہے، نہ بخشش کے طور پر۔ اس کے لئے ایک اٹل قانون مقرر ہے۔ وہ قانون کیا ہے، اسے قرآن نے چند الفاظ میں یوں سمٹا کر رکھدیا ہے جیسے آنکھ کے تیل میں پہاڑ سما جائے۔ سورۂ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ ہم نے ہر آسمانی صحیفہ میں ضروری قوانین اور تاریخی یاد داشتیں درج کر دینے کے بعد اس اصول الاصول کو محکم طور پر بیان کر دیا ہے کہ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں اسکے لئے ضروری صلاحیت موجود ہو۔ اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ($\frac{۲۱}{۱۰۵-۱۰۶}$) یہ قانون ایسا ہے جس میں ہر اس قوم کے لئے جو اپنی زندگی کو نظامِ خداوندی کے تابع رکھنا چاہے، ایک دور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔ اسی محکم اصول کے مطابق خود مسلمانوں سے کہدیا گیا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ جو لوگ تم میں سے خدا کے قانون کی محکمیت پر یقین رکھ کر اسکے متعین فرمودہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے ان کے متعلق خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں حکومت عطا کریگا۔ اور یہ چیز انہیں کسی خصوصی رعایت سے (As a Special Favour) نہیں ملیگی۔ یہ خدا کے اس اٹل قانون کی رو سے ہوگا جسکے مطابق اقوام

سابقه کو بھی حکومت ملتی رهی ہے۔ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (جیسا که اس نے اقوام سابقه کو حکومت عطا کی تھی)۔ یه اس لئے هوگا که لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ تاکه وه نظام زندگی (دین) جسے ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے متمکن هو جائے (اس سے واضح ہے سلیم! کہ حکومت کے بغیر دین متمکن (Established) هو نهیں سکتا)۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا اور تاکه وه انکے خوف کو امن سے بدل دے۔ اس سے هوگا یه که يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وه صرف میرے قوانین هی کی محکومیت اختیار کرینگے اور ان میں کسی اور کے قوانین کو شریک نهیں کرینگے۔ (اس سے یه بھی واضح ہے کہ خدا کی عبادت سے مقصود کیا ہے اور وه کس طرح اپنی حکومت میں هی ادا هوسکتی ہے۔ اگر عبادت سے مقصود محض نماز روزه کی ادائیگی هو تو اسکے لئے اپنی حکومت کی ضرورت هی نهیں۔ انهیں تو محکوم مسلمان بھی اسطرح ادا کرتے رهتے هیں جس طرح آزاد)۔ اسکے بعد ہے وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ($\frac{۲۴}{۵۵}$) اور جس قوم نے اس قسم کے ایمان و عمل صالح کے بعد پھر سے انکار کی راه اختیار کرلی تو ان کے متعلق سمجھ لو کہ وه سیدھے راستے سے پھر گئے۔ اس کا نتیجه تباهی و بربادی کے سوا کچھ نهیں هوگا (فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ $\frac{۴۶}{۳۵}$)

ان تصریحات سے واضح ہے که قرآن کی رو سے قوموں کی موت اور حیات کے لئے ایک محکم قانون مقرر ہے۔ جو قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے زندگی کی توانائیاں مل جاتی هیں۔ جس کا نتیجه عروج و اقبال هوتا ہے۔ جو اس قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اسکے حصه میں تباهیاں اور بربادیاں آ جاتی هیں۔ الله نے یه قانون مقرر کر دیا اور انسان کو اسکا اختیار دیدیا که وه جونسا راسته جی چاہے اختیار کرے۔ اگر وه چاہے تو زندگی بخش اصولِ حیات اختیار کرے۔ اگر چاہے تو فنا در آغوش راسته پر چل پڑے۔ تم نے دیکھا سلیم! که اس باب میں قرآن نے کسقدر واضح تعلیم دیدی ہے۔ لیکن تم حیران هوگے که اسی قرآن کی حاملِ قوم

(مسلمان) اب یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ یہاں اختیار و ارادہ کا سوال ہی کوئی نہیں۔ انسان مجبور محض واقع ہوا ہے۔ افراد کی طرح قوموں کی موت اور زندگی کا بھی ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اسمیں ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ نہ کوئی قوم اپنی کوششوں سے اس مدت کو بڑھا سکتی ہے، نہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں سے اسمیں کوئی کمی کرسکتی ہے۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ اپنے اس (یکسر غیر قرآنی عقیدہ) کی تائید میں سند بھی قرآن ہی سے پیش کرتی ہے۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (۲/۲۶)۔ اقبال کے الفاظ میں

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
''تن بہ تقدیر'' ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی جو آیت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷/۳۴) ہر قوم کیلئے ایک اجل ہے۔ جب انکی اجل آ جاتی ہے تو ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہر عمل اور اسکے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفہ کی مدت یا میعاد کو اجل کہا جاتا ہے۔ اس اجل (ظہور نتائج کے وقت) سے پہلے پہلے اگر وہ قوم اپنی روش بدل لے تو وہ اپنی سابقہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچ سکتی ہے۔ لیکن جب وہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر انہیں کوئی نہیں ٹال سکتا۔ مختلف اعمال کے لئے یہ مہلت کا وقفہ (اجل) مختلف ہوتا ہے (جسطرح مثلاً کیلا سال کے بعد پھل دیدیتا ہے اور کھجور کے متعلق کہا

ہر قوم کی اجل

جاتا ہے کہ وہ چالیس سال کے بعد پھل لاتی ہے۔ یا مثلاً تھوڑی مقدار میں افیون کھانے سے (Slow Poisoning) ہوتی ہے اور ایک ہی بار زیادہ کھالینے سے فوری موت واقع ہو جاتی ہے - جسے ہم موت کہتے ہیں وہ در حقیقت ظہور نتائج کا وقت ہوتا ہے - یہ نتائج بہت پہلے سے مرتب ہونا شروع ہو چکے ہوتے ہیں - انکی نمود ایک خاص وقت پر جا کر ہوتی ہے اسے اجل کہتے ہیں) اور اسکے لئے بھی قانون مقرر ہے کہ فلاں قسم کے اعمال کے ظہور نتائج کے لئے کتنی مدت (اجل) درکار ہے اور فلاں قسم کے اعمال کے لئے کتنی - دیکھو! قرآن نے اس حقیقت کو کسقدر نمایاں الفاظ میں بیان کیا ہے - جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، سورۃ اعراف میں ہے لِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ($\frac{۷}{۳۴}$) (ہر قوم کے لئے ایک اجل ہے) اور سورۂ رعد میں ہے لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ ($\frac{۱۳}{۳۸}$) (ہر اجل کے لئے ایک قانون مقرر ہے) یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَ یُثْبِتُ - خدا کا یہی قانونِ مشیت ہے جس کی رو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے - قومیں مٹتی رہتی ہیں اور ثابت و قائم رہتی ہیں - یہ قانونِ مشیت، انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے - یہ خدا کا کائناتی قانون ہے جس کی اصل و بنیاد (سرچشمہ - Root) خود خدا کے پاس ہے - وَ عِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ ($\frac{۱۳}{۳۹}$)- لہذا کوئی اسمیں تغیر و تبدل نہیں کرسکتا - یہ انسانوں کی دسترس سے باہر ہے - اب سوال یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جسکی رو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے - اسکے متعلق پھر دہرا دیا یَمْحُ اللّٰہُ الْبَاطِلَ وَ یُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ ($\frac{۴۲}{۲۴}$) خدا اپنے قانون کی رو سے باطل کو محو کرتا رہتا ہے حق کو محکم اور اٹل بناتا ہے - ہر وہ کاچر مٹ جاتا ہے جو باطل پر مبنی ہو اور وہ باقی رہتا ہے جو حق پر استوار ہو-

اگرچہ یہ اصول بالکل واضع طور پر سامنے آچکا ہے کہ وہ کونسا کاچر ہے جسمیں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ کونسا جس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر- لیکن قرآن تجریدی اصولوں (Abstract Principles) کو محسوس مثالوں (Concrete Examples) سے واضح کر دیتا ہے تا کہ ان کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں کسی

قسم کی دقت نہ ہو اور ان میں کوئی ابہام یا ایہام نہ رہے چنانچہ اس نے اس حقیقت کو بھی محسوس مثال کے ذریعے واضح کر دیا ہے کہ وہ کونسا کلچر یا نظام ہے جسمیں دوام و استمرار کی صلاحیت ہوتی ہے۔ سورۂ رعد میں ہے أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہنے شروع ہو جاتے ہیں۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا تو یہ سیلاب زمین کے خس و خاشاک کو پرکاہ کی طرح بہا کرلے جاتا ہے۔ یعنی پانی کی منفعت بخش نمی زمین میں جذب ہو جاتی ہے اور کوڑا کرکٹ جسمیں نفع رسانی کی صلاحیت نہیں ہوتی نذرِ سیلاب ہو جاتا ہے۔

بقا کا محکم اصول

یہ پہلی مثال ہے۔ دوسری مثال ہے وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ سونے (یا کسی اور دھات کو سنار اپنی کٹھالی میں ڈال کر آگ میں تپاتا اور گلاتا ہے تاکہ اس سے زیور یا اور سامان بنائے۔ تو اسمیں ملا ہوا کھوٹ، جھاگ کی طرح اوپر آجاتا ہے۔ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ اسی طرح خدا کے قانون کے مطابق حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وہ کھوٹ جو جھاگ کی طرح اوپر آ جاتا ہے، رائگاں چلا جاتا ہے۔ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (اور جو چیز نوع انسانی کیلئے منفعت بخش ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ (۱۳/۱۷) اسی طرح اللہ محسوس مثالوں کے ذریعے، مجرد حقائق کی وضاحت کرتا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے بقاء و دوام کے لئے کیا قانون بتایا ہے؟ یہ قانون کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ اسی کلچر اور نظام میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو تمام نوع انسانی کی نفع رسانی کا موجب ہو۔ کسی خاص خاندان۔ خاص گروہ۔ خاص پارٹی۔ خاص جماعت یا خاص قوم کی نفع رسانی کا موجب نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کی نفع رسانی کا موجب۔

میں سمجھتا ہوں سلیم! کہ یہ وہ اصول ہے جسے خورشید کی شعاعوں سے صفحۂ آسمان پر لکھدینا چاہیے تاکہ یہ حقیقت دنیا کی ہر قوم کے سامنے ہر وقت رہے کہ بقاء کا ابدی قانون کیا ہے۔ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔

ہماری باز آفرینی کی صورت ؟

اسکے بعد تمہارا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ذلت و خواری کی جس پستی میں ہم (مسلمان) گر چکے ہیں، کیا ہمارے لئے اس سے نجات کی بھی کوئی صورت ہے یا ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور ہماری باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں! اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔ تم پھر عروج تک پہنچ سکتے ہو۔ بشرطیکہ...... ہاں سلیم! یہ ٹکڑہ بہت غور طلب ہے۔ بلکہ یہی تو اس ساری کہانی کی جان ہے۔ بشرطیکہ... لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند چیزیں تمہیداً سامنے لانا ضروری ہیں۔

تم نے دیکھا ہے کہ قوموں کی موت اور حیات کے معنی ہیں مختلف کلچرز کا باہمی ٹکراؤ۔ قرآن نے مختلف کلچرز کو دو بنیادی شقوں (Categories) میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک کلچر وہ ہے جس میں ایک قوم قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اسے قرآن نے صلٰوۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا کلچر وہ ہے جس میں انسان خود اپنے خیالات اور خواہشات کی اتباع کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرات انبیائے کرام اور ان کی متبع جماعتیں، صلٰوۃ کے کلچر کی حامل ہوتی ہیں جس کا نتیجہ ہر قسم کی شادکامی اور کامرانی ہوتا ہے۔ لیکن پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو جاتے ہیں جو، اس روش زندگی کو چھوڑ کر، دوسرا کلچر اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ سورہ مریم میں مختلف انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ وہ حضرات تھے جنہیں اللہ نے زندگی کی ہر قسم کی آسودگیوں اور خوشحالیوں سے نوازا (اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ) لیکن ان کے بعد

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِہِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّہَوَاتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (۱۹/۵۹) ان کے بعد ایسے

> ناخلف ان کے جانشین ھوگئے جنھوں نے صلٰوۃ کے نظام کو ضائع کر دیا اور اپنے خیالات اور خواھشات ھی کے پیچھے چل پڑے۔ سو ایسا کرنے والوں کی سرکشی کے نتائج ان کے سامنے آکر رھتے ھیں۔

اس سے ظاھر ھے کہ نظام صلٰوۃ کے قیام کا نتیجہ نعمائے زندگی سے سرفرازی ھے اور اسے ترک کر دینے کا انجام ان آسودگیوں سے محرومی۔ اِس اصول کے بعد مسلمانوں کی طرف آیئے! سورۂ فاطر میں ھے کہ اللہ تعالٰے نے رسول اللہؐ کو وحی کے ذریعے اپنا آخری پیغام دیدیا اور حضور کے بعد ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ ھم نے اپنے بندوں میں سے ایک منتخب قوم کو اس کتاب کا وارث بنایا۔ یہ قوم اپنے اولین ایام میں اس نظام کو قائم کرنے میں پیش پیش رھی۔ پھر اگلا دور آیا تو ان کی حالت بَین بَین کی سی ھوگئی۔ اور اس کے بعد یہ بالکل دوسرے راستے پر چل پڑے۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳۵/۳۲)۔ ھم اس تیسرے دور میں ھیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے سورۂ آلِ عمران میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ھے۔ اسمیں پہلے یہ بتایا گیا ھے کہ اسلام کی راہ کون سی ھے اور اسے حضرات انبیاء کرامؑ نے کسطرح اختیار کیا۔ اس کے بعد اس حقیقت کا اعلان ھے کہ فوز و فلاح اور سعادات و برکات کی یہی ایک راہ ھے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (۳/۸۵) جو قوم اس راہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کر لیگی تو اسکی یہ راہ قابل قبول نہیں ھوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ھوگا کہ وہ آخرالامر تباہ و برباد ھو جائیگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سامنے لائی گئی ھے۔ جس میں کہا گیا ھے کہ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ بھلا سوچو کہ خدا اس قوم پر زندگی کی راھیں کس طرح کشادہ کر دیگا جس نے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کر لی ھو وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ حالانکہ ان کی طرف خدا کا واضح ضابطۂ حیات آچکا تھا۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے مشاھدہ کر چکے

تھے کہ ان کے رسول نے اس ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہو کر کس طرح تعمیری نتائج پیدا کرد کھائے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس قوم نے کفر کی راہ اختیار کر لی۔ وَاللّٰہُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ سو ایسی ظالم قوم کو خدا کس طرح سعادتوں کی راہ دکھائے! اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ان کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قوم ان تمام آسودگیوں سے محروم ہو گئی جو نظام خداوندی سے وابستگی سے حاصل ہوتی تھیں۔ اور ان تمام آسائشوں سے بھی محروم ہو گئی جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے ملتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی ذلت و پستی کی وجہ سے دوسری قومیں بھی انہیں اپنے پاس نہیں آنے دیتیں اور دور دور رکھتی ہیں۔ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ اس بنا پر کہ انہوں نے اپنا نام مسلمان رکھ چھوڑا ہے، ان کی اس تباہی میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی انہیں اس سے زیادہ مہلت مل سکتی تھی جتنی مہلت خدا کے قانونِ امہال و تدریج کی رو سے ملا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کی یہ محرومی ابدی اور یہ تباہی ہمیشہ کے لئے ہے یا اس سے رستگاری کی صورت ممکن ہے؟ قرآن کہتا کہ یہ ممکن ہے۔ مندرجہ بالا آیات کے بعد ہے اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳/۸۵-۸۹) ہاں! اگر یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر پچھلے پاؤں مڑ جائیں اور پھر اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے ان کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا۔ اور وہاں پہنچ کر پھر خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو خدا کا قانون اس تباہی و بربادی سے ان کی حفاظت بھی کر دے گا اور ان کی نشو و نما کا پورا پورا سامان بھی مہیا کر دے گا۔ بس یہی انکی باز آفرینی کی صورت ہے۔

دیکھو سلیم! قرآن نے واضع الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اس امت کو جو سرفرازیاں شروع میں نصیب ہوئی تھیں وہ ان بیّنات (قرآن کے واضح قوانین) پر چلنے

کا نتیجہ تھیں جو انہیں خدا کی طرف سے ملے تھے۔ پھر جب انہوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تو یہ ان تمام برکات سے محروم ہوگئے۔

اور اب ان کی بازیابی کی صورت فقط ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ پھر قرآن کے مطابق نظام زندگی متشکل کر لیں۔ اس کے سوا ان کی نشاۃ ثانیہ کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کر لیں۔

کیوں سلیم ! بات آئی سمجھ میں !

اچھا خدا حافظ ! والسلام

جنوری ۱۹۵۷ پرویز

اڑتیسواں خط

..... فقط ایک بار دیکھا ہے!

ھاں سلیم! آسمان کی آنکھ نے ایک مرتبہ وہ دور دیکھا ھے جب ''زمین خدا کے قانون ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھی تھی،، اور انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ خواب زندگی کی تعبیر کیا ھے اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کونسی ھے؟ یہ دور وہ تھا جب محمدؐ رسول اللہ وَالذین معہ' کے ھاتھوں نظام خداوندی کا تختِ اجلال بچھایا گیا اور انسان نے عملاً محسوس کیا کہ حقیقی آزادی کہتے کسے ھیں! اس میں شبہ نہیں کہ اس دور کا عرصہ بڑا مختصر تھا۔ اتنا مختصر جو تاریخ کے پیمانوں کے اعتبار سے آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں کہلا سکتا لیکن اس ایجاز میں وہ تمام تفاصیل سمٹ کر آگئی تھیں جن سے زندگی مرتب ھوتی ھے۔ لیکن ھماری بد قسمتی یہ نہیں کہ اس دور کی مدت اس قدر مختصر تھی۔ بدقسمتی یہ ھے کہ اس دور کی پوری پوری اور بلا آمیزش تاریخ ھمارے سامنے نہیں آئی۔ ھماری تاریخ اس دور میں جا کر مرتب ھوئی جب خلافت، ملوکیت سے اور ربوبیت عامہ، مفاد پرستیوں سے بدل چکی تھی۔ جب قرآن جزدانوں میں بند ھو چکا تھا اور اسلام کی جگہ ان تصورات نے لے لی تھی جو یہودیوں کے ھیکلوں، عیسائیوں کی خانقاھوں اور مجوسیوں

کے آتشکدوں میں تراشے گئے تھے ۔ ظاہر ہے کہ جو تاریخ ان حالات میں مرتب ہوئی ہو اس میں اُس دور کی اصلی تصویر کبھی سامنے نہیں آ سکتی تھی جس دور میں ان تمام تصورات کی بساط اُلٹ کر معاشرہ کی بنیادیں خالص قانون خداوندی پر رکھی گئی تھیں ۔ اُس دور کا جس قدر خاکہ قرآن نے اپنی دفتین میں محفوظ کر رکھا ہے وہی حتمی اور یقینی کہلا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس میں سے صرف وہ حصہ قابلِ قبول قرار پاسکتا ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو ۔ اس لئے کہ جو معاشرہ قائم ہی قرآن کے خطوط پر ہوا تھا اس میں قرآن کے خلاف کچھ ہو نہیں سکتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اس دور کی تاریخ کے لئے قرآن کو بنیادی معیار قرار دیتا ہوں ۔ تم نے ”معراج انسانیت،،* کو دیکھا ہے ۔ اس میں نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کے متعلق کتبِ سیر و روایات میں سے بہت کچھ موجود ہے ، لیکن وہی جو قرآن کے معیار پر پورا اترتا ہے ۔ لہذا ہماری تاریخ میں قرآنی نظام ربوبیت کا مکمل نقشہ کہیں نہیں مل سکتا ۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے ، یہ تاریخ اس عہد میں مرتب ہوئی جب نظامِ ربوبیت کی جگہ سرمایہ پرستی اور ملوکیت کے نظام نے لے لی تھی ۔ اُس وقت نظام ربوبیت کا نقشہ سامنے لایا جاتا تو ہر شخص پکار اٹھتا کہ جو کچھ آج اسلام کے نام پر ہو رہا ہے اُسے تو اسلامی نظام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اس طرح اُس غلط نظام کے حاملین کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہو جاتا ۔ لہذا جو تاریخ اُس دور میں مرتب ہوئی تھی اسمیں اسلام کا نقشہ اسی قسم کا ہونا چاھئے تھا جس پر اُس دور کا نظام پورا اُترتا تاکہ لوگ سمجھ لیتے کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ اسلام کے خلاف نہیں ۔ اس تاریخ میں البتہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ٹکڑے ایسے مل جاتے ہیں جن کی تابندگی نگاھوں میں چمک پیدا کر دیتی ہے ۔ اور جو بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم اس فردوس گم گشتہ کی حسین یادگار ہیں جس سے ”آدم“ نکالا گیا ہے ۔ ان ٹکڑوں میں سے سلیم ! چند ایک کو تم بھی وجہٗ نورانیت قلب و نظر بنا لو ۔ اس سے زیادہ میں تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں ۔

---

* مبسوط تصنیف جس میں سیرت نبی اکرمؐ کو قرآن کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے ۔

حلقه گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل
آتشے در سینه دارم از نیاگانِ شما

ذرا سوچو سلیم! که وہ کونسی چیز ہے جس کی انسان کو سب سے زیادہ خواهش رهتی ہے۔ تم تاریخ کے اوراق کو الٹو۔ اقوام گذشته کے احوال و کوائف پر نظر ڈالو۔ دور حاضرہ کی مختلف تحریکوں کا مطالعه کرو۔ تم دیکھو گے که ایک هی خلش ہے جس نے انسان کو شروع سے آج تک طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ ایک هی تڑپ ہے جس نے اس پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ وہ خلش ہے حصولِ آزادی کی آرزو۔ وہ تڑپ ہے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی تمنا۔ انسان نے همیشه آزادی کی دیوی کی پرستش کی ہے۔ اس کے لئے بڑے بڑے مندر بنائے هیں۔ همیشه اس کے چرنوں میں اپنی شردها کے پھول چڑھائے هیں۔ اس کے حضور اپنی عقیدتمندیوں کے گیت گائے هیں۔ اس کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی هیں۔ اس کے نام پر انسان نے اتنا خون بہایا ہے که اس کا عشر عشیر بھی کسی اور جذبے کے حصے میں نه آیا هوگا۔ انسان نے اسے همیشه اپنی هر متاع سے عزیز سمجھا ہے۔ وہ اس کی حفاظت کی خاطر هر وقت اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے آمادہ رهتا ہے۔ جن لوگوں نے آزادی کے تحفظ کی خاطر قربانیاں کی هیں انسان نے اُن کی یادگاریں قائم کی هیں۔ جو اس کے حصول یا استحکام کے لئے مرے هیں انهیں همیشه امر (غیر فانی) سمجھا ہے۔ یہی کچھ انسان شروع سے کرتا آیا ہے اور یہی کچھ انسان آج بھی کر رها ہے۔ لیکن سلیم! تم یه سن کر حیران هوگے که آزادی کی خاطر یه کچھ کرنے والا انسان آج تک اس چیز کو متعین نهیں کر سکا که آزادی کہتے کسے هیں۔ بظاهر یه بات بڑی اعجوبه سی دکھائی دیگی، لیکن اگر تم ذرا بنگاہِ تعمق غور کرو تو تم خود محسوس کرو گے که آزادی کی کوئی جامع تعریف (Definition) فی الواقعه سامنے نہیں آئی۔ جنہیں یه دعویٰ ہے که ان کے هاں بڑی آزادی ہے، وهاں بھی قدم قدم پر پابندیاں هیں۔ پابندیوں کے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔

سرو کو لاکھ ''آزاد،، کہیں، اس کی ہستی اور بقا کے لئے اس کا پابگل ہونا ناگزیر ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھو سلیم! تو نظر آئیگا کہ انسانی معاشرہ کا بنیادی تقاضا آزادی نہیں، پابندی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان آزادی کی خاطر جان دیتا ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پابندی اور آزادی کے ان دو متضاد اور باہمدگر نقیض تقاضوں میں موافقت اور مطابقت کی صورت کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو ہمیشہ سیاسی مفکرین کے لئے الجھاؤ کا باعث رہا ہے۔ چنانچہ ایک مدت کی ذہنی کشمکش کے بعد ہمارے زمانے کے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آزادی کے معنی ہیں قانون کی اطاعت۔ یعنی انسان کی اطاعت نہیں بلکہ قانون کی اطاعت۔

اگر سلیم! کوئی یہ پوچھے کہ وہ کونسی چیز ہے جو انسان کو دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی تھی اور اسے صرف اسلام نے آکر دیا، تو اس کے جواب میں بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسان کو وہ آزادی عطا کی ہے جو اسے کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے رسول اللہؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۶) آپ کی تشریف آوری کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسانیت کے سر سے اس بوجھ کو اتار دیا جائے جس کے نیچے وہ دبی چلی آرہی تھی اور اسے ان زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ انسان کو انسانوں کی خود ساختہ، اور خود عائد کردہ قیود و سلاسل سے آزاد کرانا، یہ ہے قرآن کا مطلوب۔ اس کے ساتھ ہی سلیم! تم یہ سن کر حیران ہوگے کہ قرآن نے اس سوال کو بھی لا ینحل نہیں رہنے دیا کہ آزادی کسے کہتے ہیں؟ اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے (جب دنیا آزادی کے تصور تک سے آشنا نہ تھی) اس کا اعلان کر دیا کہ آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان سے کسی دوسرے انسان کی اطاعت نہ کرائی جائے۔ ہر شخص قانون کی اطاعت کرے اور قانون بھی انسانوں کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس باب میں یہاں تک کہدیا کہ

اور تو اور خو رسول کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ خود قانونِ خداوندی کی اطاعت کریگا اور دوسروں سے بھی اس قانون کی اطاعت کرائے گا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ
دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ
تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ۔ (۳/۷۸)

> کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم، قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ، میری اطاعت کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہئیے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطۂ قوانین کی رو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پرنقش کرتے ہو۔

لیکن سلیم! کہنے کو تو یہ بڑا آسان ہے (اور آج ساری دنیا یہی کہتی ہے) کہ اطاعت صرف قانون کی ہونی چاہئیے۔ لیکن جب یہ چیز عمل میں آتی ہے تو پھر اس میں ایسی دشواری پیش آتی ہے کہ شاید ہی کوئی مقام ایسا رہ جائے جہاں انسانوں کی اطاعت نہ ہوتی ہو، بلکہ اطاعت صرف قانون کی ہوتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا نفاذ انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے نام تو قانون کا ہوتا ہے لیکن درحقیقت حکومت ان انسانوں کی ہوتی ہے جو قانون کو نافذ کرتے اور اس کے مطابق فیصلے دیتے ہیں۔ لہذا انسانی آزادی میں سب سے بڑا (اور مشکل) مرحلہ یہ ہے کہ قانون کو نافذ کرنے والے، دوسروں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں بلکہ قانون کی اطاعت کرائیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر سمجھو کہ انسان کو صحیح آزادی حاصل ہے۔ ورنہ آزادی صرف نام کی ہوگی۔ انسانوں پر حکومت دوسرے انسان ہی کر رہے ہوں گے۔ اور اسی کا نام محکومی اور غلامی ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ صحیح آزادی کے لئے ضروری ہے کہ قانون کا نافذ کرنے والا اپنی ذات کو قانون سے الگ رکھے۔ قانون کے نفاذ میں اس کے ذاتی میلانات و عواطف کو کوئی دخل نہ ہو۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت کو دوسرے انسانوں سے ذرا بھی ممتاز نہ ہونے دے۔ دوسرے انسانوں کو اس کا خیال تک بھی نہ آنے دے کہ یہ (قانون کا نافذ کرنے والا) ہم سے ذرا بھی اونچا ہے۔ یہ ہے وہ کام سلیم! جو محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ نے کرکے دکھایا۔ جہاں قرآن کریم نے پہلی مرتبہ انسانوں کے سامنے آزادی کا صحیح تصور رکھا، وہاں قرآن کو نافذ کرنے والوں نے بھی پہلی بار دنیا کو یہ ثابت کرکے دکھایا کہ قانون کو نافذ کرنے والوں کو کس طرح اپنی ذاتی حیثیت کو قانون سے یکسر الگ رکھنا چاہئے۔ وہ تھا قرآن کریم کا پیغام، اور یہ تھا قرآن کریم کو نافذ کرنے والوں کا عمل۔ وہ بھی بے مثل و بے نظیر اور یہ بھی بے مثل و بے نظیر۔ یہی ہے وہ نکتہ سلیم! جس کی وضاحت کے لئے میں ان حضرات کے تذکار جلیلہ سے چند بکھری ہوئی پنکھڑیاں وجۂ تزئین اوراق بنانا چاہتا ہوں۔ انہیں غور سے دیکھو۔ بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے واقعات نظر آئیں گے، لیکن ان چھوٹے چھوٹے واقعات میں تمہیں وہ اصولی نکتہ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے گا۔

پہلے ذرا رسول اللہؐ کے مقام کو سامنے لاؤ۔ ان کی سب سے بڑی اور مقدم حیثیت تو یہ تھی کہ وہ خدا کے رسول تھے جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا تھا (نہ ہو سکتا ہے)۔ کسی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر عزت اور عظمت کا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے؟ نیز آپ ایک عظیم الشان مملکت کے صدر اعظم تھے۔ اس منصب امارت میں آپ کی حیثیت یہ تھی کہ آپ کے فیصلے مرکز ملّت کے آخری فیصلے تھے جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی آپ مملکت میں (Final Authority) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ آپ کی ایک حیثیت بشریت کی بھی تھی۔ یہ سہ گونہ حیثیتیں اس ایک ذات میں مرکوز تھیں جس نے نوع انسانی کو سکھانا تھا کہ حقیقی آزادی

کسے کہتے ہیں۔ یعنی یہ سکھانا تھا کہ اطاعت صرف قانون کی ہو سکتی ہے۔ قانون نافذ کرنے والا اپنی ذات کی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ افراد ملّت کے دلوں پر اس حقیقت کو ثبت کر دیا جائے کہ قانون نافذ کرنے والا، اپنی ذاتی حیثیت میں، ان ہی جیسا انسان ہوتا ہے۔ اسے ان پر کوئی فوقیت اور افضیلت حاصل نہیں ہوتی۔ غور کرو کہ حضورؐ نے اس مشکل ترین منصب کو کس طرح نبھایا۔ اور اتنی بڑی بلندیوں پر ہونے کے باوجود، کس طرح قدم قدم پر اس کا خیال رکھا کہ کسی کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ آپ ان ہی میں سے نہیں ہیں۔

دیکھو سلیم! یہ ایک سلطنت کا فرمانروا ہے اور دیوار کے سائے تلے بیٹھا اپنا جوتا گانٹھ رہا ہے۔ ایک رفیق نے کہا کہ لائیے! جوتا میں گانٹھ دوں۔ تو ایک تبسمِ جنت فروش سے فرمایا کہ نہیں! ہر شخص کو اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔

یہ دیکھو! مدینے کے گرد ایک حفاظتی خندق کھد رہی ہے اور عام مسلمانوں کے ساتھ ان کا امیر مملکت بھی مزدوروں کی طرح کام کر رہا ہے۔ مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے اور حضورؐ بھی مٹی اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ جنگل میں کھانا پکانے کا وقت آگیا ہے۔ کسی نے کوئی کام سنبھال لیا ہے اور کسی نے کوئی۔ وہ دیکھو! ایندھن کے لئے سوکھی لکڑیاں کون چن رہا ہے؟ خود رسول اللہؐ!! جو لوگ کسی اپنی ضرورت یا امور مملکت کے ضمن میں مدینے سے باہر ہیں اور ان کے گھروں میں کوئی مرد نہیں رہتا، تو ان کے گھروں کے کام کاج خود حضورؐ جا کر کرتے ہیں۔ بکریوں کو چارہ ڈال رہے ہیں۔ اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہیں۔ ان کے لئے باہر سے پانی لا رہے ہیں۔

دوسرے قبائل کے نمائندے اور سلطنتوں کے وفود آتے ہیں۔ انہیں پہچاننے میں دقت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا امیرالمومنین، سلطنت کا فرمانروا، کون ہے۔ اس دقت کے پیش نظر احباب نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا، تاکہ آپ اس پر بیٹھا کریں۔ آپ نے دیکھا تو غصّے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ اپنے پاؤں سے اس نشست

کو گرا دیا۔ اور کہا کہ تم بھی لگے ھو وھی امتیازات پیدا کرنے جنہیں مٹانے کے لئے میں آیا ھوں۔ تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ھے، آنے والے اس کو تختِ سلطنت میں تبدیل کر دیں گے۔

لوگ آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ھو گئے تو انھیں ڈانٹ کر کہا کہ تم بھی لگے وھی کچھ کرنے جو قیصر و کسریٰ کے ھاں ھوتا ھے؟ کسی نے ایک مرتبہ خطاب کرتے ھوئے کہدیا یا سیّدنا! تو فرمایا کہ سیّد (آقا) صرف خدا کی ذات ھے۔ میں اس کا ایک بندہ ھوں۔

کچھ لوگوں نے آپ کے وضو کا مستعمل پانی، فرطِ عقیدت سے اپنے چہرے پر ملنا چاھا تو آپ نے سختی سے روک دیا اور فرمایا کہ تم یہ کیا کرنے لگے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اظہار محبت کا طریق ھے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے محبت ھے تو سچ بولا کرو۔ امانتوں کی حفاظت کیا کرو، اور اپنے عہدؔو پیمان کا خیال رکھا کرو۔ یہ ھے سچی محبت اور حقیقی تعظیم!

کسی کے ھاں دعوت میں جا رھے تھے۔ چار آدمیوں کی دعوت تھی۔ راستے میں ایک اور آدمی یوں ھی ساتھ ھو لیا۔ آپ نے میزبان کے ھاں پہنچکر اس سے کہا کہ یہ صاحب اس طرح میرے ساتھ آگئے ھیں۔ اگر تم اجازت دو تو اسے کھانے پر ساتھ بٹھا لیا جائے، ورنہ رخصت کر دیا جائے۔

سلیم! بظاھر یہ باتیں بڑی چھوٹی چھوٹی ھیں (اور میں نے دانستہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتخاب کیا ھے) لیکن ان کی اھمیت کا اندازہ لگانا ھو تو آج کسی افسر، کسی مولوی صاحب، یا کسی پیر صاحب کی روزمرہ کی زندگی میں ان ھی جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھو۔ دونوں کا فرق نمایاں طور پر سامنے آ جائیگا۔ حقیقت یہ ھے کہ انسانی سیرت و کردار کا صحیح مطالعہ ھوتا ھی روز مرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ھے۔ اب ذرا آگے بڑھو۔

مقدمات سنتے تو فریقین سے کہدیتے کہ میں ایک انسان ھوں۔ میرا فیصلہ لا محالہ تمہارے بیانات ھی پر مبنی ھوگا۔ اس لئے اگر کسی نے غلط بیانی سے مجھ

سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیا تو اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ حقیقت حال کو خدا سے نہیں چھپا سکے گا۔ دیکھا سلیم! تم نے کہ حاکم ہونے کے ساتھ ہی کس طرح عوام کے دل سے اس اثر کو زائل کر دیا کہ حاکم، عام انسانوں سے کچھ الگ ہوتا ہے۔

اسی قبیل سے ایک اور واقعہ ہے۔ عربوں میں یہ رواج چلا آرہا تھا کہ وہ ایک خاص موسم میں نر کھجوروں کا گابھا مادہ کھجوروں میں لگاتے تھے جس سے پھل بہت اچھا آتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے اُن سے کہا کہ گابھا یوں نہیں، یوں لگاؤ۔ انہوں نے اس کی تعمیل کی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس سال کھجوروں میں پھل ہی نہ آیا۔ لوگ متعجب تھے کہ یہ کیا ہوا۔ آپ نے ان سے کسی توقف یا جھجک کے بغیر کہدیا کہ میرا اندازہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے پھل زیادہ آئے گا۔ لیکن نتیجہ نے بتا دیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ اس لئے آئندہ تم سابقہ قاعدے کے مطابق ہی عمل کیا کرو۔

یہاں تک تو خیر قیاسات و آراء ہی کا سوال تھا۔ ایک صاحبِ اختیار کے لئے وہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے جہاں اس کے ذاتی جذبات و مفادات درمیان میں آجائیں۔ ایسے مقامات میں اپنی ذات کو الگ رکھنا صحیح حریت کا ثبوت دینا ہے۔ وہ دیکھو سلیم! جنگ بدر کے قیدی رسّیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں حضورؐ کے چچا، عبّاس بھی ہیں۔ وہ سِن رسیدہ ہیں اس لئے تکلیف سے کراہ رہے ہیں۔ ان کے کراہنے کی آواز سے آپ کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ چہرے کی افسردگی، دل کی کیفیت کی غماز ہو جاتی ہے۔ رفقاء کی دِقتِ نظر اس اندرونی کشمکش کو بھانپ لیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چچا کے کراہنے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا۔ عرض کیا گیا کہ (حضرت) عباس کی رسیاں ڈھیلی کردی گئی ہیں۔ یہ سن کر غصے سے چہرہ تمتما اُٹھا اور فرمایا کہ تم نے ان کی رسیاں اس لئے ڈھیلی کر دیں کہ وہ میرے چچا ہیں؟ تم نے قانون کے مقابلے میں رشتہ داری کی رعایت ملحوظ رکھ لی؟ تم نے بہت برا کیا۔ یا تو تمام قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کرو اور یا پھر عباس کی رسیاں بھی اسی طرح کس کر باندھو۔

اور آگے بڑھو سلیم! ان ہی قیدیوں میں آپ کے داماد (ابوالعاص) بھی تھے۔ مشورہ کیا گیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے (ابھی تک جنگی قیدیوں کے متعلق قرآن کا حکم نازل نہیں ہوا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو یا تو زر فدیہ لیکر (یا تبادلہ میں) رہا کردو، یا پھر احسان رکھ کر چھوڑ دو)۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور ہر قیدی کا رشتہ دار اسے خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

سوچو سلیم! کہ یہ گھڑی کس قدر نازک تھی؟ بیٹی کا سہاگ لُٹ رہا ہے اور اُسے خود اپنے ہاتھوں سے بیوہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ قانون کا فیصلہ تھا اس لئے اس میں نہ کوئی تامل ہوتا ہے نہ تردد۔ نہ بیٹی کی محبت عناں گیر ہوتی ہے، نہ اس کے مستقبل کے مصائب دامن کش۔ (یہ الگ بات ہے کہ اسی مجلسِ مشاورت نے اپنے سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی کرکے ان قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر رہا کر دینے کا فیصلہ کر دیا)۔

یہاں سلیم ایک اور واقعہ سامنے آتا ہے جسے لکھتے وقت دل لرز جاتا ہے اور ہاتھ کانپ اٹھتے ہیں۔ ان قیدیوں کا زرِ فدیہ مانگا گیا۔ محمدؐ کی بیٹی (حضرت زینب) نے اپنے خاوند کا زرِ فدیہ بھیجا۔ وہ زرِ فدیہ کیا تھا؟ کانچ کا ایک پرانا ہار۔ تمہیں معلوم ہے سلیم! کہ یہ ہار کونسا تھا؟ برسوں پہلے، جب رسول اللہؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی ہے تو آپ نے وہ سادہ سا ہار بیوی کو شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ اس کے بعد جب (حضرت) زینب کی شادی ہوئی تو ماں نے بیٹی کو وداع کرتے وقت وہی ہار اس کے گلے میں ڈال دیا اور آج وہی ہار بیٹی نے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے بطور زرِ فدیہ بھیجدیا اور اس طرح تمام گذشتہ واقعات کی یاد محبوب باپ کے دل میں تازہ کردی۔

ہار سامنے متاعِ فدیہ کے ڈھیر میں پڑا ہے اور رسول اللہؐ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں اور گذری ہوئی داستانیں ایک ایک کر کے سنیما کے فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے چلی آ رہی ہیں۔ (حضرت) خدیجہؓ

جیسی بیوی جس نے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ایسی مومنۂ صادقہ۔ ایسی جان نثار بیوی۔ ایسی پیکرِ محبت و خلوص رفیقۂ حیات۔ پچیس سالہ رفاقت کی زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آتے گئے۔ دل میں جذبات کا طوفان اُمنڈا، اس کا ایک قطرہ، ستارۂ صبحگاھی کی طرح سرِمژگاں چمکا اور مقدس رخساروں پر زمزم بار و کوثر فروش ھو گیا۔ اس کانچ کے ھار کی قیمت ھی کیا تھی لیکن اس میں گذری ھوئی زندگی کی حسین و تابناک یادوں نے ایک کائنات سمٹی ھوئی تھی۔

وہ چار سو کھرے ھوئے تنکے یوں تو کیا تھے، مگر
قفس میں آ ھی گئی یاد آشیانے کی

دل میں جذبات کے تلاطم سے ایک حشر بپا تھا لیکن لب بند تھے۔ بہ حیثیت امیر المؤمنین آپ کو یہ حق حاصل تھا کہ اس زرِ فدیہ کی تقسیم جس طرح چاھتے کر دیتے۔ لیکن اس ھار کے ساتھ چونکہ اپنے ذاتی جذبات وابستہ تھے اس لئے آپ یہ نہیں چاھتے تھے کہ اپنی مرضی سے اسے خود لے لیں یا بیٹی کو واپس بھیجدیں۔ ھار اب ملّت کی متاع تھا اور آپ اس کے امین تھے۔

کچھ سمجھتے ھو سلیم! یہ کیا مقامات ھیں؟ اور سنو! فتح مکہ کے بعد، مخالفین قریش ایک ایک کر کے سامنے پابجولاں کھڑے ھیں۔ یہ وہ ھیں جنہوں نے آپ کی (نبوت کی) مکی زندگی کے تیرہ برس میں آپ کو اسقدر تکالیف بہم پہنچائیں جن کے تصور سے روح لرزتی ھے۔ پھر جب مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے گئے تو وھاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پیہم لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج یہ سب مفتوح و مغلوب قیدیوں کی حیثیت سے سامنے کھڑے ھیں۔ رواج، قاعدے اور قانون کے مطابق ان کی سزا موت تھی۔ لیکن یہ اسلام لے آئے تو ساری تقصیریں معاف ھو گئیں۔ ان کا کوئی جرم باقی نہ رھا۔ حتّٰی کہ ان میں وحشی بھی تھا جس نے آپ کے عزیز چچا (حضرت حمزہؓ) کو نہایت درندگی سے شہید کر دیا تھا اور ابنِ اسود بھی، جس نے آپ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو نیزہ سے ایسا زخمی کیا تھا

کہ آپ بمشکل جانبر ہوسکی تھیں - لیکن جب آپ نے سب سے کہدیا کہ لاتثریب علیکم الیوم (تمہارے سب جرم معاف ہیں) تو پھر اپنا ذاتی انتقام بھی باقی نہ رکھا اور اسے بھی معاف کر دیا -

تمہیں شاید معلوم ہے سلیم ! کہ جب حضورؐ مکّہ میں تھے تو قریش نے آپ کا اور آپ کے ساتھ آپ کے اہل خاندان کا اس طرح بائیکاٹ کر دیا تھا کہ آپ پر کھانے پینے کی چیزوں کے راستے بھی بند ہو گئے تھے - تین سال تک آپ اور آپ کے اہل خاندان اس جانکاہ مصیبت میں مبتلا رہے - جب آپ مدینہ تشریف لے گئے میں تو یمامہ کا رئیس مسلمان ہو گیا - اہل مکّہ کا غلّہ یمامہ سے آیا کرتا تھا - اس نے قریش کی اس حرکت کے جواب میں غلّہ روک دیا - اور قریش لگے بھوکوں مرنے - آپ نے سنا تو یمامہ کے رئیس کو فوراً کہلا بھیجا کہ ہم نوعِ انسانی پر ربوبیت (پرورش) کے دروازے کھولنے کے لئے آئے ہیں - ان کا رزق بند کرنے کے لئے نہیں آئے - اس لئے غلّہ کو مت روکو - قریش میں کوئی بھوکا نہ رہنے پائے -

غور کیا تم نے سلیم ! کہ کس طرح ذاتی جذباتِ انتقام کو اصول و آئین سے یکسر الگ رکھا جاتا ہے اور کسی اصولی فیصلہ کو ان سے متاثر نہیں ہونے دیا جاتا ؟ یہی وہ حریت آموز تعلیم و تربیت تھی جس سے دست پروردگان نبوت میں صحیح آزادی کی روح پیدا ہو گئی تھی - اور ان کی کیفیت یہ ہوچکی تھی کہ جس معاملے میں انہیں ذرا بھی اختلافِ رائے ہوتا وہ اپنی رائے کو بلا تامل و توقف پیش کر دیتے - ادھر ان کہنے والوں کی جرأت کی یہ کیفیت تھی اور ادھر اس سننے والے کی کشادہ نگہی اور وسعت ظرف کا یہ عالم کہ کیا مجال جو اس اختلاف پر ذرا بھی پیشانی پر بل آنے پائے - جنگ بدر کے موقع پر آپ نے لشکر کے لئے ایک مقام تجویز کیا - ایک رفیق (حضرت خبابؓ) نے پوچھا کہ یہ فیصلہ وحی کی رو سے ہوا ہے یا آپ کی ذاتی رائے ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں ! میں نے خود ہی ایسا سمجھا ہے - اس پر انہوں نے کہا کہ میں اس نواح کا رہنے والا ہوں - یہاں کے

نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہوں ۔ یہ مقام ہمارے لئے ٹھیک نہیں ۔ ہمیں فلاں مقام پر جا کر ڈیرے ڈالنے چاہئیں ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ درست ہے ۔ تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو ۔ تمہاری رائے زیادہ صائب ہے ۔ اور اس کے بعد فوج کو کوچ کرنے کا حکم دیدیا ۔

یہ آزادی صرف آپ کے رفقائے کار تک ہی محدود نہ تھی ۔ اس فضا میں ہر سانس لینے والے کا یہی عالم تھا ۔ مدینہ میں ایک لونڈی تھی بریرہ نامی ۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر الگ ہو گئی ۔ اُس شخص کے کہنے پر آپ نے بریرہ سے کہا کہ تم اس کے پاس چلی جاؤ ۔ ذرا فریقین کی پوزیشن کو سامنے رکھو سلیم ! کہنے والے ہیں محمد رسول اللہ ؐ ۔ اسلامی مملکت کے واحد فرماں روا ۔ مدینہ کے حاکم ۔ امیرالمؤمنین ۔ اور کہا جا رہا ہے ایک لونڈی سے ۔ کیا اس لونڈی کی جرأت ہو سکتی تھی کہ سامنے سے لب کشائی کر سکے ؟ لیکن وہاں تو تربیت ہی ایسی کی گئی تھی کہ لونڈیاں تک اپنے مقامِ انسانیت سے واقف ہو چکی تھیں ۔ بریرہ نے کہا کہ آپ کا یہ حکم وحی کی رو سے ہے یا اپنا ذاتی ارشاد ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی سفارش ہے ۔ اس پر بریرہ نے کہا کہ پھر آپ معاف فرمائیے ۔ میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں ۔ میں اس کے پاس رہنے کے لئے تیار نہیں ۔ اور آپ تبسم فشاں تشریف لے گئے ۔

اسی قبیل کا ہے سلیم ! وہ نازک ترین واقعہ جسے قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے ۔ غور سے سنو کہ وہ کونسا واقعہ ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اسے ابدیت درکنار کر دیا گیا ہے ۔

حضرت خدیجہ رضؓ کے پاس ایک لڑکا (غلام) تھا زید ۔ انہوں نے وہ غلام حضور ؐ کو دیدیا ۔ آپ نے اسے غلامی سے آزاد کر دیا ۔ اُس کے بعد اسے وہ بلند مقام عطا فرمایا کہ وہ آپ کا منہ بولا بیٹا مشہور ہو گیا ۔ غلامی کی پستیوں سے اٹھا کر یہ مقام بلند ! سبحان اللہ ! !

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

لیکن (حضرت) زیدؓ کی رفعتِ مدارج یہیں تک پہنچ کر نہیں رُک گئی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھی۔ حضورؐ نے ان کی شادی بنو ہاشم کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتونِ محترم، خود اپنی پھوپھی زاد بہن سے کر دی۔

ایک غلام اور اس کی شادی قریش کے بلند ترین گھرانے کی لڑکی سے! سارے عرب میں اس کی مثال نہیں تھی۔ ان کی تاریخ اس سے نا آشنا تھی۔ سب نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہوا۔ جگہ بجگہ اس کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن آپ احترامِ آدمیت اور مساواتِ انسانی کے جس انقلابِ عظیم کو لیکر آئے تھے اس کے پیشِ نظر آپ کو عملی مثال قائم کرنی تھی۔ آپ نے یہ بتانا تھا کہ انسان کی پیدائش محض ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ اس کی بنا پر نہ کسی کو کوئی (Advantageous Position) حاصل ہونی چاہئیے اور نہ اسے کسی قسم کا (Disadvantage) ہونا چاہیئے۔

ان حالات میں یہ شادی ہوئی۔ لیکن سوءِ اتفاق دیکھئے کہ میاں بیوی میں ناموافقت ہو گئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ حضرت زید نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔

بنو ہاشم کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتون!

خود رسول اللہؐ کی پھوپھی زاد بہن!!

اس لئے یہی چیز کچھ کم ”باعثِ ہتک“ نہ تھی کہ اس کی شادی ایک غلام سے کر دی گئی، کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ غلام اسے طلاق دے رہا ہے!

تم سوچو سلیم! کہ اس سے رسول اللہؐ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ یہ شادی سارے عرب کے رسم و رواج کے خلاف کی گئی تھی۔ خویش و اقارب کی مخالفت

کے علی الرغم کی گئی تھی۔ مخالفت کرنے والے شروع ھی سے کہتے ھونگے کہ یہ ایک انوکھی بات ھو رھی ھے۔ ایسا انمل جوڑ کبھی کامیاب نہیں ھو سکے گا! تم نے دیکھ لینا کہ یہ رشتہ نبھ نہیں سکے گا۔

اب یہ تمام مخالفین چشم براہ ھونگے کہ کس دن یہ ناطہ ٹوٹے اور ھم کہہ سکیں کہ —— کیوں! ھم نہ کہتے تھے؟

ان حالات میں رسول اللہؐ زید کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ زید! امسک علیک زوجک۔ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

یہ کہنے والا کون ھے سلیم!

وہ رسولؐ جس پر ایمان لانے سے زیدؓ کو شرف اسلام حاصل ھوا۔

وہ امیر جس کی مملکت میں زیدؓ ایک رعیت کی حیثیت سے رھتے ھیں۔

وہ محسن اعظم جس نے زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔

وہ جو زیدؓ کے لئے بمنزلہ باپ کے ھیں۔

وہ جنھوں نے زید کی شادی اتنے اونچے گھرانے میں کی اور اس طرح اسے سوسائٹی میں ایسا بلند مقام عطا کر دیا۔

یہ ھیں کہنے والے! اور کہا یہ ھے کہ زید! میری بہن کو طلاق مت دو۔ زیدؓ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ تم سوچتے ھوگے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ھی کہاں باقی تھی۔ لیکن اس کی گنجائش آج باقی نہیں۔ اس وقت باقی تھی۔ زیدؓ نے پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ھے یا حضورؐ کی ذاتی سفارش ھے؟ اور جب معلوم ھوا کہ یہ آپ کی ذاتی سفارش ھے تو انھوں نے یہ کہکر کہ میاں بیوی کے معاملات کو میاں بیوی ھی بہتر سمجھ سکتے ھیں، اپنے فیصلے کو بحال رکھا اور بیوی کو طلاق دیدی۔

اس کے بعد کیا ھوا؟ اس کے لئے ذرا تصور میں لاؤ اپنے معاشرہ کو اور سوچو کہ ایسا حادثہ کہیں آج پیش آجائے تو اس کا انجام کیا ھو؟ آج اگر اس

قسم کا واقعہ کسی ایسے شخص سے پیش آجائے جس نے اُس طلاق دینے والے پر کبھی کوئی احسان کیا ہو تو تم دیکھو گے کہ وہ کسطرح وہیں کھڑے کھڑے ہزار گالیاں دیتا ہے اور پھر ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتا ہے کہ ”نمک حرام، احسان وش، کمینہ، رذیل! ہم نے اس پر اتنے احسانات کئے اور آج ہمیں ان کا بدلہ یہ مل رہا ہے۔ سچ کہ گیا ہے سعدی کہ

نکوئی با بداں کردن چناں است
کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

بچھو کی فطرت میں ڈنگ مارنا ہوتا ہے۔ اس سے اور توقع ہی کیا کی جاسکتی تھی،،

اور اگر کسی باپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آجائے تو اسی وقت بیٹے کو گھر سے نکال دے اور اسے جائیداد سے عاق کر دے اور کہدے کہ ساری عمر میرے سامنے نہ آنا اور مرنے کے بعد میرے جنازے کے ساتھ بھی نہ جانا۔ تم تو نوح (علیہ السلام) کے بیٹے ہو جس نے خاندان نبوت کو داغ لگا دیا تھا۔

اور اگر کسی مذہبی پیشوا (مولوی صاحب یا پیر صاحب) کے ساتھ یہ کچھ ہو تو پھر اس غیض و غضب کا اندازہ لگاؤ جس کا مظاہرہ ان کے منہ کی جھاگ اور گالیوں کی بوچھاڑ سے ہو رہا ہو گا۔ طلاق دینے والے پر ”خدا کی رحمت اور رسول کی شفاعت،، سب حرام ہو جائیگی اور اسے سیدھا ”جہنم رسید“ کر دیا جائیگا۔

اور اگر کہیں (خدانکردہ) ایسا معاملہ کسی حاکم یا افسر سے ہو جائے تو وہ آخرت کا بھی انتظار نہ کرے گا۔ اس ماتحت کو یہیں سیدھا جہنم پہنچا دے گا۔

لیکن اُس محسن، اُس باپ، اُس مذہبی راہ نما، اُس حاکم، اور افسر نے کیا کہا؟ کہا یہ کہ جب قانون خداوندی نے تمہیں اس کا اختیار دیا ہے تو اس میں کوئی اور مداخلت نہیں کر سکتا۔ اگر تمہارا فیصلہ یہی ہے تو اس میں کوئی بات وجۂ ناراضگی نہیں۔ بہت اچھا!

اور اس کے بعد (حضرت) زیدؓ عمر بھر اسی خوشگواریٔ تعلقات کے ساتھ

حضورؐ کے پاس رہے۔ نہ باہمی روابط میں کوئی فرق آیا اور نہ ھی دلوں میں کوئی بُعد پیدا ھوا۔ (حضرت) آسامہؓ ان ھی (حضرت) زیدؓ کے بیٹے تھے جنہیں نبی اکرمؐ نے اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا جسے آپ نے آخری مرتبہ ترتیب دیا تھا اور جس میں بڑے سے بڑے جلیل القدر صحابہؓ بطور سپاھی کام کر رہے تھے۔

دیکھا سلیم! تم نے قانون کی اطاعت اور قانون نافذ کرنے والے کی ذاتی حیثیت میں کس طرح فرق کیا جا رہا ھے؟ یہ تھی صحیح حریت جس سے انسانیت لذت یاب ھوئی تھی۔ کہو! تمہیں اس کی نظیر کہیں اور بھی ملتی ھے؟ نظر دوڑا کر دیکھو تو سہی! نگاہ کس طرح کا شانۂ چشم میں خاسر و نامراد واپس آجاتی ھے۔ ینقلب الیک البصر خاسرًا وھو حسیرا۔

اب اسی بساط کا ایک اور گوشہ سامنے لاؤ۔ نظام ربوبیت کا دوسرا بنیادی اصول یہ ھے کہ سامانِ زیست (مال و دولت) میں ارباب حل و عقد اور دیگر افراد مملکت میں کوئی فرق نہ ھو۔ اگر فرق ھو تو یہ کہ اس میں ارباب حل و عقد کا حصّہ سب سے کم ھو۔ یہ باتیں تو تم نے سلیم! اکثر سنی ھوں گی کہ نبی اکرمؐ بڑی غریبی کی زندگی بسر فرمایا کرتے تھے۔ گھر میں کوئی سازوسامان نہ تھا۔ کئی کئی دنوں چولھا گرم نہیں ھوا کرتا تھا۔ کپڑوں میں پیوند لگے ھوتے تھے۔ تمہیں یاد ھوگا کہ تمہارے محلّے کی مسجد کے مولوی صاحب (میں ان کا نام بھولتا ھوں اس وقت! بھلا سا نام تھا۔ خیر!) ان تمام باتوں کو کس رقت کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وعظ میں خود بھی رویا کرتے تھے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رلایا کرتے تھے۔ لیکن اصل چیز جس سے یہ اتنی بڑی حقیقت نہ صرف پیوند خاک ھو کر رہ جاتی ہے بلکہ اسلام کے متعلق ایک نہایت خطرناک اور گمراہ کن تصور پیدا کر دیتی ھے وہ ھے جہاں اُن کے وعظ کے مقطع کا بند آیا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ آپ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ اُن میں سے ایک کو پسند کر لیجئے تو آپ نے آخرت کو پسند کر لیا اور دنیا کو چھوڑ دیا۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ تصور کس قدر اسلام کے تصور کے خلاف ھے؟ یہ

تصور، خالص عیسائیت کا خانقاہی تصور ہے جس میں زمین کی بادشاہت، قیصر کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے اور ''آسمان کی بادشاہت'' خدا کے مقرب بندوں کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اسلام کا تصور، زمین اور آسمان (دنیا اور آخرت) دونوں کی بادشاہتیں حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ دنیا کفار کے لئے چھوڑ دی جائے اور خود غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کرکے آخرت سنواری جائے۔ نبی اکرمؐ کی ''غریبی'' کی وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کی تمام عمر نظام ربوبیت کے قیام میں گزری۔ اس نظام کی اولین کڑی یہ ہے کہ تمام افراد مملکت کی ضروریاتِ زندگی (رزق) کی ذمہ داری نظام اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس کے لئے اس نظام کا مرکز (میر ملّت) اپنے آپ کو سب سے پیچھے رکھتا ہے۔ یعنی وہ نہیں کھاتا جب تک اس کا اطمینان نہ ہو جائے کہ تمام افراد مملکت کا پیٹ بھر گیا ہے۔ وہ نہیں پہنتا جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ ہر فرد کو کپڑا نصیب ہو گیا ہے۔ جس کے سر پر اتنی بڑی ذمہ داریاں ہوں وہ کس طرح مرغ پلاؤ کھا سکتا ہے اور کیسے کمخواب و ابریشم پہن سکتا ہے؟ یہ تھی وجہ جس کی بنا پر رسول اللہؐ اس عسرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ نہ یہ کہ آپ کو دنیا سے نفرت تھی۔

نبی اکرمؐ کے بعد، جب اس نظام کی ذمہ داریاں حضرت ابوبکرؓ کے کندھوں پر آئی ہیں تو یہی کیفیت آپ کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن دیکھا کہ آپ کپڑے کی گٹھڑی سر پر اٹھائے بازار میں چلے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ کپڑا بیچنے جا رہا ہوں تا کہ اپنی اور بیوی بچوں کی روٹی کی فکر کر لوں۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ کا سارا وقت ملّت کی ملکیت ہے۔ اسے آپ اپنی ضروریات کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ آپ پورا وقت اُدھر دیجئے اور بیت المال میں سے اپنے گزارہ کے لئے لے لیجئے۔ بڑے تامل اور توقف کے بعد آپ راضی ہوئے۔ اب سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کو اپنے گزارے کے لئے کس قدر لینا چاہیئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے سوچ کر کہا کہ مدینے میں ایک مزدور کم از کم کیا کماتا ہے؟ جب معلوم ہوا تو فرمایا کہ بس! یہ ہے خلیفہ کا روزینہ۔ افراد مملکت میں سب سے کم

آمدنی۔ اور جب پوچھا گیا کہ اس میں گذارہ کیسے ہوگا؟ تو فرمایا کہ اب خلیفہ خود کوشش کرے گا کہ مزدور کی اجرت زیادہ ہو جائے۔ یعنی اس کا معیار زندگی (Standrd of Living) بلند ہو جائے۔

تم نے حضرت ابوبکرؓ کا وہ واقعہ تو سنا ہی ہوگا سلیم! کہ آپ نے ایک دن بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو کھانے کے ساتھ دے دو۔ جواب نفی میں ملا۔ چند دنوں بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کھانے کے ساتھ آٹے کا حلوہ بھی ہے۔ پوچھا کہ اُس دن تو تم نے نا کر دی تھی۔ اب یہ میٹھا کہاں سے آ گیا۔ جواب ملا کہ بیت المال سے راشن میں جس قدر آٹا آتا ہے، میں اُس میں سے ایک مٹھی بھر آٹا ہر روز لگ نکال لیا کرتی تھی۔ جب تھوڑا سا آٹا جمع ہو گیا تو میں نے اُس کا میٹھا خرید لیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ اٹھے اور جا کر راشن تقسیم کرنے والے سے کہا کہ ہمارے گھر میں جس قدر آٹا روز جاتا ہے اس میں سے ایک مٹھی کی کمی کر دو کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ایک مٹھی کم آٹے میں بھی ہمارے گھر والوں کا گزارہ ہو جاتا ہے۔

یہ کچھ تھا جسے خلیفۃ المسلمین (یعنی نظام ربوبیت کے قیام کا ذمہ دار) بیت المال میں سے اپنا حق سمجھا کرتا تھا۔ اور اس کے باوجود جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو بیٹے سے کہا کہ اب میں خدا کے سامنے جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں کہ میں نے بیت المال سے جس قدر لیا ہے اس کے مطابق بندگان خدا کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہ بوجھ اپنے سر پر نہ ہی لے کر جاؤں تو اچھا ہے۔ تم مکان کو بیچ دو اور جو کچھ میں نے بیت المال میں سے لیا ہے اسے بیت المال میں داخل کر دو۔

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ سلسلہ اور بھی وسیع ہو گیا تھا۔ سلطنت کا رقبہ بائیس لاکھ مربع میل تھا۔ ایک عراق کی مال گزاری گیارہ کروڑ درہم سالانہ

تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی افراد مملکت کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اور اسی نسبت سے ربوبیت کی ذمہ داریاں بھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور بھی زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ ایک جوڑا کپڑے سردی کے لئے۔ ایک جوڑا گرمی کے لئے اور مزدور کی اجرت کے مطابق روزینہ۔ ایک دن آپ گھر میں تھے۔ لوگ باہر انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد باہر آئے تو لوگوں نے شکایت کی کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ فرمایا کہ اس کا ذمہ دار یہ کُرتا ہے۔ اسے دھو کر سکھانے کے لئے ڈال رکھا تھا۔ یا سوکھتا نہیں تھا اور دوسرا کرتہ تھا نہیں جسے پہن کر میں باہر آجاتا۔

بیمار ہو گئے تو دوائی کے لئے شہد کی ضرورت پڑی۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن اُسے از خود کس طرح استعمال کر لیتے؟ مجلس مشاورت طلب کی اور ان کی اجازت سے شہد لیا۔

ایک دن (غالباً) مصر کا گورنر آیا۔ دیکھا تو آپ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ فرمایا کہ کیا ہمارے ہاں اتنا گیہوں آجاتا ہے کہ ہر فرد مملکت کو گیہوں کی روٹی مل جائے؟ اس نے کہا کہ اتنا تو نہیں لیکن پھر بھی کافی گیہوں ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ امیرالمومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل جائے۔

ایک مرتبہ قحط پڑ گیا تو ارد گرد کی ساری آبادی سمٹ کر مدینے میں جمع ہو گئی۔ اس کا علاج کیا سوچا گیا؟ حکم دیدیا کہ مدینہ میں کوئی فرد اپنے گھر میں کھانا نہیں کھائے گا۔ نہ ہی کسی کے ہاں انفرادی طور پر کچھ پکے گا۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے سب ایک جگہ جمع ہوگا اور سب کو ان پناہ گزینوں کے ساتھ مل کر ایک دسترخوان پر کھانا ہوگا۔ اس حکم کی تعمیل میں امیرالمومنین کا گھرانا پیش پیش تھا۔ مسلسل فاقوں اور موٹی جھوٹی روٹی کھانے سے آپ بیمار ہو گئے۔ گھی کی جگہ زیتون کے تیل کے استعمال سے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاءؓ نے

کئی مرتبہ کہا کہ آپ نسبتاً اچھی غذا کھائیے۔ ملّت کو آپ کی صحت کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ یہ سنتے تو انہیں یہ کہکر خاموش کر دیتے کہ

خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دیکھا کہ آپ کا پوتا خربوزہ کھا رہا ہے۔ اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ رض) کو بلایا اور کہا کہ مسلمانوں کے بچے روٹی کے ٹکڑے کو ترس رہے ہیں اور عمر رض کا پوتا پھل کھا رہا ہے۔ اس کا کوئی جواب تمہارے پاس ہے؟ انہوں نے کہا کہ بچے کو صبح (عام بچوں کے ساتھ) جو کجھور کی گٹھلیاں ملی تھیں اس نے ان کے عوض ایک بدّو لڑکے سے خربوزہ لے لیا تھا۔ یہ ہے حقیقت اس "میوہ خوری" کی، ورنہ عمر رض کے گھر والوں کو بھی وہی کچھ مل رہا ہے جو قحط زدہ مسلمانوں کو ملتا ہے۔ یہ تھا احتیاط کا عالم اور اس کے باجود احساسِ ذمّہ داری کی یہ کیفیت کہ حضرت عبداللہ بن عمر رض کی روایت کے مطابق

> قحط کے زمانے میں حضرت عمر رض عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے مکان میں داخل ہوتے اور آخر شب تک برابر نماز پڑھتے۔ پھر نکلتے اور پہاڑی راستوں پر گھومتے (تاکہ تمام لوگوں کی خبر گیری کر سکیں)۔ ایک رات میں نے انہیں یہ دعا کرتے سنا کہ اے اللہ! امّت محمدیہ ص کی ہلاکت میرے ہاتھوں پر نہ کر۔

وہ لوگوں کے غم میں اس قدر نڈھال تھے کہ حضرت اسامہ رض بن زید کے بیان کے مطابق صحابہ رض کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر قحط رفع نہ ہوا تو عمر رض مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے۔

جیسا کہ تمہیں معلوم ہے سلیم! نظام ربوبیت میں تمام افراد مملکت کے رزق کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔ اس کے لئے انتظام یہ تھا کہ ہر شخص کا وظیفہ مقرر ہوتا تھا جو اس کی ضروریات کی کفالت کرتا تھا۔ بچوں کا وظیفہ اس وقت شروع ہوتا تھا جب وہ دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔ حضرت عمر رض کا قاعدہ تھا کہ

رات کے وقت، جب سارا عالم سوتا تھا، وہ چپکے ہی چپکے گشت لگاتے تاکہ افراد مملکت کے حالات معلوم کر سکیں۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ ایک خیمے سے بچے کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ اس کی ماں اسے سلانے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ سوتا نہیں، روئے چلا جاتا ہے۔ جب بچے کو روتے روتے کافی وقت ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے آواز دیکر پوچھا کہ بچے کو کیا ہوا ہے، سوتا کیوں نہیں ہے؟ عورت کو یہ معلوم نہ تھا کہ پوچھنے والا کون ہے؟ وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ جھنجلا کر یوں بولی، جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ”ہوا ہے عمر کا سر“۔ آپ نے کہا کہ بچے کے رونے میں عمر کہاں سے آگیا؟ اس نے کہا کہ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ دودھ چھوڑنے پر شروع ہوگا۔ میں بچے کا دودھ چھڑا رہی ہوں اور یہ بھوک سے روتا ہے۔ اس لئے سوتا نہیں۔

صبح کی نماز میں نمازیوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ رو رہے ہیں اور روتے روتے ان کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا اللہ! عمر کو معاف کردینا۔ نمعلوم اس کے اس غلط حکم نے کتنے بچوں کو بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار ڈالا ہوگا۔ اس کے بعد اعلان کردیا کہ بچوں کا وظیفہ یوم پیدائش سے شروع ہو جایا کرے۔

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قیصر کی بیوی نے عطر کی چند شیشیاں ”شاہِ عرب“ (حضرت عمرؓ) کی بیگم صاحبہ کو بطور تحفہ بھیجیں۔ آپ نے وہ شیشیاں بیوی سے لے لیں اور فرمایا کہ یہ بیت المال میں داخل ہوں گی۔ اس لئے کہ قیصر کی بیوی نے یہ تحفہ تمہاری ذاتی حیثیت سے نہیں بھیجا بلکہ امیرالمؤمنین کی بیوی کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ اس لئے تمہارا ان پر کوئی حق نہیں۔

ایک مرتبہ بیت المال میں کچھ مُشک آئی جسے تقسیم کرنا تھا۔ بیوی نے کہا لائیے میں تول کر الگ الگ حصے کردوں۔ فرمایا کہ ہاں! تم اسے تولوگی تو جو مشک ترازو کے پلڑے میں لگی رہ جائے گی تم اسے اپنے کپڑوں پر ملوگی۔ میں اس ”خیانت“ کو گوارا نہیں کرسکتا۔

بیٹا مصر سے واپس مدینہ آ رہا تھا ۔ گورنر مصر نے کچھ روپیہ دیا کہ اسے بیت المال میں جمع کرا دینا ۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں اس روپے سے راستے میں کچھ سامان تجارت خرید لوں اور مدینہ پہنچ کر اصل روپیہ بیت المال میں داخل کردوں اور منافع خود رکھ لوں ، تو اس میں حرج تو نہیں؟ گورنر نے اسکی اجازت دیدی ۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے کہا کہ زر منافع بھی بیت المال میں داخل کرو ۔ مجھے یقین ہے کہ گورنر نے تمہیں اس کی اجازت محض اس لئے دی تھی کہ تم عمر کے بیٹے ہو ۔ وہ ہر ایک کو اسکی اجازت کبھی نہ دیتا ۔ اسلئے جو رعایت تمہیں عمر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ملی ہے میں اسے جائز قرار نہیں دے سکتا ۔ عمر کے بیٹے اور ایک عام مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئیے ۔

ایک مرتبہ آپ کا بیٹا اپنا اونٹ ، مملکت کی چراگاہ میں چراتا رہا ۔ جب وہ موٹا تازہ ہو گیا تو نفع سے بیچ دیا ۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ تمام زرمنافع بیت المال میں داخل کردو ۔ تم نے ملت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس طرح چرا لیا؟ بعض رفقا نے کہا کہ گھاس تو چراگاہ کی تھی لیکن اس نے اونٹ چرانے میں جو محنت کی ہے اسکی کچھ اجرت تو اسے ملنی چاہئیے ۔ حضرت عمرؓ اس پر بھی راضی نہ تھے لیکن مجلس مشاورت نے اسے اجرت دلا دی ۔

بیت المال کا اونٹ گم ہو گیا تو صحابہؓ نے دیکھا کہ آپ پریشان ہیں اور اس کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ آپ اطمینان سے بیٹھئے ! اُونٹ کی تلاش اور لوگ کرلیں گے ۔ فرمایا کہ یہ تو اونٹ ہے ، اگر بیت المال کے اونٹ کا ایک بال بھی میری غفلت سے ضائع ہو جائے تو اس کا بار براہ راست میری گردن پر ہے ۔ اس لئے گم گشتہ اونٹ کو مجھے خود ہی تلاش کرنا ہوگا ۔ میں نے کیوں ایسا انتظام نہیں کیا کہ اونٹ گم نہ ہو ۔ اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا چاہئیے ۔

جب آپ خود اتنی احتیاط برتتے تھے تو ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت کو کس قدر محتاط ہونا پڑتا ہوگا۔ آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ صوبوں کے گورنر کبھی ترکی گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، کیونکہ اس سے بوئے تمکنت آتی ہے۔ باریک کپڑے نہ پہنیں۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں۔ اور اپنے مکانوں پر حاجب و دربان مقرر نہ کریں تا کہ لوگوں کو براہ راست ملنے میں دقت نہ ہو۔ ایک گورنر (حضرت عیاضؓ) کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں۔ انہیں مدینے میں واپس بلا لیا۔ ایک کمبل اوڑھنے کو دیا اور بکریاں دے دیں کہ انہیں چھ ماہ تک چراتے پھرو۔ اس سے راعی* (چرواہے) بننے کے آداب آ جائیں گے۔

''رعایا'' کے حقوق کا یہاں تک خیال رہتا تھا کہ ایک نو مسلم، ٹیکس کا روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کے لئے لایا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے لئے حکومت نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں ابھی ابھی مسلمان ہوا ہوں اس لئے ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی کہ میں حکومت سے کچھ لوں۔ آپ نے فرمایا! تو پھر حکومت کو بھی کچھ حق حاصل نہیں کہ تم سے کچھ لے جب تک حکومت تمہارے لئے کچھ نہ کرے، تم پر حکومت کا کچھ واجب نہیں آتا۔

غور کرو سلیم! کہ اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنا عظیم الشان اصول پوشیدہ ہے۔

اور وہ واقعہ تو عام مشہور ہے کہ جب آپ شام کے سفر میں گئے ہیں تو سواری کا ایک اونٹ تھا جس پر آپ اور آپ کا ملازم باری باری سوار ہوتے تھے۔ جب عیسائی حکومت کے نمائندے استقبال کے لئے آئے ہیں تو حالت یہ تھی کہ ملازم اونٹ پر سوار تھا اور آپ اس کی مہار تھامے آگے آگے (ساربان کی حیثیت سے) چل رہے تھے۔

---

* نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ، تم میں سے ہر شخص راعی (چرواہا) ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے (رعایا) کی بابت پوچھا جائیگا کہ اسکی نگہبانی کیسے کی تھی؟

کیسا حسین ہوگا سلیم! وہ کارواں جس میں رفقائے سفر اس قسم کے ہوں! تمہیں معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے ''نیک آدمی'' کی پہچان کے جو تین معیار بتائے تھے اس میں ایک یہ بھی تھا کہ اسے بہترین رفیق سفر ہونا چاہئے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بیان کیا کہ فلاں شخص بڑا نیک ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ وہ بڑا پکا نمازی ہے۔ نہایت احتیاط سے روزے رکھتا ہے۔ آپ نے کہا کہ اس سے تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ وہ بڑا نیک ہے؟ اس سے تو اتنا ہی معلوم ہوا کہ وہ بڑا نمازی ہے۔ بہت روزے رکھتا ہے۔ وہ شخص حیران تھا کہ اب کیا کہوں۔ آپ نے پوچھا کہ

(i) کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟
(ii) کیا تم نے کبھی اس سے معاملہ کیا ہے؟
(iii) کیا اس کے ساتھ کبھی اکٹھے سفر کیا ہے؟

اس نے ہر سوال کے جواب میں سر ہلا دیا۔ تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے کیسے کہہ دیا کہ وہ بڑا نیک ہے۔ جو بات کہو، سمجھ کر کہو۔ یہ کہو کہ وہ بڑا نمازی اور روزے دار ہے۔ یہ مت کہو کہ وہ بڑا نیک ہے۔

اسی شام کے سفر سے واپسی پر (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ واقعہ پیش آیا تھا جس کی یاد سے ہمیشہ آپکی آنکھوں میں آنسو آ جایا کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ کسی غیر معروف سے جنگل میں رات کے لئے رُکے۔ حسب معمول اِدھر اُدھر گشت لگا رہے تھے تاکہ معلوم کرسکیں کہ وہاں کی حالت کیا ہے کہ ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ جا کر دیکھا تو اس میں ایک بہت ضعیف بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ مائی! تمہارا کیا حال ہے؟ اُسے کیا معلوم تھا کہ پرسش احوال کون کر رہا ہے۔ کہا کہ حال کیا ہے! خلیفہ کی باتیں تو بڑی سننے میں آتی ہیں لیکن کیفیت یہ ہے کہ اُس نے آج تک پتہ ہی نہیں لیا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ تم نے اپنی حالت کی اطلاع خلیفہ تک پہنچائی تھی؟ اُس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے کہا کہ پھر خلیفہ کو کیسے معلوم ہو جاتا کہ تم تکلیف میں ہو؟

سنو سلیم! کہ اس کے جواب میں اس بڑھیا نے کیا کہا۔ اُس نے کہا کہ اگر خلیفہ اتنا انتظام نہیں کر سکتا کہ اپنی مملکت کے افراد کے حالات سے با خبر رہ سکے تو اسے خلافت چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہئیے۔ وہ اس کا اہل نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ خاموش واپس آ گئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے بعد ساری عمر یہ حالت رہی کہ اس واقعہ کو ہمیشہ باچشم پرنم یاد کیا اور یہ کہا کہ عمرؓ کو اُس بڑھیا نے سمجھایا کہ خلافت اور بادشاہت میں فرق کیا ہے؟

یہی تھیں خلافت کی وہ ذمہ داریاں جن کے احساس سے کیفیت یہ تھی کہ جب آپ کے آخری وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ آپ کے بعد آپ کے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے تو آپ نے کہا کہ عمرؓ نے جو ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں، اگر خطاب کا گھرانہ ان ہی کی باز پرس سے سرخرو ہو جائے تو کیا کم ہے جو اس خاندان کے ایک اور فرد کو بھی اس بوجھ کے لئے چن لیا جائے۔

یہ تھے سلیم! دست پروردگانِ ذاتِ رسالت مآبؐ جن کی تعلیم و تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ وہ قرآنی نظام کے چلتے پھرتے نمونے بن گئے تھے۔ لیکن اس قسم کی تعلیم و تربیت ہو ہی اس نظام میں سکتی تھی جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دست نگر نہ ہو۔ جس میں انسانی حریت کو وہ اذنِ بال کشائی عطا ہو کہ خدا کی عائد کردہ قیود کے علاوہ اور کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ یہی وہ احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ جب ایک مرتبہ وادیٔ ضجنان سے گذرے ہیں تو گھوڑے سے اتر کر ننگی زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ رفقائے سفر حیران تھے کہ یہ کون سا مقام سجدہ تھا! آپ نے سجدہ سے اُٹھ کر فرمایا کہ یہ وہ میدان ہے جس میں عمر بچپن میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت تھا اس لئے کام بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں۔ اس احساس کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں بیساختہ بدرگاہ رب العزت سجدہ ریز ہو گیا۔

تم نے اس فقرہ کو سنا سلیم! کہ آج "عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں"۔ بس یہ ہے صحیح آزادی۔ یعنی انسان پر خدا کے قانون کے علاوہ اور کسی کا کوئی دباؤ نہ رہے۔ جب انسان کو ایسی آزادی نصیب ہو جائے تو اس کی تمام دبی ہوئی صلاحیتیں اس طرح ابھرتی ہیں کہ وہ اقطار السمٰوٰت و الارض (ارض و سما کی حدود) سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ یہ تھا نتیجہ اس نظام ربوبیت کا جسے قرآن نے پیش کیا اور جو نبی اکرم ؐ کے ہاتھوں دنیا میں متشکل ہوا اور حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔

اب تم پوچھو گے سلیم! کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بعد وہ کچھ ہوا جسے قرآن نے چند الفاظ میں (تمثیلی انداز میں) خود ہی بیان کر دیا ہے جب فرمایا کہ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا (٧/١٧٥) انہیں اس شخص کی سرگذشت سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطۂ قوانین دیا (کہ اس کے مطابق نظام زندگی قائم کرے)۔ پھر اس نے کیا کیا؟ پہلے تو اس نظام کو قائم کیا اور اسکے بعد فَانْسَلَخَ مِنْهَا اسے الگ چھوڑ کر یوں نکل گیا جس طرح جانور کو ذبح کرکے اس کی کھال کھینچ لی جاتی ہے اور گوشت پر اسکا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ وہ اس ضابطۂ خداوندی کو یوں چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ تو شیطان نے اسکا پیچھا کیا اور اسے جا دبوچا۔ یہ تو نظام خداوندی کی محافظت تھی جس کی وجہ سے غیر خدائی قوتیں یا انسان کے انفرادی جذبات آگے نہیں بڑھتے تھے۔ جونہی مسلمان نے اس نظام کو چھوڑا، مفاد پرستیوں کی قوتوں نے اسے فوراً آگے بڑھ کر دبوچ لیا۔ (کیا کہہ گیا ہے اصغر مرحوم! کہ)

مگر کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اس کے بازو سمٹے اور صیاد نے آ دبوچا۔ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ سو اس کے بعد یہ کہیں سے کہیں نکل گیا۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا اگر وہ ہمارے قانون مشیت سے ہم آہنگ رہتا تو اسے ہم آسمان کی بلندیوں تک لے جاتے وَلٰكِنَّهٗ

اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰلہٗ لیکن یہ اس ضابطے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے ہو لیا۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آسمان کی بلندیوں کی طرف جانے کے بجائے یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ کَمَثَلِ الْکَلْبِ پھر اس کی مثال کتّے کی سی ہو گئی کہ اسکا پیٹ تو بھر جاتا ہے، نیت کبھی نہیں بھرتی۔ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اگر اسے کوئی دھتکار دے تو بھی زبان لٹکائے ہانپتا نظر آئے گا۔ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ اور اگر نہ دھتکارے تو بھی اسکی یہی حالت رہے گی۔ ہر وقت کھانے کی طرف للچائی ہوئی نگاھوں سے دیکھے گا اور منہ سے رال ٹپکے گی۔ ذٰلِکَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا بس یہی مثال سمجھو اس قوم کی جس نے ہمارے ضابطۂ قانون پر عمل پیرا ہونے کے بعد اسے چھوڑ دیا اور اس طرح اپنے عمل سے یہ ظاہر کیا کہ گویا (معاذ اللہ) یہ ضابطہ ھی غلط ہے۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ (۷/۱۷۶) تم ان لوگوں کو، جو ابھی تک اس ضابطہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ھیں، یہ سرگزشت سناؤ۔ شاید یہ کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا کرلیں کہ

ھیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ھماری جناب میں

میں نے سلیم! گذشتہ پندرہ برس میں یہی کوشش کی ہے کہ اپنے مخاطبوں کو اس شوریدہ بخت قوم کے اجڑے ہوئے کاشانوں کی درد بھری داستان سناتا رھوں تا کہ وہ کبھی سوچیں کہ ھم کیا تھے اور کیا ھو گئے۔ جس دن انھوں نے اتنا سوچ لیا ایک بہت بڑا مرحلہ طے ھوجائیگا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ھوجائے گا کہ ھم پھر ویسے کس طرح بن سکتے ھیں۔ جس چیز نے ھمیں وہ کچھ بنادیا تھا وہ چیز ھمارے پاس آج بھی موجود ہے۔ اس پر ایک دفعہ تجربہ ھو چکا ہے اس لئے اس کے متعلق یہ تذبذب پیدا نہیں ھوسکتا کہ معلوم نہیں اس نظام کے کیا نتائج مرتب ھوں۔ قرآن کے نظام نے جو نتائج ایک بار پیدا کئے تھے وھی نتائج ھر بار پیدا ھو سکتے ھیں۔

یہ نظام کیا ہے؟ اسکی تفاصیل تمہیں ”نظام ربوبیت“ میں ملیگی۔

یہ خط تمہیں غالباً اس وقت ملیگا جب تم جہاز پر سوار ہو چکے ہوگے۔ اس کے بعد تمہیں اس وقت خط لکھونگا جب تم یورپ سے واپس آ جاؤگے۔ لو خدا حافظ!

وداع و وصل جداگانه لذّتے دارد   هزار بار برو صد هزار بار بیا

والسلام

مئی ۱۹۵۳   پرویز

انتالیسواں خط

ہماری تاریخ

پچھلے خط میں تم نے سلیم! قرن اول سے متعلق وہ درخشندہ موتی دیکھے جو ہماری تاریخ کے اوراق پر مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری تاریخ انہی گہرہائے تابدار کا مجموعہ نہیں۔ اس میں ان کے ساتھ ایسے ایسے خزف ریزے بھی ہیں جنہیں اس مبارک زمانے کیطرف منسوب کرتے ہوئے شرم آتی ہے اور خجالت سے آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بھی عجیب دودھاری تلوار ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اس کی صحیح تاریخ موجود ہے تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینہ میں اپنے حال کو درخشندہ اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں اور خوش عقیدگیوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جن سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہمارے زوال کے اسباب میں بنیادی عنصر ہماری غلط تاریخ ہے۔

ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے (اور علیٰ وجہ البصیرت اور مبنی علیٰ الحقیقت ایمان) کہ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو

قرآن فہمی کے راستہ میں روک

زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں ہماری صحیح رہنمائی کرنے کے لئے مکمل اور کافی ہے۔ اگر ہم اس کا اتباع کریں تو ہمیں اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی راہ نمائی ہمارے لئے اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتی ہے جب ہم اسے سمجھیں۔ لیکن قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری غلط تاریخ ہے۔ یہ بات شاید تمہارے نزدیک تعجب انگیز اور حیرت خیز ہو۔ لیکن جب حقائق تمہارے سامنے آئیں گے تو تم اس کی صداقت کو بلا تامّل تسلیم کر لو گے۔ قبل اس کے کہ میں اس کی کچھ مثالیں تمہارے سامنے پیش کروں، تمہیداً یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخ کس طرح قرآن کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے اس کے افراد (جماعتِ مومنین) کی خصوصیات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے سامانِ زیست ملتا ہے وہ اسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اس کھلا رکھنے یا دوسروں کو دیدینے کی تصریح ان الفاظ سے کر دی کہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ اے رسول! جماعتِ مومنین کے افراد تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر دوسروں کو دیں؟ جواب میں کہا گیا ہے قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنی معاشرہ میں افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اسی قدر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے زائد قرآنی نظام (یا اسلامی مملکت) میں چلا جائے گا جو اسے نوعِ انسانی کی ربوبیت (پرورش) کے لئے صرف کرے گا۔ ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کوئی دقت پیش آتی ہے نہ دشواری۔ نہ ان میں کوئی اشکال ہے نہ اغلاق۔ لیکن تم جب یہ آیات کسی کے سامنے پیش کرو تو وہ جواب میں کہدیتا ہے کہ فلاں صحابی رضؓ کے پاس لاکھوں درہم و دینار تھے۔ فلاں کے پاس چاندی اور سونے کے ڈھیر

لگے رہتے تھے۔ فلاں کے پاس کاروان در کاروان سامانِ تجارت رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تو ان حضراتؓ کے پاس اس قدر دولت کیوں رہتی تھی؟ اس کے بعد سلسلۂ کلام کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔

سوال:۔ فرمائیے! صحابہ کبارؓ قرآن کو صحیح طور پر سمجھتے تھے یا آپ بہتر سمجھتے ہیں؟

جواب:۔ میں تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحابہ کبارؓ سے زیادہ قرآن سمجھتا ہوں۔

سوال:۔ کیا صحابہ کبارؓ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے یا ان کا عمل اس کے خلاف تھا؟

جواب:۔ معاذ اللہ! میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا عمل قرآن کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی بالکل قرآن کے مطابق تھی۔

سوال:۔ جب ان کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اور ان کے پاس اس قدر مال و دولت جمع رہتا تھا تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رو سے، زائد از ضرورت مال افراد کے پاس نہیں رہ سکتا۔

اس منطق کا تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی فریق مقابل کے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ ”بات بالکل ٹھیک ہے۔ جب صحابہ کبارؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنا جائز نہیں! کیا (معاذ اللہ) صحابہؓ کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا تھا؟“

نازک دلیل

تم نے دیکھا کہ تاریخ کس طرح قرآن کے راستے میں آ کر کھڑی ہو گئی؟ تم یہ معلوم کر کے حیران ہو گے کہ ہمارا مروّجہ اسلام تمامتر تاریخ کا مرتب کردہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے۔ مرّوجہ اسلام کی کسی شق کے متعلق سند مانگئے۔ وہ سند تاریخ سے پیش کی جائیگی۔ اگر تم کہو کہ اس کی سند قرآن سے پیش کیجئے تو جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ

> ھم رسول اللہؐ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے اس کی سند پیش کر رھے ھیں۔ اس سے بڑھ کر دین میں سند اور کیا ھو سکتی ھے؟ قرآن کے سمجھنے کے لئے سیرت رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کی حیاتِ مقدسہ کا سامنے رکھنا لاینفک ھے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ جواب اسقدر مسکت ھے کہ اس کے بعد تم کچھ کہہ ھی نہیں سکتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تاریخ، دین کی سند بن گئی ھے اور قرآن کریم محض ایصالِ ثواب کے کے لئے رہ گیا ھے۔ اگر کبھی ایسا ھو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ھے۔ لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ھو تو سند تاریخ کو حاصل ھوگی، قرآن کو نہیں۔

تاریخ کی صحیح پوزیشن

جب تک ھم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انھیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے، دین اپنی حقیقی شکل میں ھمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ھمارے پاس محفوظ ھے۔ اس میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ھے (خواہ وہ کتب احادیث میں ھو اور خواہ کتب سیرو آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ھے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہؐ نے مدوّن کرا کر امت کو دی، نہ خلفائے راشدینؓ نے انھیں مرتب کیا اور نہ ھی ان میں سے کوئی کتاب صحابہؓ کے زمانے میں مرتب ھوئی۔ حدیث کا وہ مجموعہ جسے ''اصحّ الکتب بعد کتاب اللہ'' کہا جاتا ھے (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہؐ کی وفات کے قریب ڈھائی سو سال بعد مرتب ھوا۔ اور تاریخ کی سب سے پہلی جامع کتاب جسے ام التواریخ کہا جاتا ھے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہؐ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا جن سے ان کتب احادیث و تاریخ کو مرتب کیا گیا ھو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انھوں نے ھم عصر لوگوں کی زبان سے سنیں۔ یہ ھے

ھماری تاریخ کی اوّلیں کتابوں کی پوزیشن جن سے ھم سیرتِ رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے واقف ھوتے ھیں (واضح رھے کہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کا بیشتر حصہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیاتِ کبریٰ خود قرآن کریم میں بھی مذکور ھیں۔ لیکن اس وقت ھم سیرت و آثار کے اس حصے کے متعلق گفتگو کر رھے ھیں جو کتب احادیث و سیر وغیرہ میں درج ھے)۔

قرآن اور تاریخ کا باھمی تعلق

قرآن کریم اور تاریخ کی جو پوزیشن اوپر بیان کی گئی ھے اس سے ھر صاحبِ بصیرت اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاھیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ باھرہ ھے جس کے لئے کسی دلیل وشہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی دلیل آپ ھے۔ اب رھے تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ھے۔ تو ایسی صورت میں بھی ھمارے لئے اصولِ کار واضح ھے۔ یعنی

(۱) ھمارا ایمان ھے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ھے) کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔

(۲) لہذا اگر تاریخ میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ھے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ھے تو ھمیں بلا تامل کہدینا چاھئیے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔

اسطرح دین کا صحیح تصور بھی قائم ھو جائے گا اور نبی اکرمؐ اور صحابہ اکبارؓ کی سیرت پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ھمارے سامنے آجائیگی۔

جو کچھ میں نے (نظری طور پر) اوپر کہا ھے وہ واضح انداز میں سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک تاریخ سے اسکی کوئی مثال نہ پیش کی جائے۔ عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی تاریخ سے اس قسم کی بہت سی

ایک مثال

مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ۔ لیکن چونکہ اس خط میں اس کی گنجائش نہیں (اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے) اس لئے میں اس ضمن میں صرف ایک واقعہ پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں ۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اُس وقت پیش آیا جب نبی اکرمؐ نے اس دنیا میں آخری سانس لیا اور ہنوز آپؐ کے جسد طیب کو سپردِ خاک بھی نہیں کیا گیا ۔ اور اس کا تعلق صحابہ کبارؓ کی اُس پوری جماعت سے ہے جو اُس وقت مدینہ میں موجود تھی ۔

قرآن کے غیر متبدل اصول

پہلے اس سلسلہ میں ، قرآن کی تعلیم کو سامنے لاؤ ۔ قرآن کی بنیادی قدر اور غیر متبدل اصول یہ ہے کہ وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسانی بچہ کو ، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ، واجب التکریم پیدا کیا ہے ۔ یعنی اس میں حسب نسب ، امیر ، غریب ۔ رنگ اور وطن ۔ مذہب و ملت کی کوئی تمیز نہیں ۔

(۲) واجب التکریم ہر انسانی بچہ ہے ۔ اب رہا مختلف افراد کے مدارج کا تعین ، سو اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے مطابق متعین کیا جائے گا ۔ بالفاظِ دیگر مدارج کا تعین ، جوہر ذاتی اور اعمال کی بنا پر ہوگا ۔ اس میں بھی خاندان ، قبیلہ ، ذات گوت ، رشتہ داری ، امارت ، غرضیکہ کسی اضافی نسبت کا کوئی دخل نہیں ہوگا ۔

(۳) اسی اصول کے مطابق ، امت میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانین خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا ۔ جسکی سیرت و کردار سب سے زیادہ قرآن کے مطابق ہوں گے ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳)

ان غیر متبدل اصولوں کی رُو سے قرآن نے رنگ ۔ نسل ۔ خون ۔ قبیلہ ۔ ذات وغیرہ کے تمام امتیازات ختم کر دئے اور عزت و تکریم کا صرف ایک معیار باقی رکھا ۔ یعنی جوہر ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار ۔

امت کا فریضہ

اب آگے بڑھو ۔ نبی اکرمؐ نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک معاشرہ متشکل کیا ۔ ایک مملکت قائم کی جس کا مقصد دنیا

میں ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' تھا۔ چونکہ اس نظام کو نبی اکرمؐ کی زندگی تک ھی نہیں رہنا تھا۔ اسے مسلسل آگے چلنا تھا، کیونکہ اسی کا نام دین تھا۔ اس لئے اس مقصد کے لئے پوری کی پوری امت تیار کی گئی۔ اس امت کے متعلق قرآن میں ھے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ . . . . (۳/۱۰۹) تم بہترین امت ھو جسے نوع انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ھے۔ تمہارا فریضۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر ھے۔

یہی وہ امت تھی جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ قرآن میں ھے ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا . . . . . (۳۵/۳۲) پھر ھم نے ان لوگوں کو اس کتاب کا وارث بنایا جنہیں اس مقصدِ جلیل کے لئے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔ یہ امت (اس زمانے میں) مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی جس کے پکے اور سچے ھونے کا سارٹیفکیٹ خود اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ سورۂ انفال میں ھے

صحابہ کے فضائل

> وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْا۔ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۷۴)
>
> اور جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے ھجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جنہوں نے (انہیں) پناہ دی اور انکی مدد کی۔ یہ سب سچے اور پکے حقیقی مومن ھیں۔ ان کے لئے ھر قسم کی حفاظت اور عزت کا رزق ھے۔

دوسرے مقام پر ھے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی تھی۔ اور یہ وہ نعمت کبریٰ تھی جو ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی تھی (۸/۶۳) سورۃ توبہ میں ان کے متعلق ھے أُولٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹/۸۸) یہی وہ لوگ ھیں جن کے لئے ھر قسم کی

بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب و کامران ہیں ۔ سورۃ فتح میں خالق کائنات نے ان ”پکے اور سچے مومنین“ کی جس والہانہ انداز میں توصیف و تعریف کی ہے وہ ان حضرات رض کی بلندیٔ مقام کی زندہ شہادت ہے ۔ دیکھئے! کہنے والے نے کس طرح جھوم جھوم کر کہا ہے ۔

> مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ
> رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ
> فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ
> مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِکَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَ
> مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ
> فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ
> الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ ط وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
> وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا
> عَظِیْمًا (۴۸/۲۹)

اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے ۔

> محمد رسول اللہ ؐ اور ان کے رفقاءؓ کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے ۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور ہمدرد ۔ تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے اور قوانین خداوندی کے سامنے پیکر تسلیم و رضا بن جاتے ہیں ۔ لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں ۔ وہ خدا کے قانون کے مطابق سامان زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروف عمل رہتے ہیں اور زندگی کے ہر معاملہ میں قوانین الٰہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں ۔ ان کے اندر صفاتِ خداوندی کی نمود سے سکون و

طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں ۔ ان کے یہ خصائص تورات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی ۔

انہوں نے جس طرح بتدریج اس نظامِ خداوندی کو قائم کیا ہے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے عمدہ بیج سے شگوفہ نکلتا ہے تو پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے ۔ پھر وہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے ۔ پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی نالوں پر محکم اور استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے ۔ کاشتکار جب اپنی محنت کو یوں ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے ۔ لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے ۔

اس طرح اللہ ہر اس جماعت کو جو اس کے نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر، صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو، اس کا وعدہ دیتا ہے کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا ۔ اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہوگی ۔

یہ تھی وہ جماعت جس نے رسول اللہؐ کے مقدس ہاتھوں میں تربیت پائی تھی اور جس نے حضورؐ کے بعد قرآنی نظام کو آگے چلانا تھا ۔ اس مقصد کے لئے ان سے کہدیا گیا تھا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں ۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے سلیم! کہ

(۱) قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے ۔ نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات ۔

(۲) صحابہ کبار رض پکے اور سچے مومن تھے ۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا ۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی ۔

(۳) قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا امت کا اجتماعی فریضہ ھے ۔ اس کے لئے وہ باھمی مشورہ سے اپنے میں سے بہترین فرد کو (جو معیارِ خداوندی پر پورا اترے) منتخب کرکے ، رسول ؐ کا جانشین بنائیں گے ۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتے ھیں ۔

امت کے لئے قرآن کے ان اصولوں پر عمل کرنے کا پہلا موقعہ ، رسول اللہ ؐ کی وفات کے فوری بعد پیدا ھو گیا ۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب ۔

یہ تھی قرآن کی تعلیم اور قرآن کی رو سے صحابہ کبار رض (جماعتِ انصار و مہاجرین) کی خصوصیاتِ کبریٰ ۔ اب دیکھو کہ تاریخ اس باب میں کیا بتاتی ھے ۔

خلافت کے متعلق حضرت عباس رض اور حضرت علی رض کے خیالات

بخاری (باب وفات النبی ؐ) میں حضرت عبداللہ ابن عباس رض کی روایت سے حسب ذیل واقعہ بیان کیا کیا گیا ھے ۔

> اس بیماری میں جس میں آپ ؐ نے وفات فرمائی علی رض ابن ابی طالب رسول اللہ صلعم کے پاس سے باھر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا ۔ ابوالحسن ! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی ۔ حضرت علی رض نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ھے ۔ تو عباس بن عبدالمطلب رض ان کا ھاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے ۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ھوگے بخدا میرا یہ خیال ھے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ھو جائے گا ۔ میں خوب پہچانتا ھوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ھوتے ھیں ۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپ ؐ

> سے دریافت کر لیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائیگا اور آپ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے (اس* پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے! عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا)۔ اس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپؓ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دینگے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے سلیم! کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافتِ حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے وہ قابل غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسول اللہؐ سے دریافت کر لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش (Chance) نہیں رہے گی۔

تم جانتے ہو سلیم! شیعہ حضرات کے ہاں عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں،

---

*بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

اسی طرح خلافت بھی خدا کی طرف سے موھبت ھے - اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں - امام، خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ھوتا ھے - یہ امامت حضرت علی رض اور آپ کی اولاد میں، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ھے -

لیکن سنّی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں - ان کے نزدیک، خلیفہ امت کے مشورہ سے منتخب ھوتا ھے - نہ ھی خلافت کوئی جائیداد ھے جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ھے - یہ تصور کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ھے، ملوکیت ھے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا -

اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو ......

جو روایت اوپر درج کی گئی ھے وہ شیعہ حضرات کی نہیں - سنیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ھے - اب تم غور کرو کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہ ص کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباس رض اور حضرت علی رض) کے متعلق کیا تصوّر قائم ہوتا ھے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی - یہ معاملہ امت کے باھمی مشورہ سے طے ھوتا ھے - پھر جو جواب حضرت علی رض کی طرف منسوب کیا گیا ھے اُس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ھے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں -

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

اب آگے بڑھو - نبی اکرم ص اس دنیا سے تشریف لے گئے - چونکہ خلافت (جانشینیٔ رسول) کا معاملہ امت کے باھمی مشورہ سے طے ھونا تھا س لئے حضور ص نے اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی تاکہ امت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ھو جائے - چونکہ یہ معاملہ بہت اھم تھا — مرکزِ ملّت کے بغیر دین کا تصور ھی نہیں کیا جا سکتا - اس لئے امت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا - تاریخ ھمیں بتاتی ھے کہ سقیفہ بنی سعدہ میں انصار کا اجتماع ھوا جس میں حضرت سعد بن عبادہ رض کو خلافت کا امدوار قرار دیا گیا -

ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے ۔ اُس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکر رض ۔ حضرت عمر رض اور دیگر صحابہ رض بھی وہاں پہونچ گئے ۔ اس اجتماع کی جو روئداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابلِ غور ہے ۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذر رض نے حسب ذیل تقریر فرمائی ۔

حضرت حباب رض کی تقریر

> اے انصار ! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو تاکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں ۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کرسکے ۔ تم اہل عزت و ثروت ہو ۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو ۔ تم بہادر اور دلیر ہو ۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں ۔ ایسی حالت میں تم یک دوسرے کی مخالفت کرکے اپنا معاملہ خراب نہ کرو ۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم نہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے ۔
>
> (محمد حسین ہیکل کی کتاب ''ابوبکر صدیق اکبر'' صفحہ ۱۰۷)

کچھ سمجھے سلیم ! ہماری تاریخ کا یہ بیان اُن انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدائیانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے ۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُن کی طرف سے ان جذبات کا اظہار اُس وقت ہو رہا ہے جب نبی اکرم ؐ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں کے سامنے ہے ۔

یہ تو رہا انصار کے متعلق ۔ اب مہاجرین کی بابت سنو ۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے جواب میں حضرت عمر رض نے حسب ذیل تقریر فرمائی ۔

حضرت عمر رض کی تقریر

ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہونگے جب رسول اللہ ؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ ؐ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ ؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہوسکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔

(ابوبکر صدیق از ہیکل صفحہ ۱۰۸)

اس کے جواب میں حضرت حباب رض نے انصار سے کہا۔

اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمر رض اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کرلیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلا وطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہیں اس کے سب سے زیادہ حق دار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو۔ اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔ (ایضاً ۱۰۹-۱۰۸)

انداز گفتگو؟

حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا

> اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ (ایضاً ۱۰۹)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا۔

> ہمیں نہیں، اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ (ایضاً ۱۰۹)

یہ ہے سلیم! ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ سارٹیفکٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۸/۶۳) ان کے دلوں میں خدا نے باہمی محبت اور الفت ڈال دی۔ وہ محبت اور الفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی تھی (۸/۶۳)۔ اُن صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حقِ خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ

> رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہل عشیرہ (اہل خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابلِ غور ہے۔ اس سے پیشتر تم دیکھ چکے ہو کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہیئے تھی۔ اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسول اللہؐ کے اہلِ خاندان ہیں۔ غور کرو کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے؟

لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رھتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ھے اور بتاتی ھے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعوی یکسر بے بنیاد ھے۔ رسول اللہؐ نے فیصلہ کر دیا ھوا ھے کہ

الائما من قریش

''الائمة من قریش'' خلافت قریش میں رھے گی۔ اس پر انصار خاموش ھو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث متفقہ طور پر صحیح مانی جاتی ھے۔ لیکن تم ذرا اس کی گہرائی میں جؤ اور سوچو کہ یہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد ھو سکتا ھے؟ قرآن مسلسل و متواتر نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساوات انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رھی۔ کیا تم اس امر کا تصور بھی کر سکتے ھو کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ (معاذاللہ) یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رھے گی۔ یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دے دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ھماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ھے اور یہ کہتی ھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ھماری تاریخ، ایک ھی واقعہ میں، خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل رستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ھے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد، صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ھوا، اس میں (ھماری تاریخ کے مطابق) ان حضرات کے باھمی تعلقات، انداز گفتگو اور اسلوب دلائل کا نقشہ ھمارے سامنے آگیا۔ اب اس سے آگے بڑھو۔ (امام) طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ھیں۔

دست و گریباں

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ھے کہ اب ھر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ

کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ، ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے، اس کو قتل کردو۔ اور خود ان کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کردوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ عمر نے کہا چھوڑو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا، عمرؓ! خاموش رہو۔ اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے، اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کردیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا کر لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آکر بیعت کر لو۔ سعد نے کہا یہ نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کرلوں اور اپنی تلوار سے، جس پر میرا بس چلے، وار نہ کرلوں۔ اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں تب بھی، جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں، بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری ۔ جلد اول ۔ حصہ چہارم ۔ اردو ترجمہ ۔ شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۷)

معاذ اللہ!

اس سے ایک صفحہ آگے ہے ۔

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں ۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں ۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا ۔ اس کے ہاتھ پر وار کیا ۔ تلوار گر پڑی ، عمرؓ نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے ۔ اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے ۔ اب سب نے باری باری آکر بیعت کی ۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی ۔ اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی ۔ ابوبکرؓ اس سے دور رہے ۔ جسوقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا ۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کردے ۔ وہ منافق ہے ۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آگیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہوگیا ۔

سلیم! تم کلیجے پر ہاتھ رکھو اور اس فقرہ کو پھر پڑھو کہ

اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی ۔ (معاذ اللہ ۔ معاذ اللہ)

بہر حال ، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوگئے ۔ اس کے بعد ، دوسرے امیدوار ، حضرت سعدؓ کا کیا طرز عمل رہا؟ سنو!

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے ۔ حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے ۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی ۔ (طبری ۔ صفحہ ۸)

ڈاڑھیاں نوچنا

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبری ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی ڈاڑھیاں نوچنا (معاذاللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ (چنانچہ طبری کی اسی جلد میں جس کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں) لکھا ہے کہ جب حضرت اُسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلاف رائے ہوا تو

> ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی اور کہا۔ اے ابن الخطاب! اللہ تیری ماں کا برا کرے کہ تم مرجاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہؐ نے اس پر فائز کیا ہے، تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیٰحدہ کردوں۔ (ایضاً صفحہ ۱۲)

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخاب خلیفہ اول کی تاریخی داستان کی طرف آؤ۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں آیا۔ تم یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوش ہوگے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا سوال پیدا ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا ردِ عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ سنئے۔ محمد حسین ہیکل (مصری) اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

حضرت علیؓ کا رد عمل

> مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل بن عباسؓ، زبیرؓ بن عوام، بن العاص، خالدؓ بن سعید، مقدادؓ بن عمرو، سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ، براء بن عازبؓ، ابی بن کعبؓ۔ ابوبکرؓ نے عمرؓ، ابوعبیدہ

> بن جراح رض، مغیرہ بن شعبہ رض سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباس رض بن عبدالمطلب سے ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ھوجائے ۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علی رض بن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقع ھو جائے گا اور یہ بات آپ کو علی رض کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ھوگی ۔
>
> اس مشورے کے مطابق ابوبکر رض عباس رض سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ھوئی ۔ حضرت ابوبکر رض نے کہا ۔ آپ رسول اللہ ص کے چچا ھیں ۔ ھم چاھتے ھیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ھو جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ھوتا رہے ۔ لیکن عباس رض نے یہ پیشکش رد کر دی اور کہا کہ اگر خلافت ھمارا حق ھے تو ھم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ھوسکتے ۔ (ابوبکر ۱۱۹)

اس کے بعد ھیکل لکھتا ھے ۔

> ایک اور روایت میں، جسکا یعقوبی اور بعض دیگر مورخین نے بھی ذکر کیا ھے، مذکور ھے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علی رض کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃ الزھرا رض بنت رسول اللہ ص کے گھر میں جمع ھوئی ۔ ان میں خالد بن سعید رض بھی تھے ۔ خالد رض نے حضرت علی رض سے کہا
>
> اللہ کی قسم ! رسول اللہ ص کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں ۔ اس لئے آپ ھماری بیعت قبول کیجئے ۔
>
> جب حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لیکر حضرت فاطمہ رض کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ دیا ۔ حضرت علی رض تلوار ھاتھ میں لے کر گھر سے

باہر نکلے ۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی ۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوگئے ۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا ۔

” یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی ۔ اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی ،، ۔ حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے ۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے ۔ لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کرلی ۔ سوائے حضرت علیؓ کے جنہوں چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی ۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی ۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی ۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے ۔ (ایضاً صفہ ۱۲۰)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل کیا پیش کی تھی ۔ اب وہ دلیل سنو ! ہیکل لکھتا ہے ۔

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ” الامامتہ والسیاستہ ،، میں درج کی ہے ۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو

ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں ۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا ۔ زبیرؓ بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے ۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا ۔

”زبیرؓ کو پکڑ لو“

لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی ۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی ۔ حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا ۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا ۔ میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہئے تھی ۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں ۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی ۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسول اللہؐ ہم میں سے تھے ۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں دی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں ۔ ہم تم سے زیادہ رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں ۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے ۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو ۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے

> تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے ۔
>
> (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

تم نے غور کیا سلیم ! کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسول اللہ ؐ کے اہل خاندان ہیں) اسے (تاریخ نے) کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹایا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل کے بعد، سنّی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑ سکتا ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ (تاریخ نے) یہ دلیل اولاً حضرات شیخینؓ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کی طرف کیوں منسوب کی تھی ۔

> بہرحال، حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا
>
> میں اس وقت تک آپکو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے ۔
>
> (ایضاً صفحہ ۱۲۲)

سر گرمیاں

> اس کے بعد
>
> حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آگئے اور کہنے لگے ۔
>
> عمرؓ تم شوق سے دودھ دوھو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے ۔ آج تم اس لئے خلافتِ ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئیگی ۔ لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا،، ۔
>
> حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آجائے ۔ انہوں نے کہا ۔ ’’علی اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا،، ۔
>
> اس پر ابو عبیدہ بن جراحؓ حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا ۔ ’’بھتیجے ! تم ابھی کم عمر ہو

اور یہ لوگ بزرگ ھیں ۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ھے اور نہ تم ان کی طرح جہاندیدہ ھو ۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسول اللہؐ کی جا نشینی کے فرائض صحیح طور پر بجا لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہ ' اٹھا سکتا ھے تو وہ صرف ابوبکرؓ ھیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو ۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل ، دینی رتبے، فہم و ذکاء، سابقیت اسلام ، حسب و نسب اور رسولؐ کی دامادی کا شرف حاصل ھونے کے باعث تمہی خلافت کے مستحق ٹھیروگے ” ۔

یہ سنکر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے ۔ “ اللہ اللہ ! اے گروہ مہاجرین ! تم رسول اللہؐ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو ۔ آپ کے اھل بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو ۔ اے مہاجرین ! اللہ کی قسم ! ھمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ھیں کیونکہ ھم اھل بیت ھیں ۔ ھم اس وقت تک اس کے حقدار ھیں جب تک ھم میں اللہ کی کتاب کا قاری ، دین کا فقیہہ ، رسول اللہؐ کی سنت کا عالم ، رعایا کی ضرورت سے واقف ، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اوران سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ھے ۔ اور اللہ جانتا ھے کہ ھم میں ان صفات کا حامل موجود ھے ، اس لئے اپنی خواھشات کی پیروی کرکے اللہ کے راستے سے گمراھی اختیار نہ کرو ۔ اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ ” ۔ راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے ۔ جب انھوں نے حضرت علیؓ کی یہ باتیں سنیں تو کہا ۔ “ اے علیؓ ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ھیں

انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے“۔

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بپھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

”اے بنتِ رسول اللہؐ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔“

یہ سنکر حضرت علیؓ غصہ میں آکر جواب دیتے۔ ”کیا میں رسول اللہؐ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟“
حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں۔ ”ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کریگا۔“
(ایضاً ۱۲۲-۲۵)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسب ذیل روایت آئی ہے۔

بخاری کی حدیث

حضرت فاطمہؓ، نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک

۔ حضرت فاطمه رض زنده رهیں لوگوں کی نگاهوں میں حضرت علی رض کا ایک خاص وقار رها۔ لیکن جب حضرت فاطمه رض کا انتقال هو گیا تو حضرت علی رض نے محسوس کیا که لوگوں کے چہرے اب بدل گئے هیں چنانچه انهوں نے حضرت ابوبکر رض سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواهش کی۔ ان چھ ماه تک انهوں نے بیعت* نہیں کی تهی۔ چنانچه انهوں نے ابوبکر رض کے پاس پیغام بھیجا که آپ همارے پاس تشریف لائیے۔ مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نه آئے۔ حضرت علی رض کو یه بات گوارا نہیں تهی که وه حضرت عمر رض کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمر رض نے کہا ”نہیں خدا کی قسم آپ ان کے هاں تنها نہیں جاسکیں گے“ اس پر حضرت صدیق رض نے کہا۔ تم کیا سمجھتے هو۔ وه میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچه صدیق اکبر رض تشریف لے گئے تو حضرت علی رض** نے خطبه پڑھا اور فرمایا۔ ”هم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا هے اسے پہنچانتے هیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے هم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امر خلافت میں همارے خلاف استبداد سے کام لیا هے۔ هم

---

*بعینه، اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا هے۔ انهوں نے اس کے ساتھ اضافه کیا هے ”معمر کہتے هیں که کسی نے ابن شہاب زهری سے پوچھا که کیا حضرت علی رض نے چھ ماه تک ابوبکر رض کی بیعت نہیں کی تو زهری نے جواب دیا که نہیں نه حضرت علی نے بیعت کی اور نه هی بنو هاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتی که چھ ماه بعد حضرت علی نے بیعت کر لی تو بنو هاشم نے بھی بیعت کر لی“۔

(ابن جریر طبری۔ جلد اول۔ حصه سوم اردو ترجمه جامعه عثمانیه ۵۹۶)

**ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علی نے اس موقع پر تمام بنو هاشم کو اپنے هاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً

> سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ھماری قرابت کی وجہ سے اس میں ھمارا حصہ ھے*۔
>
> ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکر صدیق رض منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا، اور بیعت سے علی رض کے تخلّف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی.. اور (اس کے بعد) حضرت علی رض نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکر رض کے حق عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ھے وہ ابوبکر رض سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ھے بلکہ ھم سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت میں ھمارا حصہ ھے اور ابوبکر رض نے ھمارے خلاف استبداد سے کام لیا ھے۔ لہذا ھم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ھیں۔ مثلاً

(۱) حضرت علی رض حضرت ابوبکر رض سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت فاطمہ رض کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی۔ اور چپکے ھی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(۲) جب تک حضرت فاطمہ رض زندہ رھیں، حضرت علی رض نے حضرت ابوبکر رض کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا سا وقار باقی نہیں رھا۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابوبکر رض کی بیعت کر لی جائے۔

(۳) حضرت علی رض نے اپنے حقِ خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسول اللہؐ کے قرابت دار ھیں۔

---

*ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ھیں ولکنا کنا نری ان لنا فی هذا الامر حقا فاستبدو تم به علینا یعنی ھم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ھمارا حق ھے اور تم نے ھمارے خلاف استبداد سے کام لیا ھے۔ (ایضاً)

تم سوچو سلیم ! کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے ؟

صحابہ کا اِرتداد ؟

تاریخ کے اس بین کے مطابق حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے انہوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے ۔ یہی وہ ''جرم،، ہے جس کی بنا پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد ، بجز چند اصحاب (جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے ۔ اس کے متعلق سُنی حضرات یہ کہدیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصب پر مبنی ہے ۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین کتاب ، بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے ۔

> حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا ۔ برہنہ بدن ۔ بغیر ختنہ کئے حشر کئے جاؤ گے ۔ آپؐ نے یہ آیت پڑھی كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۔ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ ۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابرٰہیمؑ ہیں ۔ اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے ۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں ۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے* جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے ۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَادُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (٥/١١٧)
>
> (بخاری کتاب الانبیاء ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب ۔ کراچی ۔ جلد دوم صفحہ ١٣٩)

---

* بخاری کے اصلی الفاظ 'مرتدین علیٰ اعقابھم' ہیں ۔

سوچو سلیم ! کہ بخاری کی اس حدیث کی رو سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ھے ؟ یہ وہ صحابہ رض ھیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (۸/۴) ,, یہی لوگ ھیں جو حقیقی مومن ہیں ''۔ اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہ ؐ نے آنکھیں بند کیں اور اِدھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے، تو بہ دیگراں چہ رسد ؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہدے (اور کہنے والے کہتے ھی ھیں) کہ ,, درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ھے ''۔ تو سوچئے کہ (ان روایات کی رو سے) خود نبی اکرم ؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ھے ؟

تاریخ، دین بن چکی ھے

اس مقام پر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ھوگا کہ جس تاریخ کی یہ کیفیت ھے اسکی اس قسم کی روایات کو مسترد کیوں نہ کر دیا جائے ؟ ایسا کرنے میں کون سا امر مانع ھے ؟ یہ بات بڑی معقول ھے اور ایسا کرنے میں کوئی دقت نہیں ھونی چاھیئے۔ لیکن مشکل یہ ھے کہ ھماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ھے۔ ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ھے کہ یہ خدا کی طرف سے، رسول اللہ ؐ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں۔ اس لئے یہ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ھیں (مثلہٗ معہ)۔ اتنا ھی نہیں۔ ان کے متعلق یہ بھی عقیدہ ھے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔ کراچی کے ادارہ ''تحقیق حق ,, کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ھوا ھے جس کا نام ھے ''فتنہ انکار حدیث ,,۔ اس کے مصنف ھیں '' علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دھلوی ,,۔ وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ھیں ——

> اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ کے کیا معنی ھیں۔ نبی سے یہ کہا جا رہا ھے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔ تو اس کا جواب یہ ھے کہ '' ما انزل اللہ ,,

کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔ بلکہ "ما انزل اللہ"، کتاب اللہ بھی ہے اور حدیث رسول اللہ بھی۔ صفحہ (۲۵)

حدیث، قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۰) .... تمہارے اوپر والدین کی وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا لا وصیة للوارث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ صفحہ (۸۵)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولؐ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسولؐ کا قول قرآن کو فسخ کر دے! تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسولؐ کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسولؐ کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسولؐ) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (۸۶)

مینے کہا تھا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرنِ اول (عہد محمد رسول اللہؐ

والذین معہ') کی تاریخ * کے ذخیرہ کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لیں۔ جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف جائیں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا۔

قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو سکتا ہے

جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ عقل کے مطابق ہو، بالکل اسی طرح نبیؐ کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ نبیؐ کا قول بھی قول اللہ ہے اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے دونوں قول ہیں۔ قرآن بھی اور حدیث رسولؐ بھی۔ تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ حس طرح اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے۔ دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے۔ جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیث رسولؐ کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ (۵۱)

---

*جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے، قرن اول کی تاریخ کا کچھ حصہ کتب احادیث میں ہے اور کچھ حصہ کتب سیر و آثار میں۔ لیکن کتب احادیث کو قرآن کے ہم پایہ بلکہ قرآن کا ناسخ ماننے والوں پر یہ بات بھی گراں گزرتی ہے کہ حدیث کو تاریخ کہہ دیا جائے۔ حالانکہ یہ ظاہر کہ واقعہ خلافت اول کے متعلق بخاری کی جو احادیث سابقہ صفحات میں درج کی گئی ہیں وہ اگر تاریخی بیانات نہیں تو اور کیا ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود امام بخاری نے اپنی اس کتاب (مجموعہ احادیث) کا نام ,' الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہؐ وایامہ'' رکھا تھا (بحوالہ ,, تدوین حدیث ،، سولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم)۔ اس سے واضح ہے کہ خود امام بخاری کے نزدیک ان کی کتاب تاریخ کی کتاب تھی۔

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے۔

> يَكْثُرُ لَكُمُ الْاَحَادِيْثُ مِنْ بَعْدِيْ۔ فَاِذَا رُوِيَ عَنِّيْ حَدِيْثٌ فَاعْرِضُوْهُ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ۔ فَمَا وَافَقَ فَاقْبَلُوْهُ۔ وَمَا خَالَفَ فَرُدُّوْهُ۔

(بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح ۔ ۴۸)

یعنی رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ ”میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔“ اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشادِ گرامی قرآن کے خلاف ہو نہیں ہو سکتا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟ جماعت اہل حدیث کے ترجمان ماہنامہ ”رحیق“ نے اپنی اپریل ۱۹۵۸ کی اشاعت میں لکھا۔

حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے یہ عقیدہ ملحدوں کا ہے۔

اس حدیث کو ملحدین نے وضع کیا تھا۔ اور ملحدین کے خیالات کی خوشہ چینی بکواس ازم کے یہ ممبران کر رہے ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں وَضَعَهٗ الزَّنَادِقَةُ الَّذِيْنَ مَقْصُوْدُهُمْ اِفْسَادُ الدِّيْنِ وَيَدْفَعُهٗ قَوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ۔ (ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی ۲۶۷)

یعنی یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے جن کا مقصد احادیث کو رد کر دینے سے دینی نظام

> کا فاسد و باطل کر دینا ہے۔ اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خود ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔ پس ”حدیث“ ہی قرآن کے مانند ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ ”قرآن کے مانند“ کا نام ”حدیث“ ہے۔ وہ روایت یہ ہے أَلَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يَصِلُ إِلَيْهِ عَنِّي الْحَدِيْثُ فَيَقُوْلُ لَا نَجِدُ هٰذَا الْحُكْمَ فِي الْقُرْآنِ أَلَا وَإِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ (ظفر الامانی صفحہ ٢٦٧) دوسری حدیث کے یہ لفظ ہیں۔ لَيُوْشِكُ الرَّجُلُ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يُحَدَّثُ بِحَدِيْثِيْ فَيَقُوْلُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللّٰهِ الْحَدِيْثَ (دارمی صفحہ ١٤٠ جلد اول طبع مصر)۔ اس قسم کی روایات الکفایہ (ص ١٠٠٩) میں خطیب ؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث کو رد نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند ”حدیث“ بھی دی گئی ہے۔ امام خطابی ؒ کی طرح امام شافعی ؒ، امام المحدثین عبدالرحمٰن ؓ ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقی ؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنت نبویہ ؐ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنا لی گئی ہے وہ باطل ہے۔ علامہ ہیثمی ؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکر الحدیث ہے۔ (مجمع الزوائد جلد اول ٦٨)

یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دو، (ان حضرات کے نزدیک) ملحدین اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے!

خرد کا نام جنوں رکھدیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

گذشتہ اوراق میں جو اقتباسات آپ کی نظروں سے گزرے ہیں، ان سے سلیم! یہ حقیقت تمہارے سامنے آچکی ہے کہ ہماری کتب احادیث و سیر و آثار میں ایسی باتیں موجود ہیں جو

(۱) قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔
(۲) جن سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر حرف آتا ہے۔
(۳) جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہوجاتے ہیں۔
(۴) جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔

یہ ہوا کیسے؟

اس کے بعد تمارے دل میں لازماً یہ سوال ابھرے گا کہ

(الف) اس قسم کی باتیں ان کتابوں میں آ کیسے گئیں؟

(ب) ہزار برس سے یہ متواتر آگے منتقل کیسے ہوتی رہیں۔ یعنی لوگوں نے اس قسم کی باتوں کو ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟ اور

(ج) آج بھی ہمارا قدامت پرست طبقہ ان باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر مُصر کیوں ہے؟

یہ سوالات ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لے اور ان امور پر غور و فکر کرے۔ جہاں تک پہلی دو شقوں کا تعلق ہے (یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے لٹریچر میں آ کیسے گئیں۔ اور قوم نے انہیں ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟) اس کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مناسب موقعہ وہ ہے جب ہم اپنی پوری تاریخ کا ازسرِنو جائزہ لیں اور اس کے ایک ایک گوشے کے متعلق ریسرچ کریں۔ ظاہر ہے کہ خط میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ میں سردست صرف اس نقطہ کو پیش کرونگا کہ آج بھی اس قسم کے باتوں کو صیحح ماننے اور صیحح منوانے پر اس قدر زور کیوں دیا

جا رہا ہے؟ اس نقطہ کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو جائے گی۔ اسے غور سے سنو۔ لیکن اس سے پہلے تمہیداً چند الفاظ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرا تعلق نہ کسی فرقے سے ہے، نہ پارٹی سے۔ نہ ہی مجھے شخصیتوں سے واسطہ ہوا کرتا ہے۔ اس لئے تم نے دیکھا ہو گا کہ میں نے تمہارے خطوط کے جواب میں اشخاص کے متعلق بہت کم باتیں لکھی ہیں۔ لیکن بعض اوقات واقعات ایسے سامنے آجاتے ہیں جن میں اشخاص متعلقہ کا ذکر کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں بھی مجبوری درپیش ہے جس کی وجہ سے مجھے نام لینا پڑ گیا ہے۔ لو اب اس واقعہ کو سنو۔

کوئی دو برس اُدھر کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کے ارباب بست و کشاد کا ایک حلقہ جماعت سے الگ ہو گیا۔ ان الگ ہونے والے حضرات نے اپنی علیٰحدگی کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ جماعت کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جن اصولوں کو دین کی محکم اساس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا نظام کے عملی قیام کے وقت ان سے انحراف کیا جارہا ہے۔* ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا وقیع اور یہ جرم بڑا سنگین تھا۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے یہ کون سا انوکھا کام کیا ہے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے اسلام کے اشاعتی دور میں جو اصول بیان فرمائے تھے اس کے عملی قیام کے وقت اُن میں لچک پیدا کر لی تھی۔ مثلاً۔

> ایسا معاذ اللہ رسول اللہؐ نے بھی کیا تھا!

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبایلی امتیازات کو ختم کرکے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ

---

* ان تفاصیل کے لئے المنیر لائلپور بابت ۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء اور طلوع اسلام بابت مارچ و جولائی ۱۹۵۸ء دیکھو۔

> کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن
>
> جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ۔ امام قریش میں سے ہوں۔
>
> ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

تم نے سوچا سلیم! کہ اس وضعی روایت سے جو ہماری کتب تاریخ میں درج ہے (اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) امیر جماعت اسلامی نے کس طرح فائدہ اٹھایا؟ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ صرف قرآن تک رہتا اور دین میں اسی کو سند مانا جاتا تو ان صاحب کو اپنی روش کی تائید میں کوئی دلیل وسند نہ مل سکتی۔ لیکن چونکہ تاریخ کو (قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل) سند مان لیا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس مسالہ موجود ہے۔ اس لئے اس سے ہر شخص کو اس کے ہر فیصلے اور عمل کی سند مل سکتی ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والوں نے اس کے جواب میں کہا۔

> غور فرمائیے۔ اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامت دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی

> دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ، تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثنا پیدا کر لے۔ اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کر دے (جیسا کہ مبینہ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حق خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہؓ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اور اقامت دین کی جد و جہد، اور ان طالع آزما سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصول اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں۔ جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ بولنا بھی جائز ہے

اس پر امیر جمات اسلامی ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ اقامت دین جیسے اہم مقصد کے حصول کے لئے اصولوں میں لچک اور استثناء تو ایک طرف، اس کے لئے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا:

> راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں ہے

> اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بد ترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ١٩٥٨ء)

تم حیران ہوگے سلیم! کہ ان صاحب نے ایسا کہنے کی جرأت کیسے کر لی اور اس کی تائید میں ان کے پاس کون سی سند ہو سکتی تھی؟ لیکن جس تاریخ سے انہوں نے پہلی سند پیش کی تھی اسی سے انہیں اس کی سند بھی مل گئی۔

حدیث سے اس کا ثبوت

چنانچہ انہوں نے ''جھوٹ کے وجوب'' میں دو تین حدیثیں نقل کر دیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ

> اسماء بنت یزید نبی اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اسے راضی کرے۔ جنگ اور، اصلاح بین الناس۔ (ترمذی)

اس کے بعد انہوں نے (معاذ اللہ) نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی مثالیں پیش کردیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے باالفاظ صریح انہیں اسکی اجازت دی۔ (بخاری)

امید ہے اس سے یہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ یہ حضرات تاریخ کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلاف قرآن اور غلط ہونا بدیہیات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ

(جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر سند قرآن رہے اور اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے، کہ قرنِ اول کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لئے دینی سند نہیں مل سکتی۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس قسم کے تاریخی بیانات کو دین میں سند تسلیم کرا لیا جائے اور پھر انہیں اپنے فیصلوں کی تائید میں پیش کر دیا جائے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس طبقہ کے تمام افراد اسی جذبہ کے ماتحت ان باتوں کو صحیح مانتے اور صحیح منواتے ہیں۔ ان میں بیشتر حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو ان باتوں کو نیک نیتی سے سچا مانتا ہے*۔ یہ اس لئے کہ صدیوں کی تقلید سے ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کے نزدیک دین کے معاملات میں غور و فکر سے کام لینا جائز نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہی صحیح ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ یہ حضرات اس تاریخ کی حفاظت و ترویج کو عین دینی خدمت سمجھتے ہیں۔ مفاد پرست طبقہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے اس قسم کی باتیں وضع کر کے انہیں ابتداءً ہماری تاریخ میں شامل کیا تھا۔ یہی اسے صدیوں سے مسلسل و متوارث آگے بڑھائے چلا آ رہا ہے اور یہی آج اس کے تحفظ کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اسکی ایک مثال سنو!

اسلام اور نظام سرمایہ داری

شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآن نے جس نظام کو الدین کہا ہے اس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہیں رہتی۔ وہ نوع انسانی کی بہبود کے لئے امت (یا نظام) کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم ایسی واضح، بیّن اور صاف ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تعبیر کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) میں قرآن کی اسی تعلیم پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد

---

*کسی مسلک کو نیک نیتی سے ماننا اس مسلک کی صداقت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کتنے بت پرست ہیں جو نہایت نیک نیتی سے بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے بت پرستی، حق و صداقت کا مسلک قرار نہیں پا سکتی۔

جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ہجوم کرکے آ گیا تو اسکی ضرورت پڑی کہ اسکی تائید اور جواز کے لئے سندیں وضع کی جائیں۔ یہ اسناد قرآن سے تو مل نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے تاریخ کا چور دروازہ ہی کام دے سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور اس قسم کی روایات وضع کیں جن سے سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کا نظام عین مطابق سنتِ رسول اللہ ؐ و سنتِ صحابہ رضؓ قرار پا جائے۔

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

مثلاً ایک روایات میں ہے:

ابن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴) "جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسول تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے"۔ تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمر رضؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمر رضؓ رسول اللہ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا نبی اللہ ؐ یہ آیت آپ کے صحابہ رضؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ حضور ؐ کا یہ بیان سنکر عمر رضؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد حضور ؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ نہ دوں جس کو انسان جمع کرکے خوش ہو۔ اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب مرد اس کو کوئی حکم

> دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ غائب ھو تو اس کے مال وِ اولاد کی حفاظت کرے۔ (ابوداؤد)——(مشکٰوۃ جلد اول۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۹)

یہ روایت زبانِ حال سے پکار کر کہہ رھی ھے کہ یہ وضع کردہ ھے ۔ یہ کبھی تصور میں بھی آسکتا ھے کہ خدا کا ایک حکم ھو اور صحابہؓ پر وہ گراں گذرے؟ پھر ان میں سے (کوئی اور بھی نہیں) حضرت عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس جائیں ۔ اور رسول اللہؐ خدا کے اس حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم اڑھائی فیصد سالانہ ادا کر دو تو تمہیں اجازت ھے کہ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رھو۔ روایت کا انداز بتا رھا ھے کہ یہ بعد کے دور کی وضع کردہ ھے ۔ لیکن چونکہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ ھوتا ھے اس لئے مفاد پرست گروہ اسے صحیح ترین حدیث قرار دے کر برابر آگے بڑھائے لا رھا ھے ۔ اسی قسم کی روایات ھیں جو آج بھی سرمایہ داری ۔ زمینداری اور جاگیرداری کی تائید میں بڑھ چڑھ کر پیش کی جاتیں ھیں ۔ اور جب کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں قرآن کے خلاف ھیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ھے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ھو یا رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ زیادہ سمجھتے تھے!

چونکہ اس خط میں پوری تاریخ کا استقصاء مقصود نہیں اس لئے میں اتنی مثالوں پر ھی اکتفا کرتا ھوں ۔ تم ان واقعات کو پھر سے سامنے لاؤ جو خلیفۂ اول کے انتخاب کے ضمن میں ھماری کتب احادیث و آثار میں بیان ھوئے ھیں اور پھر سوچو کہ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں اسلام اور متبعینِ اسلام کی پوزیشن کیا رہ جاتی ھے؟

پس چہ باید کرد؟

سوال یہ ھے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب آسان ھے یعنی:

(۱) ھمارا ایمان ھے کہ قرآن کریم خدا کی کتاب ھے جو حرفاً حرفاً اپنی حقیقی شکل میں ھمارے پاس موجود ھے۔

(۲) رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ لہذا

(۳) اگر اس دور کی تاریخ میں ہمیں کوئی بات ایسی ملے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تامل کہدینا چاہئیے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ خواہ وہ حدیث کے کسی مجموعہ میں ہو یا کسی اور کتاب میں۔

(۴) مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں قرنِ اول کی تاریخ کو ازسرنو مرتب کرنا چاہیئے۔ اس تاریخ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس دور میں قرآن کریم پر اس طرح عمل ہوا تھا۔

(۵) اس دور کے بعد قرآنی نظام باقی نہیں رہا تھا، اس لئے اس وقت سے آج تک کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتی ہے، نہ ہمارے لئے دلیل اور حجّت بن سکتی ہے۔ نہ ہی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدافعت میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کریں۔ ان کے متعلق ہم اس سے زیادہ ماننے کے مکلف نہیں کہ تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ۔ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۲/۱۳۱) ”یہ وہ لوگ ہیں جو گذر چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ ان کے لئے تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا“؟

(۶) جہاں تک قرآن کریم کے سمجھنے کا تعلق ہے وہ اپنے سے باہر تاریخ کا محتاج نہیں۔ اسے ہر زمانہ میں براہ راست سمجھا جا سکتا ہے۔ دین میں سند اور حجّت قرآن ہے۔ اور یہی ہمارے لئے غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

جب تک ہم اس مسلک پر عمل پیرا نہیں ہوتے، دین ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ سمجھے سلیم! کہ تاریخ کی صحیح پوزیشن کیا ہے اور اس کے متعلق صحیح مسلک کیا؟

اچھا خدا حافظ۔

والسلام

۱۹۵۹ جون

پرویز

چالیسواں خط

اسلامک آئیڈیالوجی کیا ھے ؟

سلیم میاں ! تمھارے سوال کا سیدھا جواب تو یہ تھا کہ میں نے اس موضوع پر جو کچھ آج تک لکھا ھے اسے غور سے پڑھو اور جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں یا جو مزید وضاحت چاھتی ھوں، وہ مجھ سے پوچھ لو۔ لیکن میں جانتا ھوں کہ تم اتنی محنت کبھی نہیں کروگے اور جو خلش تمھارے دل میں پیدا ھو رھی ھے وہ ویسی کی ویسی ھی رہ جائے گی۔ بلکہ اس کی شدت اور بھی بڑھ جائے گی۔ حقیقت یہ ھے کہ اس میں تمھارا خاص قصور بھی کچھ نہیں۔ ” خلاصوں،، کی مدد سے امتحان پاس کرنے کی عادت نے ھمارے نوجوانوں کو اس قدر سھل انگار بنا دیا ھے کہ وہ خود محنت کرکے کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے عادی نہیں رھے۔ وہ چاھتے یہ ھیں کہ سب کچھ پکا پکایا ان کے سامنے آ جائے۔ لھٰذا مجھے تمھارے سوال کا جواب دینا ھی ھوگا۔ اسے غور سے پڑھنا اور سنبھال کر رکھنا۔ میں اس موضوع پر جو کچھ برسوں سے لکھتا چلا آیا ھوں، اسے اس کا خلاصہ (Summary) سمجھو۔

تمھارا سوال یہ ھے کہ اسلامک آئیڈیالوجی (Islamic Ideology) کسے کہتے ھیں ؟ لیکن میں اگر تم سے پوچھوں کہ (اسلامک آئیڈیالوجی تو خیر، بعد کی

آئیڈیالوجی کے معنی

چیز ہے تم بتاؤ کہ) خود ''آئیڈیالوجی'' کے کیا معنی ہیں؟ تو مجھے یقین ہے کہ تم بغلیں جھانکنے لگ جاؤ گے۔ فلسفہ کی زبان میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں (Science Of Ideas) کو۔ یعنی علم کی وہ شاخ جس کا تعلق (Ideas) سے ہے۔ اب اگر تم پوچھو کہ (Idea) کسے کہتے ہیں تو اس کا جواب ایک خط میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک فنی مسئلہ ہے اور بڑی مشکل اصطلاح جس کی تاریخ اور تشریح کے لئے طویل فرصت چاہیئے۔ تم ان فلسفیانہ موشگافیوں کو چھوڑو اوز سیدھے سادے لفظوں میں یوں سمجھو کہ

> وہ بنیادی تصورات (Concepts) جن پر کسی نظام (System) کی عمارت استوار ہو، اُس نظام کی آئیڈیالوجی کہلاتے ہیں۔
>
> لہٰذا اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہونگے وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اب تم پوچھو گے کہ میں اسلام کے ساتھ لفظ ''نظام،، کیوں لایا ہوں؟ نظام کے معنی ہوتے ہیں (اُس زبان میں جسے تم آسانی سے سمجھ لیتے ہو) سسٹم (System) یا (Order) لہٰذا ''اسلامی نظام،، کے معنی ہوں گے (Islamic System) یا (Islamic Order)۔ اسی کو اسلامی طریقِ زندگی (Islamic Way Of Life) کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ اسلام کے ساتھ لفظ نظام کیوں لایا جاتا ہے؟

میں تمہیں اس سے پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں کہ اسلام، مذہب (Religion) نہیں، الدین ہے۔ قرانِ کریم میں ''مذہب،، کا لفظ تک نہیں آیا۔

مذہب اور دین میں فرق

اس نے اسلام کو ''الدین،، کہہ کر پکارا ہے۔ مذہب (Religion) اور الدین میں فرق کیا ہے۔ اسے سمجھ لینے سے یہ بات واضح ہو جائیگی کہ اسلام کے ساتھ لفظ ''نظام'' کیوں لایا گیا ہے۔

مذھب یا (Religion) کا بنیادی تصور یہ ھے کہ خدا (یعنی کوئی ایسی ھستی جسے انسان اپنے ذھن میں خدا تصور کر لے) کائنات سے کہیں الگ بیٹھا ھے۔ اس کی کیفیت ایک بادشاہ (یا ڈکٹیڑ) کی سی ھے۔ جب بادشاہ کسی سے ناراض ھو جائے تو وہ شخص عتاب میں آجاتا ھے۔ اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ھے۔ ان مصیبتوں سے بچنے کا طریق صرف ایک ھے اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی خوشنودی حاصل کر لی جائے۔ اس کے لئے اس کی حمد وستائش کے قصیدے پڑھنے چاھیئں۔ اس کی خوشامد کرنی چاھئیے۔ اس کے حضور نذرانے پیش کرنے چاھئیں۔ جو اس کے مقرب ھوں ان سے اس تک سفارشیں پہنچانی چاھئیں۔ جب اس طرح بادشاہ کو خوش کر لیا جائے تو پھر نہ صرف وہ مصیبتیں ٹل جاتی ھیں بلکہ انعام واکرام بھی ملتا ھے۔ وہ جاگیریں بخش دیتا ھے۔ اپنا مقرب بنا لیتا ھے۔ جاہ ومناصب عطا کر دیتا ھے۔ چونکہ ذھنِ انسانی کے تراشیدہ خدا کا تصور ’’بادشاہ،، کا سا ھوتا ھے اس لئے ’’خدا کے پرستار،، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ھیں جو ایک بادشاہ کی رضاجوئی حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ھے۔ اسے مذھبی مراسم یا پوجا پاٹ سے تعبیر کیا جاتا ھے۔

یہ ظاھر ھے سلیم! کہ خدا کے اس تصوّر کے ماتحت کسی نظام کی ضرورت ھی لاحق نہیں رھتی۔ اس میں ایک فرد کا ’’اپنے خدا،، کے ساتھ پرائیویٹ تعلق ھوتا ھے۔ وہ فرد، تنہائی میں بیٹھ کر، اپنی مصیبتوں کے ازالے اور بخشش کے حصول کے لئے خدا سے منت سماجت کرتا ھے اور وھاں سے فارغ ھو کر دنیا کے دھندوں میں لگ جاتا ھے۔

اسے مذھب یا (Religion) کہتے ھیں۔ یہ انسانوں کے اپنے ذھن کا پیدا کردہ تصوّر ھے اور اُس قدیم زمانے کا پیدا کردہ جب انسان، کائنات کی مہیب قوتوں (بجلی۔ بادل سیلاب۔ ۔ آگ۔ امراض وغیرہ) کے اسباب سے واقف، اور ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اُس زمانے میں اُسے اپنے سے زیادہ طاقتور سے ڈرنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

لیکن خدا کا جو تصوّر حضرات انبیاء کرامؑ کے ذریعے (وحی کی رو سے) ملا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی رو سے خدا اس ہستی کا نام ہے جو کائنات کے عظیم سلسلے کو اپنے اٹل قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ ان قوانین کے مطابق ہر شے اپنی ابتدائی حالت سے ترقی کرتی اور نشو و نما پاتی اپنی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے (جس طرح بیج، نشو و نما پا کر آہستہ آہستہ درخت بن جاتا ہے)۔ خدا نے جس طرح کائنات کی باقی اشیاء کی نشو و نما کے لئے قوانین عطا کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانوں کی نشوونما کے لئے بھی قوانین دئیے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں وہ نشوونما پا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جو ان کے خلاف چلتے ہیں، وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں (جس طرح اس بیج کا ستیاناس ہو جاتا ہے جسے قانونِ فطرت کے خلاف سخت زمین میں دبا دیا جائے)۔

قوانین خداوندی

اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا سلیم! کہ خدا کے اس تصوّر کی رو سے جو اس نے وحی کی رو سے عطا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدا کا وہی تصور صحیح ہو سکتا ہے جسے وہ خود انسانوں کو بتائے) انسان کا خدا سے تعلق درحقیقت اُن قوانین سے تعلق ہے جو اس نے انسانوں کی نشو و نما کے لئے متعین کئے ہیں۔ خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت کو انسانی ذہن سمجھ نہیں سکتا۔ ہم صرف ان قوانین کو سمجھ سکتے ہیں جو خدا نے ہماری نشوونما کے لئے ہمیں دئے ہیں۔ اس ضابطۂ قوانین کا نام قرآنِ کریم ہے۔ یہ انسانوں کی راہ نمائی کے لئے آخری، مکمل اور واحد ضابطۂ قوانین ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ جب کوئی فرد تنہا زندگی بسر کرے تو اسے کسی قاعدے اور قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کی پابندی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب انسان مل جل کر رہیں۔ جنگل میں کوئی دائیں طرف چلے یا بائیں طرف، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن شہر کی سڑکوں پر اگر قاعدے اور قانون کے خلاف چلا جائے تو نتیجہ فوراً سامنے آ جاتا ہے۔ خدا نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے قوانین دیئے ہی اس لئے ہیں کہ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔ جب

بہت سے انسان کسی قاعدے اور قانون کے مطابق مل جل کر رہیں تو اسے نظام، سسٹم یا (Order) کہتے ہیں۔ اسے قرآن نے الدین سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں انسان اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔

اس سے سلیم! یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ

(۱) مذہب اور الدین میں فرق کیا ہے ـــ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسانوں کی اجتماعی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس، الدین اس نظامِ خداوندی کا نام ہے جس کے مطابق اجتماعی زندگی بسر کی جائے۔

(۲) اسلام، مذہب نہیں۔ الدین ہے۔

(۳) اسی کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔ یعنی وہ اجتماعی طریق جس میں زندگی، قوانین خداوندی کے مطابق بسر کی جائے۔ اور

کلمئہ طیبہ کا مفہوم

(۴) اسلامک آئیڈیالوجی کے معنی ہیں وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے فلسفۂ زندگی۔ نصب العین حیات، منزلِ مقصود۔ وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے ''کلمہ'' کہہ کر پکارا ہے (یعنی نظریۂ زندگی) اور اس کے ساتھ لفظ ''طیّب'' کا اضافہ کرکے اسے درخت سے تشبیہہ دی ہے۔ ''طیّب'' کے عام معنی تو خوشگوار کے ہیں لیکن یہ لفظ اس درخت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو نہایت عمدہ پھل دے۔ سورۂ ابراھیم میں ہے مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا..... (۱۴/۲۴) کلمہ طیبہ کی مثال ایک شجر طیّب کی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم ہوں اور اس کی شاخیں آسمان (کی بلندیوں) میں پھیل رہی ہوں۔ اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں پھل دیتا چلا جائے۔

یہ ہے سلیم ! اسلامک آئیڈیا لوجی۔ یعنی وہ تصوراتِ حیات جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل ہوں اور جو نظام ان کی بنیادوں پر قائم کیا جائے وہ مکان (یعنی Space) کی حدود (Limitations) سے بے نیاز ہو کر ساری دنیا کو محیط ہو۔ اور اس کے انسانیت پرور نتائج ، زمان (Time) کی قیود سے بلند ہو کر ، ہر زمانے میں تازہ بتازہ سامنے آتے رہیں۔ اس مثال کو سلیم ! اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو کیونکہ آگے چل کر اس سے ایک اہم اصول سامنے آئے گا۔

آئیڈیالوجی اور عمل

” درخت ،، کی مثال میں سلیم ! ایک اور نقطہ بھی قابل غور ہے۔ درخت کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کا بیج عمدہ ہو۔ اس میں بڑھنے۔ پھولنے اور پھلنے کی صلاحیت ہو۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ اُس بیج کی نشو و نما کے لئے ایک پروگرام کے مطابق محنت کی جائے۔ اس کے لئے زمین تیار کی جائے۔ کھاد ڈالی جائے۔ پانی دیا جائے۔ حرارت اور روشنی کا انتظام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اسے موسموں کی شدت سے بچایا جائے۔ جانوروں کی یورش سے محفوظ رکھا جائے۔ دیکھو سلیم ! قرآن اس عظیم حقیقت کو کس انداز میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ ۔ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) خوشگوار نظریہٴ زندگی (آئیڈیالوجی) میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ” خدا کی طرف ،، بلند ہوتا چلا جائے ۔ یعنی ان بلندیوں تک پہونچ جائے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کی ہیں ۔ لیکن وہ از خود ایسا نہیں کر سکتا — وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (٣٥/١٠) انسان کا عمل صالح اسے بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی اس کے لئے اس عملی پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی مناسب نشو و نما کر سکے۔ قرآن کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کو ایمان اور اسے کامیاب بنانے کے لئے عملی پروگرام کو اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے سلیم ! کہ کلمہٴ طیبہ یا آئیڈیالوجی ، اسلامی نظام کا نصب العین ہوتا ہے۔ اور اعمالِ صالحہ وہ پروگرام جو اس نظام پر چلنے والوں کو

اس نصب العین تک لے جائے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ کلمۂ طیّبہ یا آئیڈیالوجی اسلامی مملکت کی قرار داد مقاصد (Objective Resolution) ہوتی ہے۔ اس کا آئین (Constitution) اس قرار داد کو سیاسی پیکر عطا کرتا ہے اور مملکت کے قوانین، کاروانِ امت کو اس منزل تک لے جانے کا پروگرام متعین کرتے ہیں۔

یہ ہے سلیم! اسلامک آئیڈیالوجی کی (Definition) یعنی

وہ بنیادی تصورات جن پر اسلامی نظامِ زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

یا

وہ نصب العین جس تک پہنچنا اسلامی معاشرہ کا مقصودِ حیات ہوتا ہے۔

جو کچھ کہا گیا ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو۔ اس لئے کہ یہ مشاعرہ نہیں کہ تم جب جی چاہے ''مکرر،، کہہ دو اور میں شعر دہرانے پر مجبور ہو جاؤں۔ یہ باتیں روز روز نہیں لکھی جا سکتیں۔

اب آگے بڑھو اور یہ سمجھو کہ یہ تصورات یا نصب العین ہے کیا؟

زندگی کے متعلق دو نظرئیے

میں تمہیں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان بھی (دیگر حیوانات کی طرح) صرف طبیعی جسم (Physical Body) رکھتا ہے۔ اس کا جسم فطرت کے طبیعی قوانین (Physical Laws Of Nature) کے مطابق زندہ رہتا ہے اور کچھ وقت کے بعد، انہی قوانین کے مطابق اس کی مشینری چلنے سے رک جاتی ہے۔ اسے اس کی موت کہتے ہیں جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کو میکانکی تصوّر حیات (یا Mechanistic Concept Of Life) کہتے ہیں۔ جو نظام اس نظریہ کے مطابق قائم ہوتا ہے اس کا نصب العین یا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس مملکت کی حدود میں رہنے والے افراد کی جسمانی پرورش کا انتظام کرے۔ اچھی مملکت وہ ہوتی ہے جس مین افراد کی پرورش کا انتظام اچھا ہو۔ یعنی ہر ایک کو سامانِ زندگی فراوانی سے اور بسہولت ملتا جائے۔ قرآن کریم اس نظریہ کو حیوانی

مادی نظریۂ زندگی

سطح زندگی (Animal Lavel) قرار دیتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے ۔ سورۂ محمدؐ میں ہے وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ ۔ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (۴۷/۱۲) اور جو لوگ (انسانی نظریۂ زندگی سے) انکار کرتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں (بالکل اس طرح) جس طرح حیوانات کھاتے پیتے ہیں ۔ ان کا مقام جہنم کی آگ ہے (جس میں شرفِ انسانیت کی کھیتی جل کر راکھ ہو جاتی ہے) ۔

قرآنی نظریۂ زندگی

دوسرا نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں ۔ اس کے پاس جسم کے علاوہ ایک اورشے بھی ہے جو حیوانات کو نہیں ملی ۔ صرف انسان کو عطا ہوئی ہے ۔ اسے انسانی ذات (Human Personality) یا نفس (Self) کہتے ہیں ۔ انسانی ذات نہ مادی ارتقاء (Material Evolution) کی پیداوار ہے اور نہ طبیعیاتی قوانین (Physical Laws) کے تابع ۔ یہ ہر انسانی بچے کو — خواہ وہ بادشاہ کے محل میں پیدا ہو یا فقیر کی جھونپڑی میں ۔ برھمن کے گھر میں ہو یا شودر کے ۔ اس کے ماں باپ مسلمان ہوں یا غیر مسلم — خدا کی طرف سے پیدائش کے ساتھ عطا ہوتی ہے ۔ انسانی ذات نشوونما یافتہ شکل (Developed Form) میں نہیں ملتی بلکہ مضمر (Potent) اور امکانی (Realisable Possibilities کی) صورت میں ملتی ہے ۔ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں ، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے (قرآن کریم میں) قوانین دئیے گئے ہیں ۔ اگر ان قوانین کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے تو اس میں ، حدود بشری کے اندر ، ان صفات کی نمود (Manifestation) ہوتی جاتی ہے جنہیں (لامحدود حیثیت سے) صفات خداوندی کہا جاتا ہے ۔ نشوونما یافتہ ذات ، انسانی جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہوجاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے ۔ انسانی زندگی کا مقصد ذات کی نشوونما ہے ۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ اس سے تمہارے دل میں کیا خیالات پیدا ہونگے۔ تم کہوگے کہ میں نے یہ کون سی نئی بات کہ دی ہے۔ یہ تو وہی پرانی کہانی ہے جسے ہم مذہب والوں (مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں) کی زبانی سنتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد ''روحانی ترقی،، ہے۔ لیکن سلیم! یہ وہی بات نہیں۔ اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ ''مذہب والوں'' کا عقیدہ یہ ہے کہ

مذہب والوں کی روحانی ترقی

(۱) انسانی جسم (بلکہ پوری کی پوری مادّی دنیا) روحانی ترقی کے راستہ میں روک بن کر حائل ہے۔ جب تک اسے راستے سے نہ ہٹایا جائے روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا

(۲) روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان دنیا ترک کرے۔ آرزوؤں کا خاتمہ کرے۔ تمام مادی آسائشوں کو قابلِ مذمت قرار دے۔ ان سے نفرت کرے اور کنارہ کش ہوتا چلا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

(۳) انسان انفرادی زندگی بسر کرے۔ خلوت کدوں میں رہے اور اللہ سے لو لگاتے ہوئے انسانوں سے قطع تعلق کرتا چلا جائے۔

لیکن قرآن کریم کی رو سے انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ

(الف) انسان خارجی کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو، قوانینِ خداوندی کے مطابق، تمام نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے عام کرتا چلا جائے۔ یاد رکھو سلیم! جس طرح اُس انڈے میں کبھی بچہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کا خول ثابت نہ رہے، اسی طرح انسانی ذات کی نشو و نما نہیں ہو سکتی جب تک اس کی زندگی مادی لحاظ سے محکم اور مضبوط نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

قرآن کی رو سے ذات کی نشو و نما

(ب) انسان اجتماعی زندگی بسر کرے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں ہر شخص کی جسمانی ضروریات بھی بآسانی پوری ہوتی رہیں اور اسے اس کی ذات

کی نشو و نما کے پورے پورے مواقع اور اسباب و ذرائع بھی میسر ہوں۔

اِسلامی مملکت کا فریضہ

(ج) اس قسم کے معاشرے کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے اور انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری اسباب و ذرائع فراہم کرنے کی ذمہ دار ہو۔ (’’ذمہ دار،، کا لفظ قابل غور ہے) اسے بھی سمجھ لو کہ ’’ذات کی نشو و نما،، میں قلب و دماغ (Head And Heart) کی تمام صلاحیتوں کی نشو و نما آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر، خدا کی صفت علیم اور خبیر ہے۔ لہذا اس فرد کا جس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو، علیم و خبیر (صاحب علم اور با خبر) ہونا لازمی ہے۔ اس کے لئے ذہنی نشو و نما ضروری ہے۔ دوسری طرف خدا کی صفت ربوبیت اور رزاقیت ہے۔ اس لئے جس فرد کی ذات کی نشو و نما ہو رہی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا جذبہ اپنے اندر رکھے اور ان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔ اسے تم ’’قلب،، کی نشو و نما کہہ سکتے ہو۔ اگرچہ اس میں قلب کا تصور، (Mind) کے اُس تصور سے مختص ہے جو آجکل مغرب میں رائج ہے۔ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ہر فرد مملکت کی ان صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی چلی جائے اور اس طرح یہ معاشرہ صفاتِ خداوندی کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائے۔

مملکت مقصود بالذات نہیں

اس سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآن کریم کی رو سے مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں۔ ’’مقصود بالذات،، کے معنی ہیں (End in Itself)۔ یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے افراد کی ذات کی نشو و نما جو اپنی آزاد مملکت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہذا اسلامی مملکت کے قیام (Establishment) بلکہ اس کی ہستی (Existence) کا جواز (Justification) یہ ہے کہ وہ افراد مملکت کی ذات کی نشو و نما (جس میں جسمانی نشو و نما سب سے پہلے آتی ہے) کی ذمہ دار ہے۔ جو مملکت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی وہ اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

فرد اور معاشرہ کا تعلق

اس مقام پر لازماً تمہارے دل میں یه خیال پیدا ھوگا که میں نے اس وقت تک جو کچھ کہا ھے اس کا ماحصل یه ھے که قرآنی نظام میں ساری ذمه داری مملکت کی قرار پاتی ھے۔ سوال یه ھے که اس میں افراد کو بھی کچھ کرنا پڑتا ھے یا نہیں؟ یه سوال اھم ھے۔ حقیقت یه ھے سلیم! که اگر تم انسان کی تمدنی زندگی کی تاریخ پر نظر ڈالو تو یه حقیقت تمہارے سامنے آئے گی که انسان کے سامنے شروع سے آج تک مسئله ھی ایک رھا ھے، یعنی یه که فرد اور معاشرہ (سوسائٹی۔ مملکت) کا باھمی تعلق کیا ھے؟ انسان نے جتنے نظام وضع کئے ھیں ان میں صورت یه رھی ھے که جب سوسائٹی یا مملکت کو اھمیت دی گئی تو اس میں افراد کی انفرادیت (Individuality) ختم ھو گئی۔ اور جب افراد کی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تو ان کے اجتماعی نظام میں انتشار واقع ھو گیا۔ قرآن کریم نے ایک ایسا نظام دیا ھے جس میں افراد کی انفرادیت بھی دن بدن بلند سے بلند تر ھوتی جاتی ھے اور اس کے ساتھ ان کا نظم اجتماعی بھی محکم سے محکم تر ھوتا جاتا ھے۔ اس نظام کا راز پوشیدہ ھے فرد اور معاشرہ کے اس تعلق میں جسے قرآن کریم نے واضح طور پر متعین کیا ھے۔ لیکن قبل اس کے که میں اُس تعلق کی وضاحت کروں، دو ایک باتیں بطور تمہید بیان کرنی ضروری ھیں۔

مشکل یه ھے سلیم! که بات تم نے ایسی پوچھی ھے جس کے جواب میں اسلام کا سارا نقشه تمہارے سامنے آ جانا چاھیئے۔ اس کے بغیر بات واضح نہیں ھو سکتی۔ اور تقاضا تمہارا یه ھے که میں کسی بنیادی نکته کے متعلق بھی یه نه کہوں که اس کی بابت میں تمہیں پہلے بتا چکا ھوں۔ اس لئے مجھے اس قدر تفاصیل میں جانا ضروری معلوم ھوتا ھے۔ ورنه سوچو اور جواب دو که ان میں سے کون سی بات ایسی ھے جسے میں تمہیں اس سے پہلے بالواسطه یا بلا واسطه نہیں بتا چکا۔

اطاعت صرف خدا کی ھو سکتی ھے

اب سنو وہ تمہید! قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں کہه دیا ھے

کہ کسی فرد، معاشرہ یا مملکت کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔ اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔

لیکن خدا نہ تو ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ نہ کبھی ہم نے اس کی آواز سنی ہے۔ اس لئے اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کی اطاعت کی جاتی ہے ان قوانین کی رو سے جو اس نے بذریعہ وحی دیئے ہیں۔

لیکن قوانین کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے یہ اجتماعی نظام، اسلامی مملکت کہلاتا ہے۔ لہذا خدا کی اطاعت سے عملاً مفہوم ہے اس مملکت کی اطاعت جو قوانین خداوندی کو نافذ کرے۔

مملکت خدائی ذمہ داریاں پوری کرے گی

لیکن اس مملکت سے خدا یہ کہتا ہے کہ جب تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لیتے ہو تو میں نے انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں تمہیں ان کو پورا کرنا ہوگا۔ اگر تم خدائی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتے تو تمہیں اس کا حق حاصل نہیں کہ تم میرے نام پر انسانوں سے اطاعت لو۔ اطاعت لینا اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا ساتھ ساتھ چلے گا۔ لہذا قرآنی نظام میں فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ فرد، مملکت کی وساطت سے، قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا ہے اور مملکت ان تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے جو خدا نے افراد سے کر رکھے ہیں۔ فرد اور مملکت کا یہ تعلق ایک معاہدہ کی رو سے قائم ہوتا ہے جسے قرآن نے سورۂ توبہ میں مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے ”یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں تاکہ وہ انہیں جنت دے“۔ ان تصریحات کی روشنی میں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں، اس کا مفہوم واضح ہے۔ عملی دنیا میں

افراد اور مملکت میں معاہدہ

افرادِ معاشرہ اپنی جانیں اور مال اُس اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتے ھیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کی ضامن ھوتی ھے اور اس کے بدلے میں یہ مملکت انھیں ”جنت“ عطا کر دیتی ھے۔ یہ تمھیں معلوم ھی ھے سلیم! کہ ایک جنت وہ ھے جو انسان کو مرنے کے بعد ملے گی۔ لیکن قرآن کریم اس دنیا میں اسلامی معاشرہ کو بھی جنت سے تعبیر کرتا ھے اور اس کی خصوصیت یہ بتاتا ھے کہ اس میں انسانی جسم کی پرورش اور ذات کی نشو و نما کے لئے تمام سامان اور ذرائع فراوانی سے موجود ھوتے ھیں۔ لہذا مذکورہ صدر معاھدہ کی رو سے، فرد اپنی جان اور مال، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے، اسلامی مملکت کے سپرد کر دیتا ھے اور مملکت اس کی جملہ بنیادی ضروریاتِ زندگی اور اس کی ذات کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار بن جاتی ھے۔ اس طرح فرد، اپنی جان اور مال معاشرہ کے حوالے کر دینے کے باوجود اپنی انفرادیت (ذات) قائم رکھتا ھے (بلکہ وہ نشو و نما پا کر مستحکم سے مستحکم تر ھوتی چلی جاتی ھے)۔ اور مملکت کا نظام محکم بنیادوں پر استوار رھتا ھے۔

رزق کے سر چشمے

یہ بھی ظاھر ھے سلیم! کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو سر انجام دے نہیں سکتی جب تک رزق کے سر چشمے اور وسائل پیداوار اس کی تحویل میں نہ ھوں۔ ویسے بھی، جب افراد اپنی جان اور مال (سب کچھ) مملکت کے سپرد کر دیں تو وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ھوتا۔ افراد کی ضروریات کی ذمہ دار مملکت ھوتی ھے اور اس کے لئے وسائل پیداوار اس کی تحویل میں رھتے ھیں۔

غیر متبدل اصول

میں اوپر لکھ چکا ھوں کہ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے (طبیعی) قوانین (Physical Laws) مقرر ھیں اسی طرح انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی قوانین متعین ھیں۔ ان قوانین کو قرآن کریم ”کلمات اللہ“ کہہ کر پکارتا ھے اور ان کی خصوصیت یہ بتاتا ھے کہ وہ غیر متبدل ھیں۔ یعنی ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ھو سکتا (تم پہلے

دیکھ چکے ہو کہ قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کے لئے ''کلمہ،، کا لفظ استعمال کیا ہے — ''کلمات،، اس کی جمع ہے۔ لہذا کلمات اللہ وہ تصورات حیات ہیں جن کے مجموعہ کا نام اسلامک آئیڈیالوجی ہے۔ یہ تصورات غیر متبدل ہیں) سورۂ انعام میں ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶) ''تیرے رب کی طرف سے عطا کردہ نظریۂ زندگی (یا تصور حیات) صداقت اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ ان تصورات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں'' ۔ یعنی اسلامک آئیڈیالوجی (تصور حیات) مکمل بھی ہے اور ناقابل تغیر و تبدل بھی۔ انہی تصورات کو غیر متبدل اصول (Inviolable Principles) یا مستقل اقدار (Permanent Values) کہتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشو و نما انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔

جب اسلامی مملکت، افراد کی ذات کی نشو و نما کے لئے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہے تو اس سے لامحالہ مطلب یہ ہے کہ اس مملکت کا سارا کاروبار (خدا کی طرف سے عطا کردہ) مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کے مطابق سر انجام پائے گا۔ یہ ہوئی پہلی بات۔

اب دوسری بات سنو۔ تم یہ دیکھ چکے ہو کہ جب کسی فرد کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے تو اس میں (حدود بشری کے اندر) ان صفات کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے جنہیں (لامحدود انداز میں) صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی ذات خداوندی میں یہ صفات لامحدود انداز میں ہوتی ہیں اور انسانی ذات میں ان صفات کی نمود محدود طور پر ہوتی ہے۔ اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی فرد کی ذات کی نشو و نما ہو رہی ہے یا نہیں تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس میں وہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں جنہیں صفات خداوندی کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب ایک فرد میں، جو مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے، صفات خداوندی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے تو جو مملکت ان اقدار کے مطابق قائم ہوگی اور انہی کے مطابق

مملکت صفات خداوندی کی مظہر

چلے گی اس میں صفات خداوندی کی نمود اور بھی شدت اور عظمت کے ساتھ ہوگی۔ لہذا اسلامی مملکت کی خصوصیت (اور پہچان) یہ ہے کہ وہ (بشری معاشرہ کی حدود کے اندر) صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے۔

ان دونوں باتوں کے یکجا کرنے سے نتیجہ یہ نکلا کہ

(۱) اسلامی مملکت کا نظم و نسق مستقل اقدار کے مطابق ہوتا ہے۔ اور

(۲) وہ مملکت صفات خداوندی کی مظہر (اور خدائی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کی ضامن) ہوتی ہے۔

قرآن نے مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کوئی دقّت نہیں ہو سکتی کہ فلاں مملکت اسلامی ہے یا نہیں۔ لہذا سمٹ سمٹا کر بات یوں سامنے آئی کہ

خلاصۂ مبحث

(ا) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار (یا غیر متبدل اصولوں) کا نام ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت انہی اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتی ہے۔

(ج) اس مملکت کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ افراد مملکت کی جسمانی پرورش اور ذات کی نشو و نما کے سامان و ذرائع فراہم کرے۔ اور

(د) اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ ان صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو جن کی تفصیل قرآن کریم میں بیان ہوئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خیال انگڑائیاں لیے رہا ہوگا کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جن سے اسلامک آئیڈیالوجی ترتیب پاتی ہے۔ اور جن کی بنیادوں پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ سوال تمہارے دل میں پیدا ہونا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ، جب تک یہ (مستقل) اقدار سامنے نہ آئیں، نہ اسلامک آئیڈیالوجی سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسلامی مملکت کا صحیح تصور

قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اقدار تو سارے قرآن کریم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انہیں ایک خط میں کس طرح سمویا جا سکتا ہے۔ (ان کی تفصیل میں نے اپنی اُس کتاب میں دی ہے جو آجکل زیر ترتیب ہے اور جس کا عنوان ہے — اسلام کیا ہے؟ — تمہیں اس کی اشاعت کا انتظار کرنا ہوگا)

لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اتنا انتظار نہیں کر سکو گے اور دامن پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے کہ چچا جان! ساری نہیں تو چند ایک اقدار ہی بتا دیجئے۔ اور یہ اس لئے کہ تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ میں تمہارے تقاضوں کو رد نہیں کر سکتا۔

چند ایک مستقل اقدار کا تعارف

— ہاں سلیم! میں کسی ایسے متلاشیٔ حقیقت کے تقاضوں کو رد نہیں کر سکتا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (٢٦/٨٩) جو اللہ کی طرف قلبِ سلیم لے کر آئے — اس لئے ان اقدار میں سے چند ایک (تمثیلاً) لکھے دیتا ہوں۔ غور سے سنو!

پہلی قدر — احترام آدمیت

یہ تم دیکھ چکے ہو کہ ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے وہ شے (پیدائش کے ساتھ) ملتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلی مستقل قدر یہ ہے کہ

ہر انسانی بچہ، محض انسانی بچہ ہونے کی جہت سے، قابل عزت ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (١٧/٧٠) "یقیناً ہم نے ہر فرزندِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔" اس میں کالے گورے۔ سید پٹھان۔ امیر غریب۔ مسلم غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر ابن آدم، محض آدمی کا بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی مساوات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

لیکن اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے کہ "انسانی مساوات" کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس لئے کہ (وہ ممالک تو ایک طرف رہے جن میں آمریت یا ڈکٹیٹر شپ کا دور دورہ ہے، جن اقوام میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں بھی)

حقیقی آزادی

مساوات کا مطلب اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو حق رائے دہندگی دیدیا جائے۔ جس مساوات کی عمارت انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے اس کا مفہوم اس سے کہیں وسیع اور بلند ہے۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات (Basic Characteristics) میں یہ بھی ہے کہ کوئی ذات کسی دوسری ذات کے مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار (Instrument) نہیں بن سکتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد، اپنے مفاد کے حصول کے لئے، کسی دوسرے فرد کو بطور ذریعہ استعمال نہیں کر سکتا۔ سلیم! یہ بات بظاہر تو چھوٹی سی ہے لیکن تم جوں جوں اس پر غور کرتے جاؤ گے یہ حقیقت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے گی کہ انسان کی حقیقی آزادی کا راز اسی چھوٹی سی بات کے اندر پوشیدہ ہے۔ جس معاشرہ میں ہر فرد کو اس کا حتمی یقین اور کامل اطمینان ہو کہ اسے کوئی دوسرا فرد اپنے مقصد کے حصول کے لئے بطور ذریعہ استعمال نہیں کر سکتا اُس معاشرہ میں آزادی کی جو فضا پیدا ہو سکتی ہے اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری قدر ــ تعاون

لیکن تم یہ کہو گے کہ اس طرح دنیا کے کام کیسے چل سکتے ہیں۔ تمدنی زندگی کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ایک کام کو مختلف لوگ مل کر کریں۔ یہ ٹھیک ہے۔ اور خود قرآن کریم بطور مستقل قدر اس کی تاکید کرتا ہے جب کہتا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (۵/۲) ’’زندگی کی کشاد کی راہوں میں اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرو،،۔ لیکن اس میں اور جو بات میں کہہ رہا تھا اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے.. اس میں تعاون کا حکم ہے۔ اور تعاون کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مقصد اجتماعی ہو جو سب کو نوع انسانی کی منفعت اور بھلائی کی طرف لے جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے، تمام افراد' تقسیم کار کے اصول کے مطابق، ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہ ہے ’’بر اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون،،۔ اس کے برعکس،

جو بات میں کہہ رہا تھا، وہ یہ تھی کہ ایک فرد، اپنے ذاتی اورانفرادی مفاد کے حصول کے لئے، دوسرے انسانوں کو اس طرح استعمال کرے جس طرح مادی اسباب وذرائع (مثلاً مشینوں کو) یا حیوانات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ہم گھوڑے کو تانگے میں جوتتے اور اسے اسٹیشن لے جاتے ہیں تو اس میں گھوڑے کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ مقصد صرف ہمارا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جب انسانوں کو اس طرح استعمال کیا جائے تو وہ انسان نہیں رہتے، مشینوں یا حیوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں جن میں ذات (Personality) نہیں ہوتی۔ یہ انسانی ذات کا اِنکار اور انسانیت کی تذلیل ہے۔ اس سے فرزند آدم واجب التکریم نہیں رہتا۔ ایسا کرنے میں ہم قرآن کریم کی ایک مستقل قدر کا اِنکار کرتے ہیں۔ اور قرآن کریم کی کسی مستقل قدر کا انکار کفر ہے۔

احتیاج !

تم جانتے ہو سلیم ! کہ ایک انسان حیوانوں کی طرح دوسرے انسانوں کے مفاد کے حصول کا ذریعہ کیوں بنتا ہے؟ اس کا جواب بلکل واضح اور بیّن ہے۔ اسے احتیاج ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک قلی گالیاں کھا کر بھی کام کئے جاتا ہے۔ اسلئے کہ اسے معلوم ہے کہ اگر و ایسا نہیں کرے گا تو وہ بھوکا مر جائے گا۔ یہ بھوک کا خوف (یا احتیج) ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے مفاد کے حصول کا ذریعہ بننے پر مجبور کرتا ہے۔ غلط معاشرے میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے (اور ان حالات کو مسقلاً قائم رکھا جاتا ہے) جن میں بعض افراد، اپنی روٹی (یعنی بنیادی ضروریات زندگی) کے لئے دوسرے افراد کے دست نگر رہیں۔ اس سے وہ ان افراد کے مفاد کا ذریعہ (Instrument) بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں کوئی فرد اپنی ضروبات کے لئے کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوتا۔ معاشرہ تمام افراد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لیتا ہے اور اس طرح اس بنیادی علت کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے جو انسانی ذات کے عملی انکار کا موجب اور فرد کی تذلیل کا باعث بنتی ہے۔ یوں اس معاشرہ میں اس مستقل قدر پر عمل ہوتا ہے کہ ”ہر ابن آدم، محض انسان ہونے کی جہت سے، واجب التکریم ہے۔“

اس مقام پر تم کہدو گے کہ مختلف انسانوں میں قابلیت اور صلاحیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے کمانے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص زیادہ کمانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ دوسرا کم کمانے کی۔ اس طرح بعض افراد کو دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

انفاق — تیسری مستقل قدر

یہ ٹھیک ہے کہ مختلف افراد میں کمانے کی استعداد میں فرق ہوتا ہے اور اس سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن قرآن کریم انسانی ذات کی مستقل قدر پر ایمان سے، ان مفاسد کا بھی صحیح صحیح علاج کر دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش اس سے ہوتی جسے وہ اپنے آپ پر صرف کرے۔ لیکن، اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشو و نما اس سے ہوتی ہے جسے وہ فرد، دیگر افراد انسانیہ کی پرورش کے لئے عام کر دے۔ لہذا جن افراد میں کمانے کی صلاحیت ہو، ان کا یہ بھی ایمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے جس قدر دوسروں کی نشو و نما کے لئے دے دیں گے، اتنی ہی ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوگی۔ اور چونکہ ذات کی نشو و نما زندگی کا مقصود ہے، اس لئے وہ اپنی کمائی میں سے اپنے لیے صرف بقدر ضرورت رکھیں گے۔ باقی سب کچھ دیگر افراد کی پرورش کے لئے کھلا رکھیں گے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ”انفاق فی سبیل اللہ“ کہتے ہیں، جو ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تم پوچھو گے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی نشو و نما کے لئے ”انفاق“ کی ضرورت پڑتی ہے؟ ان میں سے ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو کسی حادثہ کی وجہ سے (خواہ پیدائشی ہو یا بعد میں واقع ہو گیا ہو) کمانے کی استعداد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کی پرورش (دنیا کے موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں) امیروں کی خیرات سے ہوتی ہے۔ لیکن خیرات سے انسانی ذات کی جس قدر ذلت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ان کی پرورش کا یہ انتظام قرآن کریم کے نزدیک ایک مستقل نظام کی حیثیت سے کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ وہ اسے ہنگامی حالات میں تو برداشت

کر سکتا ہے لیکن اسے معمول حیات نہیں بنا سکتا ۔ (اس اصول کو یاد رکھو سلیم! کہ جس بات سے انسانی ذات کی کسی طرح بھی تذلیل یا تحقیر ہو، قرآن اسے روا نہیں رکھتا) ۔ اس طبقہ کے متعلق (جو کمانے کی استعداد سے محروم ہو چکے ہوں) اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے لئے سامانِ نشوونما بطور حق (As Of Right) طلب کر سکتے ہیں (حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ — ۷۰/۲۵) ۔ یہ بھی قرآن کریم کی ایک مستقل قدر ہے ۔ جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

چوتھی قدر — محروم کا حق

دوسرا طبقہ وہ ہے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی ۔ ایک مزدور مہینہ بھر کی محنت شاقہ سے ساٹھ روپے کماتا ہے لیکن اس کے بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات سو روپے مہینے سے کم میں پوری نہیں ہوتیں ۔ یہ مزدور بقایا چالیس روپے کہاں سے لائے ۔ غیر قرآنی معاشرہ کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا ۔ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے جس سے وہ جس طرح جی چاہے نپٹے ۔ وہ مرے ۔ وہ جئے ۔ اس سے کسی دوسرے کو سروکار نہیں ہوتا ۔ قرآن کریم نے اس باب میں ایسی مستقل اقدار دی ہیں جو اس مسئلہ کا نہایت اطمینان بخش حل پیش کر دیتی ہیں ۔ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) ”اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے“ ۔ عدل کے معنی ہیں برابر سرابر کر دینا ۔ جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ دیدینا ۔ اس سے ظلم کی روک تھام ہو گئی ۔ (ظلم کے معنی ہیں کسی کے حقوق میں کمی کرنا) اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا ۔ اس سے ان کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے جن کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہ ہو ۔ یہ دونوں (یعنی عدل اور احسان) مستقل اقدار ہیں جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اور جن کا برقرار رکھنا قرآنی معاشرہ یا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے ۔

عدل و احسان — بطور مستقل اقدار

تم نے دیکھا سلیم ! قرآن کریم کس طرح "انفاق فی سبیل اللہ" کی مستقل قدر سے انسانی مساوات کو عملاً متشکل کرتا اور انسانی ذات کی صحیح تکریم کی ضمانت بہم پہنچاتا ہے ۔ یعنی

(۱) جو لوگ اپنی ضروریات سے زیادہ کما سکیں ان کے لئے مستقل قدر یہ ہے کہ جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو، وہ اسے دوسروں کی نشو و نما کے لئے کھلا رکھیں — سورۂ بقرہ میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں ۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب ۔

(۲) جو لوگ محنت سے معذور ہو چکے ہوں، وہ دوسروں کی فاضلہ دولت میں ان کا حق قرار دیتا ہے اور اسے بطور مستقل قدر پیش کرتا ہے ۔

(۳) جو محنت کریں، ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دینا بھی مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے اور

(۴) جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہوسکتی ہو، ان کی کمی کا پورا کرنا بھی مستقل قدر ہے ۔

کوئی محکوم نہ ہو — مستقل قدر

اب سلیم! ایک اور گوشے کو لو ۔ جب انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ذاتی مقصد کے حصول کا آلۂ کار نہ بنے، تو انسانی ذات کی تکریم کا فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر حکومت نہ کر سکے ۔ اس سے اپنا حکم نہ منوا سکے ۔ قرآن کریم نے اس اصول کو بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت سے پیش کیا ہے جہاں کہا ہے کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتَابَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ .... (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین ۔ حکومت اور نبوت (تک

بھی) عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو ،،۔ تم نے دیکھا سلیم ! کہ اس ایک اصول نے کس طرح غلامی اور محکومی کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں ؟

قانون خداوندی کی اطاعت — مستقل قدر

لیکن تم کہو گے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا حکم ہی نہ مانے تو معاشرے میں نظم و ضبط کس طرح قائم رہے گا ؟ اس طرح تو فساد (Chaos) برپا ہو جائے گا۔ تمہارے اس اعتراض کا جواب اس آیت کے باقی ماندہ حصہ میں آجاتا ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ وہ اُس کی محکومی اختیار کریں۔ وہ یہی کہے گا کہ وہ اُس کتاب (کی اطاعت) سے جسے وہ پڑھتے پڑھاتے ہیں ، ربّانی بن جائیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم کی اس مستقل قدر کی رو سے اطاعت کسی انسان کی نہیں ہوگی بلکہ قوانین خداوندی کی ہوگی جو اس نے اپنی کتاب میں عطا کر دئیے ہیں —— کسی فرد کی نہیں بلکہ قانون کی اطاعت —— اور قانون بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو، بلکہ وہ جو خود خدا نے نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے سلیم ! کہ اسلامی مملکت میں اطاعت کسی انسان کے حکم کی نہیں ہوگی۔ صرف ان قوانین کی اطاعت ہوگی جو کتاب اللہ میں دئے گئے ہیں۔

تم کہو گے کہ کتاب اللہ میں تو بیشتر مستقل اقدار یا غیر متبدل اصول ہی دئیے گئے ہیں۔ لیکن معاشرہ کا نظم و نسق تو اس صورت میں برقرار رہ سکتا ہے جب چھوٹی بڑی تمام باتوں کے لئے احکام و ضوابط موجود ہوں۔

تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ احکام و ضوابط، قرآن کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں خود مرتب کئے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے مرتب ہوں گے ؟

مشاورت ـــ مستقل قدر

اس کے لئے بھی قرآن کریم نے ایک مستقل قدر دی ہے جب کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ($\frac{۴۲}{۳۸}$) ۔ یہ چیزیں امت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت ایک ایسے مشاورتی نظام کا نام ہے جس میں قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری میں رہتے ہوئے ، ہر زمانے کے مسلمان ، جزئی احکام و ضوابط اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشورہ سے خود مرتب کریں گے ۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں یہ صورت نہیں ہوگی کہ ارباب حکومت کا ایک طبقہ الگ ہو اور باقی اُمت ان کی محکوم ہو ۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ، اس میں حاکم اور محکوم کا فرق ہی نہیں ہوگا ۔ اسلامی حکومت اس لئے وجود میں آتی ہے کہ وہ قرآنی اقدار کا نفاذ کرے اور غیر قرآنی مسالک و ضوابط کی ترویج کو روک دے ۔ اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کہتے ہیں ۔ قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو تمام امت کا مشترکہ فریضہ قرار دیا ہے ۔ نہ کہ کسی خاص طبقہ ، پارٹی یا جماعت کا ۔ اس نے پوری امت کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ . . . . . . ($\frac{۳}{۱۰۹}$) "تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کی بھلائی کے لئے متشکل کیا گیا ہے ۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو" ۔ لہذا قرآن کریم کی اس مستقل قدر کی رو سے نظم و نسق مملکت میں پوری کی پوری قوم بالواسطہ یا بلا واسطہ شریک ہوتی ہے اور اس میں حاکم اور محکوم کے الگ الگ طبقات نہیں ہوتے ۔

اس سے یہ بھی واضح ہے سلیم ! کہ جب پوری امّت کے لئے ضابطۂ قوانین دیا گیا ہے اور اس ضابطہ کو نافذ کرنے کا فریضہ پوری کی پوری امت کی مشترکہ

کوئی فرقہ یا پارٹی نہیں

ذمہ داری قرار دیا ہے ، تو امت میں فرقوں یا پارٹیوں کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۱) ”دیکھنا! کہیں تم نے مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں بٹ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر گروہ اپنے اپنے مسلک میں مگن ہو کر بیٹھ گیا“۔

نوع انسان ایک امت

معیار قومیت ۔ مستقل قدر

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا منتہٰی، وحدت قانون کی بنیاد پر، تمام نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) ”تمام نوع انسانی ایک قوم ہے“ اور یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ سو، جو نظام تمام انسانوں کو ایک برادری کے قالب میں ڈھالنے کا پروگرام اپنے سامنے رکھتا ہو، وہ خود اپنے اندر فرقوں اور پارٹیوں کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس کے نزدیک انسانوں کی تقسیم کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی کفر اور ایمان۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی مستقل اقدار کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کر لیں، وہ ایک قوم کے افراد۔ اور جو اس کے خلاف، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق، زندگی بسر کریں وہ دوسری قوم کے افراد۔ قومیت کا یہ معیار بھی ایک مستقل قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور قرآن کریم کے دوسرے اصولوں کی طرح غیر متبدل ہے۔ اور جب قرآن کریم کی رو سے تمام مسلمان ایک قوم کے فرد ہیں تو وہ امت میں فرقوں اور پارٹیوں کے وجود کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟ قرآنی نظام، وحدت قانون اور وحدت امت کی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے۔

میں نے جو اوپر کہا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے معیار قومیت یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی متعین کردہ مستقل اقدار کو اپنا نصب العینِ حیات قرار دے

دشمن سے بھی عدل

لیں وہ ایک قوم کے فرد۔ جو اس سے انکار کریں وہ دوسری قوم کے افراد —— تو اس سے تم نے یہ نہ سمجھ لینا کہ جس طرح آج ہر قوم اپنے اپنے مفاد کے تحفظ میں سرگرم تگ وتاز رہتی ہے اور اسے نہ صرف یہ کہ دوسری اقوام کے مفاد کا کوئی خیال نہیں ہوتا بلکہ اگر کسی دوسری قوم کا مفاد اُس کے مفاد سے ٹکرائے تو وہ اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کے نقصان کی قطعاً پروا نہیں کرتی، اسی طرح قرآنی معاشرہ میں بھی ہوگا۔ قطعاً نہیں۔ قرآنی معاشرہ میں تمام لوگ ''فرزندانِ آدم'' تسلیم کئے جائیں گے اور ان تمام حقوق و مراعات کے مستحق ہوں گے جو مستقل اقدار کی رو سے ہر فرزند آدم کو (بطور استحقاق) ملتی ہیں۔ قرآن کریم اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ اِعْدِلُوْا ۔ ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸) ''کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز قرآنی طرز زندگی سے قریب ہے''۔

تمام نوع انسانی کی نفع بخشی

عدل ہی نہیں۔ بلکہ یہ لوگ قرآنی نظام کی تمام نفع بخشیوں میں حصّہ دار ہوں گے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی ایک بنیادی مستقل قدر یہ بھی ہے کہ

مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

بقا اور دوام اسی کے لئے ہے جو تمام عالم انسانیت کے لئے نفع بخش ہے

''الناس'' میں اپنے اور پرائے۔ مومن و کافر —— سب شامل ہیں۔ قرآن کریم کا خدا —— رب العالمین ہے۔ اس کا رسول —— رحمۃ للعالمین۔ اور خود قرآن —— ذکر للعالمین۔ اس لئے اسلامی مملکت کی نفع بخشیاں تمام نوع انسانی کے لئے ہیں۔

یہ ہے سلیم! اسلامی آئیڈیالوجی کا مختصر سا تعارف۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(الف) اسلامک آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولوں کے مجموعہ کا نام ہے جو اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔

(ب) جب کوئی مملکت ان اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے لے تو اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں اور

(ج) جو دستاویز اس کے اس نصب العین کا اعلان کرے اور مملکت کی عمارت کو ان اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنے کا نقشہ مرتب کر کے دے اسے اسلامی آئین کہیں گے۔

(۲) اسلامی آئین کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ

(ا) انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔

(ب) اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کے جسم کی پرورش کے لئے طبیعی ضروریات کی ذمہ دار ہو اور ان کی ذات کے ارتقاء کے لئے ایسے سامان و ذرائع فراہم کرے جن سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔

(ج) اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اسباب و ذرائع پیداوار، مملکت کی تحویل میں رہیں۔

(۳) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

(۴) مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات میں صفات خداوندی کی (حدود بشریت کے مطابق) نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہذا اسلامی مملکت میں، افراد اور مملکت، دونوں صفات خداوندی کے مظہر ہوتے ہیں۔

(۵) مستقل اقدار کی رُو سے

(ا) ھر انسان ، بحثیت انسان ، واجب التکریم ھے ۔

(ب) کسی انسان کو حق حاصل نہیں ھوتا که وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے ۔ اطاعت ھر ایک کو قوانین خداوندی کی کرنی ھوتی ھے جو قرآن میں مذکور ھیں ۔

(ج) ھر فرد پوری پوری محنت کر کے کمائی کرتا ھے لیکن اس میں سے اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتا ھے ۔ باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ھے ۔ کیونکه ایسا کرنے سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ھوتی ھے ۔

(د) ھر ایک سے عدل کیا جاتا ھے (حتٰی که دشمن سے بھی) اور جن افراد میں کسی وجه سے کوئی کمی رہ جائے اس کمی کو پورا کر دیا جاتا ھے ۔

(ر) تمام نوع انسان کو ایک عالمگیر برادری سمجھا جاتا ھے اور اسلامی مملکت کے نظام ربوبیت میں ھر انسان کا برابر کا حصه ھوتا ھے ۔

(س) اسلامی مملکت ، مستقل اقدار کی چاردیواری کے اندر رھتے ھوئے ، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین ، ملّت کی مشاورت سے ، خود مرتب کرتی ھے ۔ ان جزئی قوانین میں حسب ضرورت تبدیلی ھوتی رھتی ھے لیکن مستقل اقدار اپنی جگه غیر متبدل رھتی ھیں ۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے معاشرہ آگے بڑھتا چلا جاتا ھے ۔

یه ھیں سلیم ! اسلامک آئیڈیالوجی کے نمایاں خط و خال ۔ کہو ! اب تو نہیں بھولو گے ؟

اچھا خدا حافظ ! والسّلام

پرویز

اگست ۱۹۵۹ء

اکتالیسواں خط

قرآن کا سیاسی نظام

باب اول — انسان نے کیا سوچا ؟

جب انسانوں نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے باھمی تنازعات پیدا ھوئے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس بیدار ھوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ھو۔ اور اگر ٹکراؤ پیدا ھو جائے تو باھمی کشمکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ھو جائے تاکہ معاشرہ فساد اور جنگ و جدل سے محفوظ رھے۔ اس سے نظامِ سیاست کے تصوّر کی ابتداء ھوئی۔ ابتداء ھوئی تو اس ضرورت کے ماتحت، لیکن جن لوگوں نے جھگڑے نپٹانے اور فیصلے کرانے کا کام اپنے ذمہ لیا، انھوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذت ملتی ھے۔ اس لئے انھوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ھاتھ میں آیا ھوا اقتدار چھننے نہ پائے۔ اس سے معاشرہ میں دو طبقے پیدا ھو گئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ بعض اوقات حکمران طبقہ سے اس کا اقتدار اور اختیار

حاکم و محکوم کی کشمکش

چھیننے کے لئے کوئی دوسرا فریق کھڑا ہو جاتا۔ آپ غور کیجئے تو انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستان نظر آئے گی۔ یعنی

(i) حکمران طبقہ کی کوشش کہ ان کے اقتدار و اختیار کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں۔

(ii) فریق مقابل کی خواہش کہ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(iii) محکوم طبقہ کی سرکشی اور حکمران طبقہ کی کوشش کہ انہیں دبا کر رکھا جائے۔

(iv) اور ارباب فکر و بصیرت کی یہ کاوش کہ ایسی کون سی تدبیر کی جائے جس سے معاشرہ میں سیاسی نظام بھی قائم رہے اور حاکم و محکوم میں کشمکش بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

قبل اس کے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے اہم ٹکڑوں کو سامنے لایا جائے۔ اور یہ بھی دیکھا جائے کہ اربابِ فکرو بصیرت نے اس باب میں کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔

قبائلی نظام حکومت

شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا۔ یعنی ایک خاندان کے افراد مل جل کر رہتے تھے۔ اسے ان کا قبیلہ کہا جاتا تھا۔ قبیلہ کا بزرگ، واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے باہمی نزاعات کے فیصلے کرنے کا فریضہ اسی کا ذمہ تھا۔ اس کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع تھا۔ رفتہ رفتہ ان "بزرگانِ خاندان" کے دل میں بھی جذبۂ حکومت نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا

کہ ” ماں باپ کی اطاعت فرض ھے ،،۔ یا (سعدی کے الفاظ میں) ” خطائے بزرگاں گرفتن خطاست ،، —— اسلاف کی پرستش (Ancestral Worship) اسی عقیدہ کی بڑھی ھوئی شکل ھے۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں مذھبی پیشواؤں (Priests) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا ۔ (اب بھی جہاں جہالت اور توھّم پرستی کا دور دورہ ھے ، مذھبی پیشواؤں کی پرستش ھوتی ھے) وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے ۔ ھر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا ۔

خداوندی اختیارات کا عقیدہ

ان مذھبی پیشواؤں نے عوام کی اس عقید تمندی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے دائرہ اقتدار کو، پرستش گاھوں کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر ، دنیاوی حکومت کے ایوانوں تک لے گئے ۔ اس لئے انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ خداوندی اختیارات (Divine Rights) کے حامل ھیں ۔ یعنی انھیں خدا نے حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ھے ۔ ان کے احکام خود خدا کے احکام ھیں ۔ ان کی اطاعت ، خدا کی اطاعت اور ان کی معصیت ، خدا کی معصیت ھے جس کی سزا اس دنیا میں عبرتناک عذاب ھے اور اگلی دنیا میں جہنم کی عقوبت ۔ جب دوسرے حکمرانوں (بادشاہ وغیرہ) نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریقہ بڑا آسان اور نہایت کامیاب ھے —— اس لئے کہ اس میں جسموں کے بجائے دلوں اور روحوں پر حکومت ھوتی ھے، جس کے لئے نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑتی ھے ، نہ فوج کی حاجت —— تو انھوں نے مذھبی پیشواؤں سے گٹھ جوڑ پیدا کرلیا ۔ اس طرح ، راجہ ، ایشور کا اوتار اور بادشاہ ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار پا گیا اور وہ اپنے احکام و فرامین کو خدا کے احکام کی حیثیت سے منوانے لگا ۔ (انسانوں کے خود ساختہ) مذھب نے حکومت کی اس شکل کو بڑی تقویت پہنچائی ھے اور ان ” خدائی فوجداروں ،، کے ھاتھوں نوع انسانی پر جس قدر مظالم ، خدا کے نام پر ھوئے ھیں ، شیطان بیچارے کے حصے میں ان کا عشر عشیر

تھیا کریسی

بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس نظام سیاست کو تھیا کریسی کہتے ہیں جسے عیسائیت نے خاص طور پر فروغ دیا تھا۔ وائی کونٹ سمیوئیل، عیسایت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> اس نے بادشاہوں کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تائید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر تباہیاں پھیلائیں ان کی ذمہ داری اسی پر عاید ہوتی ہے۔ (Belief and Action p.39)۔

جسکی لاٹھی اسکی بھینس

یہ تو تھا مختلف تدابیر سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا۔ اس کے برعکس، ایسا بھی ہوا کہ کسی قبیلہ یا قوم میں جو شخص سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھتا تھا، یا جس نے سب سے زیادہ مادی قوت فراہم کر لی، اس نے باقیوں کو دبا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائیگی کہ حکومت کا یہ نظریہ شروع سے آج تک مسلسل کارفرما چلا آرہا ہے۔ اسلوب و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ”اصول“ ہر جگہ یہی کارفرما ہوتا ہے کہ ”جس کی لاٹھی اسکی بھینس“۔ انسان کے عہد جہالت و بربریت میں بھی یہی ہوتا تھا اور آج زمانۂ تہذیب و تمدن میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

نظریہء میثاق

جب اُن ارباب فکرو نظر نے، جو حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، یہ دیکھا کہ معاشرہ کے اجتماعی نظام کی ضرورت کس مقصد کے لئے پیش آئی تھی اور اس سے فائدہ کیا حاصل کیا جا رہا ہے، تو انہوں نے اس نظام کو (اپنی دانست کے مطابق) صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ افراد معاشرہ کو باہمی رضامندی سے یہ طے کرنا چاہیئے کہ مملکت میں افراد کے حقوق و فرائض کیا ہونگے اور حکومت کے فرائض اور واجبات کیا؟ فریقین کے ان طے شدہ حقوق و واجبات کی توثیق ایک معاہدہ کی رو سے ہو جانی چاہیئے۔ اس نظریہ کو (Theory of Contract) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ نظریہ قدیم یونان سے چلا آرہا تھا لیکن اٹھارویں صدی (عیسوی) میں، اسے یورپ میں ہابز (Hobbes) لاک (Locke) اور روسو (Rousseau) نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ ڈیما کریسی (جمہوریت) کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے یعنی "لوگوں کی باہمی رضامندی سے حکومت"۔

اقتدار اعلیٰ

نظام سیاست کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کا آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے — اسے اقتدارِ اعلیٰ یا (Sovereignty) کہتے ہیں — جب زمامِ اقتدار مذہبی پیشواؤں یا بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی تو اُس وقت یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (ہمارے زمانے میں، بادشاہوں کی جگہ ڈکٹیڑوں نے لے لی ہے اس لئے ان کی حکومت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا)۔ مذہبی پیشوا، بادشاہ یا ڈکٹیڑ، خود مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب انداز حکومت جمہوری قرار پایا، تو اُس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی۔ روسو کے نزدیک "اقتدار اعلیٰ" مملکت کے تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ لیکن لاک کے خیال میں یہ اقتدار افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیئے۔ بنتھم بھی لاک کا ہمنوا ہے — ڈیما کریسی نے اسی اصول کو اختیار کیا ہے — اس کے برعکس، مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ اس طبقہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس وسائلِ پیداوار ہوں — نظامِ سرمایہ داری میں سرمایہ دار طبقہ کو — اشتراکی نظام میں مزدوروں کو — ہمارے دور میں جمہوری نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر متمدّن قومیں اس کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نظریہ کی بنا حسب ذیل مفروضات پر ہے۔

جمہوری نظام

(i) اس انداز حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے" کا اصول کار فرما ہوتا ہے۔ یعنی

(Government of the people, by the people, for the people)

(ii) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(iii) کسی بات کے صحیح یا غلط ھونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرت رائے ھوتا ھے۔

(iv) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے ھوتے ھیں۔

یہ وہ نظامِ حکومت ھے جس پر انسان اپنے مدت العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ھے اور مغربی مفکرین کے نزدیک اس نظام سے بہتر نظام کا تصور ناممکن ھے۔ اس نظام کو آیۂ رحمت اور ضامنِ ھزار برکات و سعادت سمجھا جاتا ھے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاھد اور نوعِ انسان کے ھمدرد و بہی خواہ اور اس کی مخالفت کرنیوالوں کو انسانیت کا مجرم خیال کیا جاتا ھے۔

سوال یہ ھے کہ مغرب کے عملی تجربے نے اس ظام حکومت کو فی الواقع ایسا ثابت کیا ھے یا وھاں کے مفکرین و مدبرین کسی اور نتیجے تک پہنچے ھیں؟ ان مفکرین و مدبرین سے مراد، ان ممالک کے ارباب فکر و سیاست ھیں جہاں جمہوری نظام قائم ھے۔

کچھ عرصہ ھوا لندن یونیورسٹی کے پروفیسر الفریڈ کوبن (Alfred Cobban) نے ایک عمدہ کتاب لکھی تھی جس کا نام ھے (The Crisis of Civilisation)۔ وہ اس کتاب میں تہذیب مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتا ھوا لکھتا ھے کہ ان میں سب سے بڑا سبب ان کا جمہوری نظام ھے۔ (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ھے) اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ھے کہ اس میں ”حاکم اور محکوم“ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پروفیسر کوبن اس مفروضہ کے متعلق لکھتا ھے۔

جمہوریت کی ناکامی

> اگر سیاست کو، نظری حیثیت سے نہیں بلکہ، عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ھی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ھے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ھوتی ھے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ھوتا ھے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ

> جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ھو سکتے ۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ھی ھیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادیٔ اختیارات پیدا کر دیتا ھے* ۔ (صفحہ ۶۸)

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A. C. Ewing) نے ۱۹۴۷ء میں ایک کتاب بہ عنوان (The Individual, the State and world Government) شائع کی تھی جس میں اس نے ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ھے ۔ بحث کے دوران میں وہ کہتا ھے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ نظامِ جمہوریت میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ھوگا ۔ کیونکہ لوگ خود اپنے اوپر آپ ظلم نہیں کریں گے ۔ لیکن

> اگر روسو عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا ۔ (صفحہ ۱۱۴)

فرانسیسی مفکر رینی گوئن (Rene Guenn) اس باب میں لکھتا ھے ۔

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ھے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ھے جس کا وجود ناممکنات سے ھے ۔ جو کبھی نہ پہلے وجود میں آئی ھے اور نہ آج کہیں موجود ھے ۔ ایسا کہنا ھی جمع بین النقیضین ھے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ھو اور محکوم بھی۔ . . .
>
> حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ھے ۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں ۔ ھماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ھیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ھوتی ھے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان

---

* اس مقالہ کے تمام اقتباسات میں نے اپنی کتاب ”انسان نے کیا سوچا“ سے لئے ھیں ۔

> پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں . . . . عام رائے دہندگی (Universal suffrage) کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے ۔ (اس اصول کی رو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رخ پرلگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے
>
> (The crisies of the Modren World-P .106)

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ مفکرین جمہوری نظام کی جس خرابی پر اس شد و مد سے تنقید کر رہے ہیں اس نظریہ کا یہ مفروضہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (یعنی قانون سازی کا لامحدود اور غیر مشروط حق) عوام کو حاصل ہے اور عوام کا یہ حق ان کے نمائندوں کی اکثریت کی وساطت سے بروئے کار آتا ہے ۔ بالفاظ دیگر اس نظریہ کی رو سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ملک کے نمائندگان کی اکثریت جو قانون بنائے وہ ملک کے تمام افراد کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اور ہر حال میں حق و صداقت پر مبنی ۔ ان مفکرین کے نزدیک ، یہ اس نظریہ کی بنیادی کمزوری ہے اور تباہی کا باعث ۔ اس ضمن میں پروفیسر (H.L. Nenckem) اپنی کتاب (Treatise on right and wrong) میں لکھتا ہے ۔

سب سے بڑی ناکامی

> تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کرسکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں ۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیرالعقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں ۔ لیکن جب انہیں عملاً بروئے کار لانے کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا ۔

> اس کا سبب یه ھے که نظری طور پر حکومت کا خاکه کھینچ لینا اور بات ھے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں که یه افرادِ مملکت کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کا ذریعه ھے اور اربابِ حکومت پبلک کے خدام ھیں۔ لیکن عملاً دیکھئے تو حکومت اپنا فریضه پبلک کی خدمت نہیں بلکه سلب و نہب سمجھتی ھے۔ . . . اس باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام جمہوری نظام رہا ھے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ھیں که حکومت کی بنیاد معقولیت پر ھونی چاھیئے لیکن ان کا جذبۂ محرکه کبھی معقولیت پسندی نہیں ھوتا۔ ان کا کام یه ھوتا ھے که جو عنصر بھی باھر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچه اس ھتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کی وساطت سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ھوتے ھیں، لامحدود عرصه تک برسر اقتدار رھتے ھیں۔ (صفحه ۲۳۴)

U. N. O کی تحقیق

۱۹۴۷ء میں، اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی که وہ جمہوری طرز حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین و مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے۔ اور انھیں ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا جس کا نام (Democracy in A World of Tension) ھے۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے یه سوال پوچھا تھا که ڈیما کریسی کا مفہوم کیا ھے۔ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ھے که یه لفظ بالکل مبہم ھے۔ آج تک اس کا مفہوم ھی متعین نہیں ھو سکا۔ بعض نے تو یہاں تک کہه دیا ھے که ”دور حاضر میں لفظ جمہوریت سے زیادہ مہمل لفظ کوئی اور ھے ھی نہیں“ (صفحه ۴۶۰)۔ اس کے بعد اس رپورٹ میں یه سوال سامنے

آتا ہے کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

> یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اکثریت کے فیصلے کو بدلوا دے۔ (صفحہ ۴۰۵)

سابقہ صفحات میں ہم نے جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ دنیا میں اس وقت جو مختلف نظام ہائے حکومت رائج ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی اور نظام، جمہوریت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ بالکل نہیں۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی فکر نے اپنی ساری تاریخ میں جو نظام سب سے بہتر تجویز کیا تھا، تجربہ نے اس کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وہ بڑا ہی ناکام رہا ہے۔ دنیا کے دیگر نظامہائے سیاست کی طرح، اس نظام کی بنیادی خرابی بھی یہ ہے کہ اس میں حق اور باطل، غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے مستقل (Permanent) خارجی (Objective) اور مطلق (Absolute) معیار کوئی نہیں۔ اس میں عوام کے نمائندگان کی اکثریت کا فیصلہ قانون بن جاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے اگر غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے کوئی مستقل، خارجی معیار نہ ہو اور قوم کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بن جائیں، تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ سوال واقعی غور طلب ہے، بالخصوص اس لئے کہ ایک سیکولر حکومت اور قرآنی نظامِ مملکت میں بنیادی طور پر یہی مقامِ افتراق (Point of Departure) ہے۔ سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ قوم کے عام افراد ہوں یا ان کے نمائندے۔ نمائندوں کی اکثریت ہو یا اقلیت۔ یہ ہوں گے تو بالآخر انسان ہی۔ اور جو کمزوری ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ انسانوں

اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟

کے گروہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا ناممکن ہے، اور جو ایسا فرض کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت ان امیال و عواطف اور کشش وجاذبیت سے مبری' ہو جائے گی جو ایک انسان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ لارڈ سنل (Lord Snell) کے الفاظ میں

> حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوں گی اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جائیں گی جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ھوشمند نہیں ہو سکتے۔ (The new World-P. 17)

آلڈوس ھکسلے (Aldous Huxley) اس باب میں لکھتا ہے۔

> تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گذرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آیا ہے وہ آج نہیں ہوگا۔ یا آئندہ بھی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔ (Science, Liberty and Peace-P. 41)

نیشنلزم کی تباہ کاریاں

اس لئے اگر اکثریت کو بھی بلاحدود و قیود چھوڑ دیا جائے تو اس کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کے حقوق کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ کچھ تو ہوگا اپنے ملک کے اندر رہنے والے انسانوں کے ساتھ۔ جہاں تک دوسرے ملکوں کے انسانوں کا تعلق ہے، انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس وقت دنیا کے باشندے مختلف قوموں (Nations) میں بٹے ہوئے ہیں۔ نیشنلزم، بحیثیت ایک سیاسی عقیدے کے، دور حاضر کی پیداوار ہے۔ یا کم از کم یوں کہئے کہ اس زمانے میں اسے خاص طور پر فروغ حاصل ہوا ہے اور مغرب کو اس پر بڑا ناز ہے۔ لیکن نیشنلزم کے عملی تجربہ کے بعد، خود مغرب کے مفکرین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اب راز کی بات نہیں رہی۔ پروفیسر کوبن، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ھوتا ھے اور عداوت پر پرورش پاتا ھے۔ ایک قوم کو اپنی ھستی کا احساس ھی اس وقت ھوتا ھے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ھو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ھی ختم نہیں ھو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حق خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ھے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ھے جو اپنے لئے حقِ خود اختیاری کی مدعی ھوں۔
>
> (The Crisis of Civilisation- P. 166)

تاریخ قومیت کا عالم (Fredrick Hertz) اپنی کتاب (Nationality in History and Politics) میں لکھتا ھے۔

> تاریخ بتاتی ھے کہ مختلف اقوام میں باھمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ھی کچھ اور ھو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنھوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ھے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی یا ھسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ھے۔ (صفحہ ۳۲۸)

برٹرینڈرسل، اپنی کتاب (The Hopes for A Changing World) میں لکھتا ھے

> ھمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ھے وہ نیشنلزم ھے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسان کی تباھی کے لئے سب سے بڑی قوت ھے۔ پھر تماشا یہ ھے کہ ھر شخص تسلیم کرتا ھے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ھے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ھے۔

(جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ھے) ھمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ھی نہیں رھی۔ اس نے ایک عقیدے کی صورت اختیار کر لی ھے۔ آلڈوس ھکسلے کے الفاظ میں:—

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔
>
> (The Perennial Philosophy-P. P. 184 and 203)

حب الوطنی کا جذبہ

نیشنلزم کے مذہب بن جانے کا نیتجہ یہ ہے کہ قومیت پرستی (Patriotism) سب سے بڑی نیکی اور جذبۂ حب الوطنی سب سے بلند جوہر قرار پاچکا ہے۔ اس مذہب کا "کلمہ" یہ ہے کہ (My Country—Right or Wrong) "میرا ملک حق پر ہو یا باطل پر، میں بہر حال اس کا ساتھ دوں گا"۔ (Romelin) کے الفاظ میں:—

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشو و نما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز۔
>
> (Quoted by Murray in —— The Individual and the State-p. 216)

یہی وجہ ہے کہ وال پول نے کہا تھا کہ

> نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔
>
> (Quoted by Susan Stebbings in — Ideals and Illusions-p.14)

اور لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے

طے نہیں پایا کرتے'' ۔ (ایضاً صفحہ ۱۳)۔ یہی وجہ ھے کہ، پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں ، اب دنیا میں

> پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ھے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ھے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار ، رحم دل اوز قابل اعتماد ھیں ، ان کا بھی یہ عقیدہ ھے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاھدہ کرنا ھو تو وھاں وہ سب کچھ کر گذرنا کارِ ثواب ھے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔
>
> (Guide to the Philosophy of Morals and Politics—p.730)

اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبر (Govour) نے سمٹا کران الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> اگر ھم وھی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ھم نے مملکت کیلئے کیا ھے تو ھم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔
>
> (Foreign Affairs—Year 1952)

ماحصل مبحث

جو کچھ ھم نے سابقہ صفحات میں لکھا ھے ، اسے مختصر الفاظ میں دھرانا چاھیں تو بات یوں سامنے آتی ھے کہ

(۱) انسانوں نے مل جل کر رھنا ھے۔

(۲) میل جل کر رھنے سے ان کے مفاد میں ٹکراؤ ھوتا ھے اور ٹکراؤ سے جھگڑے پیدا ھوتے ھیں۔

(۳) اس مقصد کے لئے کہ مختلف افراد کےمفاد میں ٹکراؤ نہ ھو اور اگر ٹکراؤ ھو تو اس سے جھگڑے پیدا نہ ھوں ، سیاسی نظام کا تصور پیدا ھوا۔

(۴) انسانی فکر نے آج تک جس قدر سیاسی نظام وضع کئے هیں ان میں کوئی بھی اس مقصد کے لئے کامیاب ثابت نهیں هوا۔

(۵) ان نظاموں میں آخری نظام قومی جمهوریت هے۔ لیکن یه نظام بھی بری طرح ناکام ثابت هو رها هے۔ اس لئے که اول تو اس سے ملک کے اندر مختلف پارٹیوں میں باهمی کشمکش رهتی هے اور دوسرے مختلف ملکوں اور قوموں میں نفرت اور رقابت کے جذبات دنیا کو جهنم بنائے رکھتے هیں۔

سوال یه هے که انسانی فکر نے ان مشکلات کا بھی کوئی حل سوچا هے؟ اور اگر سوچا هے تو وه کیا هے اور اس پر عمل پیرا هونے کے راستے میں کیا موانع هیں؟

مفکرین مغرب کیسا نظام چاهتے هیں؟

هم نے دیکھا یه هے که نظامِ جمهوریت کی بنیادی خرابی یه هے که اس میں ''اقتدارِ اعلیٰ'' عوام کے هاتھ میں سمجھا جاتا هے اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے حرفِ آخر تصور کئے جاتے هیں۔ اس نظریه پر بحث کرتے هوئے پروفیسر کوبن لکھتا هے۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریه کی تائید میں روائتی دلیل یه دی جاتی هے که حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی یا باهمی رضامندی سے۔ اور چونکه یه غلط هے که جس چیز کو قوت صحیح کهه دے وه صحیح هو، اس لئے یهی درست هے که حکومت کو باهمی رضامندی پر مبنی هونا چاهئیے۔ لیکن یه دلیل نه تو منطقی طور پر صحیح هے، نه هی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کهدیں تو وه صحیح نهیں هو سکتی۔ . . . . فیصله وهی صحیح هو سکتا هے جو درحقیقت صحیح هو۔ نه که وه جسے زیاده لوگ صحیح کهنا شروع کر دیں۔ روسو کهتا هے که منشائے عمومی (General Will) همیشه

اخلاقی معیار

> صحیح ھوگا ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ھے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ھی باقی نہ رھا۔ (جب منشائے عمومی، اس وقت منشائے عمومی کہلا سکے گا، جب وہ صحیح بات کہے تو) پھر یوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی معیار کے مطابق صحیح ھے وھی صداقت ھے (خواہ اس کی تائید میں ایک ھاتھ بھی نہ اٹھے)۔ (صفحہ ۷۶)

پروفیسر کوبن کا مطلب یہ ھے کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ھونے کا معیار ’’ اخلاقی بنیادیں ‘‘ ھیں، نہ کہ اکثریت کے فیصلے۔ حقیقت یہ ھے کہ جب لاک نے جمہوریت کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے پیش نظر بھی ایک ’’ ابدی قانون ،، کا عملی نفاذ تھا جسے وہ ’’ قانونِ فطرت ،، سے تعبیر کرتا تھا۔ چنانچہ اس باب میں اس نے کہا تھا کہ

> کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رھے۔ قانون فطرت وہ ابدی قانون ھے جو تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ھوتا ھے۔ خواہ وہ قانون ساز ھوں یا قانون کے متبع۔
>
> (Cf. Mabboth—The State and the Citizen-P. 25)

قانون فطرت

لاک کے نزدیک قانون فطرت خدا کا بنایا ھوا ھے اور انسان اس کے ماتحت اُس وقت بھی رھا کرتے تھے جب وہ تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھے اور ’’ نیچر ،، کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اُس وقت لوگ عقل (Reason) سے کام لیتے تھے، جذبات سے نہیں۔ لیکن بعد میں جب لوگ جذبات کے پیچھے لگ گئے تو ان کی زندگی قانون فطرت کے مطابق نہ رھی۔ اب اسی قانون کی بازیابی اور اس کی عملی تنفیذ انسانی معاشرہ کا فریضہ ھے۔ لیکن اتنا کچھ لکھنے کے بعد، لاک یہ کہتا ھے کہ یہ قانون اکثریت کی منشاء سے مل سکتا ھے۔

لاک کی غلطی

آپ نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا مفکر، کس طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، ایک ہی نقطہ کے گرد ناکام چکر کاٹ رہا ہے ؟ وہ انسانی فیصلوں کی غلطیوں اور مفاد پرستوں کی چیرہ دستیوں سے گھبرا کر پکار اٹھتا ہے کہ ’’کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ اسے فطرت کے ابدی قانون کا پابند رہنا ہوگا،،۔ اور اس سے جب پوچھا جاتا ہے کہ فطرت کا وہ ابدی قانون کہاں سے ملے گا تو اسے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوجھتا کہ ’’یہ قانون اکثریت کے فیصلوں میں ملے گا‘‘۔ بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے پناہ لینا اسے ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ہیں بھی سچے--

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں ؟

بہرحال، ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغرب کے مفکرین اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلوں کو بہرحال و بہر کیف صحیح سمجھنا غلط ہے۔ کسی فیصلہ کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کسی خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ لاک کے نزدیک یہ خارجی معیار ’’قانونِ فطرت،، ہے۔ پروفیسر کوبن اسے ’’اخلاقی معیار،، سے تعبیر کرتا ہے۔ مشہور اطالوی مدبر، میزینی (Mazzeni) نے اس باب میں کہا تھا۔

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریقِ کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں، جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو یا زیادہ، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی

خدا کا قانون

> اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے۔ خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائیگا... یاد رکھئیے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ، حق ہی نہیں بلکہ، فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔
>
> (Quoted by Griffth in—Interpretters of Man-P. 46)

یعنی میزینی کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار، قوانین خداوندی ہونے چاہئیں، جن کا نافذ کرنا حکومت کا فریضہ قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی مذہب کے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ لیکن یورپ میں جو مذہب (عیسائیت) رائج ہے، پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اس کی حالت یہ ہے کہ

قوانین خداوندی عیسائیت سے نہیں مل سکتے

> عیسائیت کی رو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ آخروی دنیا خیرِ محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس یہ دنیا شروفساد کی دنیا ہے۔ اُس دنیا کی حیات ابدی ہے۔ یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کے لئے یہ دنیا اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقام ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے

> بالکلیہ خیر اور طیّب نہیں - یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اسی صورت میں اچھا ہے جبکہ وہ ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن سکے جن کا وعدہ اگلی دنیا میں کیا گیا ہے -
> (Guide to the Philosophy of Morals and Politics -P. 127)

ہسپانوی پروفیسر (Dr. Falta De Gracia) اس باب میں لکھتا ہے -

> عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا - یہ اس کے تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی چیز ہے . . . . عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے -
> (Quoted by Brifault in—The Making of Humanity- p.334)

مشہور مفکر، پروفیسر وھائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

> انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا (Adventures of Ideas -P.18)

انہی حقائق کے پیش نظر، تہذیب کا مشہور (امریکی) مؤرخ (Dorsey) اپنی کتاب (Civilisation) میں لکھتا ہے -

> آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے - وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں - یہاں کوئی شے قابل اطمینان نہیں - ,,اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے،، - یہ انداز نگاہ، صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے - اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے - (صفحہ ۴۴۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مذہب سے کبھی وہ خدائی قوانین نہیں مل سکتے تھے جنہیں میزینی نے صحیح اور غلط کا ناقابل تغیر معیار قرار دیا تھا - اب یورپ کے

لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ یہ دروازہ مجلس اقوام متحدہ (U. N. O) کا تھا جس نے

منشور حقوق انسانیت

''انسانیت کے بنیادی حقوق،، کے متعلق تحقیق و تعیین کے لئے ایک کمیشن بٹھایا اور اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق، ۱۹۴۸ء میں ''منشور حقوق انسانیت،، (Declaration of Human Rights) شائع کیا۔ اس میں ان حقوق کی فہرست دی گئی جو اقوام متحدہ کے نزدیک ہر حکومت میں، ہر فرد انسانیہ کو حاصل ہونے چاہیئں۔ اقوام متحدہ کے اس کارنامے کو عصر حاضر کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کی ڈھارس بندھ سکتی تھی کہ اسے کسی طرح کچھ حقوق کی مستقل ضمانت تو ملی۔ لیکن اس کی یہ توقع بھی غلط نکلی۔ ابھی مذکورہ صدر منشور زیر ترتیب ہی تھا کہ (UNESCO) (یعنی انجمن اقوام متحدہ ہی کے ایک ادارہ) نے دنیا کے مشہور ارباب فکر و نظر کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء سے مطلع کریں۔ ان کے جوابات، مسٹر (Jacques Maritain) کے تعارف کے ساتھ، ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کئے گئے تھے۔ ان حقوق کی حیثیت کے متعلق، سب سے پہلے خود مسٹر میری ٹین لکھتے ہیں۔

یہ حقوق بھی غیر متبدل نہیں

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق، انسانی حقوق ہیں۔ اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عاید کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم و تبدیل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۱۰)

اس کے بعد ماڈرن کواٹرلی لندن کا ایڈیٹر (John Lewis) اپنے مقالہ کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے۔

> اس حقیقت کو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کے متعلق یہ تصور، کہ یہ حقوق مطلق ہیں اور فطرتِ انسانی کے اندر مضمر ہوتے ہیں اور ان کی ابتداء اس زمانے سے ہوتی ہے

> جب انسان نے ہنوز معاشرہ کی طرح بھی نہیں ڈالی تھی، ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفحہ ۵۱)

شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (Gerard) لکھتا ہے۔

> انسانی حقوق صرف اس کوشش کا نام ہیں کہ انسان اور اس کے معاشرہ کے باہمی تعلقات کو متعین کر دیا جائے۔ یہ حقوق نہ تو مطلق ہوتے ہیں نہ ایسے کہ انہیں ہمیشہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۲۰)

یعنی جو کچھ اتنی کاوشوں اور کوششوں کے بعد انسان کو ملا، اس کے متعلق بھی اسے اطمینان نہیں کہ اسے وہ مستقل طور پر ملتا رہے گا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ حقوق کے تحفظ کے متعلق مسٹر (Maritain) نے لکھا ہے۔

> انسانیت کے حقوق کی تعریف—نہیں بلکہ—روز مرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو ”فلسفۂ زندگی“ کہتے ہیں۔ (صفحہ ۱۷)

اسی حقیقت کو پروفیسر جوڈ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

مستقل اقدار کی تلاش

> اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔
>
> (Guide to the Philosophy of Morals and Politics -P.806)

یعنی بات سمٹ سمٹا کر یہاں پہنچی کہ انسانی معاشرہ کی اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کے باہمی معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوں اور یہی اقدار غلط اور صحیح کا معیار قرار پائیں۔ یہ ہے وہ آخری منزل جس تک انسان اپنے ہزاروں سال کے ناکام تجارب کے بعد پہنچا ہے۔ لیکن اس منزل میں پہنچکر بھی انسان ششدر و حیران کھڑا ہے۔ کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مستقل اقدار ملیں گی کہاں سے؟ وہ اپنے ذہن سے کچھ اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک کی تردید دوسرا کر دیتا ہے۔

انسان کو اس مقام پر چھوڑ کر اب دیکھئے کہ خدا اس باب میں کیا کہتا ہے۔

باب دوم ——— خدا نے کیا کہا؟

قرآن کریم اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی تمدنی زندگی ناممکن ہو جائے۔ اس لئے کہ انسان

انسان کیسا واقع ہوا ہے؟

بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے (وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ۱۸/۵۴)۔ یہ بڑا بے صبرا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ۷۰/۱۹)۔ تنگ نظر ہے (وَکَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۱۷/۱۰۱)۔ جلد باز ہے (کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۱۷/۱۱)۔ مال و دولت کی محبت میں بڑا متشدد ہے (وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۱۰۰/۸)۔ چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی دولت اسی کے پاس سمٹ کر آجائے (وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۸۹/۲۰)۔ وہ دولت سمیٹتا چلا جائے اور پھر اسے گرہ میں باندھ کر رکھ لے (وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ۷۰/۱۹)۔ اور اسے اس طرح روک کر بیٹھ جائے کہ یہ کسی اور تک نہ پہنچنے پائے (وَاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ۷۰/۲۱)۔ واضح رہے کہ جب قرآن کریم، انسان کے متعلق یہ کچھ کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہ نہیں کہ انسان کی فطرت بد واقع ہوئی ہے۔ قطعاً نہیں۔ (انسان کی فطرت کوئی

انسان بد فطرت نہیں

نہیں - یہ سادہ لوح لے کر آتا ہے)۔ اصل یہ ہے کہ تحفظِ خویش (Preservation of self) ہر ذی حیات کا طبعی جذبہ ہے۔ ہر جاندار زندہ اور باقی رہنے کے لئے انتہائی جد و جہد کرتا ہے - انسان کے علاوہ جتنے ذی حیات ہیں ، فطرت نے ان کی جد و جہد کا دائرہ خود محدود کر دیا ہے - اسے ان کی جبلت (Instinct) کہتے ہیں - کسی جاندار کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باھر نکل سکے - اس لئے حیوانات کی دنیا میں فساد انگیزی نہیں ہوتی - لیکن انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ اپنے جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں حدود فراموش ہو جاتا ہے - اسی لئے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں — انفرادی بھی اور اجتماعی بھی — جنہیں نپٹانے کے لئے نظامِ سیاست کی ضرورت لاحق ہوتی ہے -

کسی انسان کو حکومت کا حق نہیں

سابقہ باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کے سپرد ''جھگڑے نپٹانے'' کا کام کیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو محکوم - اس کے بعد اقتدار کی لذت انہیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی حکومت کی گرھوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جائیں - اور ایسے اقدامات کریں جن سے حکومت ان کے ھاتھوں سے کبھی چھیننے نہ پائے - قرآن کریم نے ، ایک انسان پر دوسرے انسان کی حکومت کے تصور کو باطل قرار دینے کے لئے اِس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ''ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو (یکساں طور پر) واجب التکریم پیدا کیا ہے'' اس لئے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حاکم اور دوسروں کو محکوم سمجھے - اور اس طرح اوروں سے اپنا حکم منوائے - مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ...... (۳/۷۸) ''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین ، فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم ، خدا کو چھوڑ کر ، میرے محکوم بن جاؤ......''

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

لہذا پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم، انسانوں کو حقِ حکومت دیتا ہی نہیں، خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ نظامِ حکومت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی ضرورت سمجھتا ہے — بلکہ اسے لازمی قرار دیتا ہے — لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ حکومت صرف اللہ کی ہوسکتی ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ یہی نظامِ زندگی سیدھا اور متوازن ہے۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰)۔ لیکن انسانوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی"۔ خدا اپنے اس حق حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا ۱۸/۲۶)۔

لیکن خدا تو ایک مجرد حقیقت (Abstract Reality) ہے۔ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی آواز سن سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اُس سے کس طرح کراسکتے ہیں؟ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کرسکتے ہیں؟

خدا کی حکومت کتاب اللہ کی رو سے

اس کے لئے اس نے بتا دیا کہ یہ فیصلے اُس ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کئے جائیں گے جسے اس نے رسول اللہؐ پر نازل کیا تھا۔ اس ضمن میں خود نبی اکرمؐ کی زبان سے کہلوا دیا کہ

> اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ
> الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا . . . . . (۶/۱۱۵)
>
> کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں، حالانکہ
> اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر
> بیان کرتی ہے۔

لہذا خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت کی جائے جنہیں اس نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ ان قوانین کے علاوہ اور کسی

کی اطاعت نہیں کی جائے گی ۔ اس کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا
مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ($\frac{۷}{۳}$)

تم صرف اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور اس کے سوا کسی سرپرست کا اتباع مت کرو ۔ (لیکن) تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ۔

زنده اتھارٹی

لیکن کتاب کے اندر لکھے ہوئے قوانین محض نظری (Theoretical) حیثیت رکھتے ہیں اور متنازعہ فیہ امور میں کبھی فیصلہ نہیں کرسکتے جب تک انہیں عملاً نافذ کرنے والی کوئی اتھارٹی موجود نہ ہو ۔ قرآن کریم نے سب سے پہلے خود رسول اللہ ؐ کو ایسی اتھارٹی قرار دیا (اور ظاہر ہے کہ حضور ؐ کی موجودگی میں کوئی اور اتھارٹی ہو نہیں سکتی تھی) اور آپ ؐ کی اِطاعت کو خود خدا کی اِطاعت قرار دے دیا ۔ (وَ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ $\frac{۴}{۸۰}$) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی ۔ اور اس نظام کی اہمیت کو ان الفاظ میں اجاگر کر دیا کہ

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا
مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ ($\frac{۴}{۶۵}$)

تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں (اے رسول) تجھے اپنا ثالث مقرر نہ کریں اور پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں ۔ بلکہ اسے اپنے دل کی پوری رضامندی سے قبول کرلیں ۔

ایک طرف ، جماعت مومنین (یعنی مملکت اسلامی کے افراد) سے یہ کہا اور دوسری

طرف رسول اللہ ؐ (یعنی فیصلے دینے والی اتھارٹی) سے تاکید کردی کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ - ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کر - وَ لَاتَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الْحَقِّ ؕ (۵/۴۸) جب حق تیرے پاس آچکا ہے تو ان لوگوں کے خیالات کی پیروی مت کر۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو نظامِ سیاست متعین کیا ہے، اس کی رو سے حکومت کی مرکزی اتھارٹی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ

(i) وہ متنازعہ فیہ امور میں لوگوں سے اپنا حکم منوائے - یا

(ii) ان قوانین کے خلاف فیصلہ دے جو کتاب اللہ میں مذکور ہوں

بالفاظ دیگر، اُس اتھارٹی کا کام قوانین سازی نہیں، بلکہ قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے - اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) قانون سازی کے آخری اختیار کو کہتے ہیں، تو قرآنی نظامِ سیاست میں اس قسم کا اقتدار، نہ عوام کے منشاء (General will of the People) کو حاصل ہوتا ہے، نہ ہی کسی خاص فرد کو - یہ حق صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کی عملی مظہر اس کی کتاب ہوتی ہے - اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) بھی حاصل نہیں ہوتے - اس میں سب سے بڑی اتھارٹی بھی قوانین خداوندی کی اطاعت کرتی ہے - خدا کے نام پر اپنا حکم نہیں چلاتی۔ چنانچہ خود نبی اکرم ؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ وَاتَّبِعْ مَا یُوحٰی اِلَیْکَ.... (۱۰/۱۰۹) ”جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کر......“۔ خدائی اختیارات کا تصور' قرآنی نظام سے کسقدر دور ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب رسول اللہ ؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو کسی نے انہیں خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا - اس پر آپ نے اُسے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں - خلیفۃ الرسول ہوں - خود رسول اللہ نے بھی کبھی اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا - اسلامی حکومت' قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرنے والی اور بندوں کے متعلق جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں انہیں پورا کرنے

والی ہوتی ہے۔ خدا کی قائمقام نہیں ہوتی۔ خدا کی قائمقامی کا تصور' تھیا کریسی کا پیدا کردہ ہے جو قرآن کی رو سے باطل ہے۔

غیر متبدل اصول

چونکہ قرآن کریم کی آخری کتاب ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے تمام نوع انسان کا ضابطۂ حیات قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں (بجز چند مستثنیات) صرف اصولی قوانین دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان اصولوں کے متعلق کہدیا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہینگے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۶) ”تیرے رب کی بات عدل اور سچائی کی حیثیت سے مکمل ہوگئی۔ اس کی باتوں (قوانین) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اس لئے کہ یہ قوانین معاذاللہ کسی اندھی قوت یا بے خبر انسان کے بنائے ہوئے نہیں۔ یہ اس کے متعین کردہ ہیں جو) سب کچھ سننے والا اور ہر بات کا جاننے والا ہے“۔ ان ہی ”کلمات اللہ“ (قوانین خداوندی) کو غیر متبدل اصول (Un-Alterable Principles) یا مستقبل اقدار (Permanent values) کہتے ہیں۔ ان میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا — کسی پارٹی کی اکیاون آراء تو ایک طرف، پوری نوعِ انسانی کی سو فیصدی آراء بھی ان میں کسی قسم کی کمی بیشی یا ردوبدل نہیں کر سکتیں۔ انہی غیر متبدل اصولوں کو حدوداللہ کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حدود (Boundary Lines) کے اندر رہتے ہوئے، افراد مملکت کے مشورے سے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی احکام مرتب کرے۔

مشاورتی نظام

یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۵۸) ”ان معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیا کر“۔ قرآن کریم اس مشاورت کی کوئی خاص شکل تجویز نہیں کرتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت، اپنے زمانے کے تقاضے اور اپنے حالات کے مطابق، جس قسم کا انتظام مناسب سمجھے تجویز کرلے۔ قرآن کریم کا مقصد صرف مشاورت سے ہے، مشاورتی

مشینری سے نہیں ۔ اس سے ظاھر ھے کہ اسلامی نظام سیاست میں قوانین سازی کے اختیارات ، قرآن کریم میں بیان کردہ غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر محدود ھونگے ۔ یه چاردیواری غیرمتغیر رھیگی اور اس کے اندر اُمت کو اختیار ھوگا که وہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنے لئے خود جزئیات متعین کرے ۔ اس سے آپ نے یه بھی دیکھلیا که اس نظام میں نه تو انسانوں کو ایسے غیر محدود اختیارات دئے گئے ھیں که وہ اپنی من مانی کرسکیں اور نه ھی ان کی آزادی کو اس طرح سلب کر لیا گیا ھے که وہ اپنے معاملات کے متعلق کچھ سوچ ھی نه سکیں ۔ اس نظام میں امت کی حیثیت فٹ بال کے میدان میں ٹیم کی سی ھوتی ھے که وہ میدان کی چاردیواری (Boundary Line) کے اندر رھتے ھوئے پوری آزادی کے ساتھ کھیل کھیلیں ۔ اور باھمی تعاون سے زندگی کے بال کو اس کے گول (نصب العین) تک لے جائیں ۔ یه ھے قرآنی جمہوریت کا صحیح تصور ۔

جیسا که ھم نے پہلے کہا ھے ، یه نظام سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا ۔ لیکن چونکه یه کوئی عارضی نظام نہیں تھا بلکه اسے تمام نوع انسان کے لئے ھمیشه کے لئے تجویز کیا گیا تھا ۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی که یه نبی اکرمؐ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ھو جائیگا ۔ سورة آل عمران میں ھے ——

رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ ۔ (۳/۱۴۳)

محمد بجز این نیست که الله کا پیغامبر ھے ۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ھو گذرے ھیں ۔ سو اگر یه (کل کو) وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم پھر اپنی قدیمی روش کی طرف لوٹ جاؤ گے ؟

چنانچه امت سے کہه دیا گیا که تم نے ، رسول اللہؐ کی وفات کے بعد ، اس نظام

کو اسی طرح آگے بڑھاتے چلے جانا - یعنی قرآن کی متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ھوئے ، باھمی مشاورت سے ، جزئیات کا تعین کرتے ھوئے - اسی نظام کی حامل امت کے متعلق کہا گیا ھے کہ وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸)

اسلامی جمہوریت

ان کا نظامِ حکومت باھمی مشورہ سے طے پاتا ھے - اسی کا نام اسلامی جمہوریت ھے - اس جمہوریت میں -

(i) نہ تو مغربی ڈیماکریسی کے مطلق اختیارات ھیں ، جس میں کوئی اصول غیر متغیر اور کوئی قدر مستقل نہیں - اس میں برسراقتدار پارٹی کی اکثریت جو قوانین چاھے بنائے - جب جی چاھے ان میں رد و بدل کردے اور جس وقت چاھے انہیں منسوخ کردے -

(ii) نہ ھی اس میں ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ ھے کہ ایک فرد قوت کے زور پر ھر ایک سے اپنا حکم منواتا چلا جائے -

(iii) نہ ھی اس میں تھیاکریسی ھے کہ کسی فرد یا جماعت کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جائے - اس میں مذھبی پیشواؤں کا وجود ھی نہیں ھوتا - اور

(iv) نہ ھی اس میں یہودی شریعت کی سی جکڑ بندی ھے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کےلئے بھی غیر متبدل ، ابدی قانون موجود ھو اور اس ”لوھے کے جوتے،، سے پاؤں باھر نکالا ھی نہ جا سکے -

مستقل ضمانت

اس نظامِ سیاست میں ھر فرد انسانیہ کو ایسے مستقل حقوق حاصل ھوتے ھیں جنہیں کوئی تبدیل یا منسوخ نہیں کر سکتا - حکومتیں قائم ھوتی رھیں اور بدلتی رھیں - افراد آتے رھیں اور جاتے رھیں - لیکن اس مملکت میں بسنے والے شہریوں کو (خواہ وہ غیر مسلم ھوں یا مسلم) جو حقوق خدا کی طرف سے مل چکے ھیں ، ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ھو سکتا - کتنی بڑی ھے یہ ضمانت جو کسی مملکت میں افرادِ انسانیہ کو حاصل ھو اور کتنا بڑا ھے وہ اطمینان جو اس ضمانت سے میسر آئے - سب سے بڑا اطمینان یہ کہ اس

میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لئے اس مملکت کا ہر شہری ارباب بست و کشاد کی طرف سے بار بار یہ اعلان سنے گا کہ

کلمۂ شہادت کے معنی!

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ

میں اس کی شہادت دیتا ہوں۔ میں دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں۔ کہ دنیا میں خدا کے علاوہ کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں۔

اس میں اگر کوئی اور شریک ہو سکتا تھا تو خدا کا رسول ہو سکتا تھا، جس سے بلند تر ہستی کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا۔ لیکن!

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں۔ دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ محمدؐ بھی خدا کا عبد (بندہ۔ محکوم) اور اس کا پیغامبر ہے۔

اور جب دنیائے انسانیت کی بلند ترین ہستیؐ کی یہ پوزیشن ہے تو کسی دوسرے انسان کو اس کا حق کب حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ رسول اللہؐ نے کسی انسان کو اپنا محکوم بنایا۔ نہ ہم کسی انسان کو اپنا محکوم بنا سکتے ہیں۔ حضورؐ نے خود بھی احکام خداوندی کی اطاعت کی اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائی۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں ہمارا فریضہ بھی یہی ہے کہ ہم خدا کے قوانین کی خود بھی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائیں۔

لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ اسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے؟ ایک فقرہ

میں اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی آئیڈیالوجی ہے اس کا کلمۂ طیبہ۔ یعنی اس امر کا اعلان کہ اطاعت و محکومیت صرف قوانین خداوندی کی ہے۔ اور کسی کی نہیں۔

وَبِذَالِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (٦/١٦٣)

اس مقام پر یقیناً آپ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوگی کہ اُن اصولوں کا تعارف کرایا جائے جنھیں قرآن کریم غیر متبدل قرار دیتا ہے اور ان اقدار کو سامنے لایا جائے جنہیں وہ مستقل اور مطلق (Permanent and Absolute) ٹھہراتا ہے اور جن کے نفاذ کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے۔ ان اقدار کی فہرست طویل ہے جسے ضمناً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن اس غرض کے لئے کہ ان اقدار کا کچھ نہ کچھ تصور (Idea) ذہن میں آجائے، ہم یہاں (تمثیلاً) دو چار کا ذکر کئے دیتے ہیں۔

پہلی مستقل قدر — تکریم آدمیت

سب سے پہلی قدر تو یہی ہے کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ (١٧/٧٠) جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس میں رنگ، نسل، زبان، ملک، قوم، مذہب، حسب، نسب، امارت، افلاس وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر انسان، بہ حیثیت انسان، عزت کا مستحق اور تعظیم کا سزاوار ہے۔ اس اصول کے بنیادی قدر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مملکت نہ کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے اور نہ معاشرہ میں ایسا نظریہ رائج ہونے دے سکتی ہے جس کی رو سے کوئی انسان (پیدائشی یا پیشہ وغیرہ کی) اضافی نسبتوں سے شریف یا ذلیل تصور کیا جائے۔ معاشرہ میں عزت کے مدارج، جوہر ذاتی کے مطابق متعین ہوں گے (وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ ٤٦/١٩)

(۲) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب العزت سمجھنا۔ ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج کا تعین کرنا۔ کسی کے حقوق و

دوسری مستقل قدر ـــ عدل

واجبات (Dues) کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے قانون کے مطابق کرنا، جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو، عدل کہلاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی رو سے دوسری مستقل قدر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ..... (۱۶/۹۰) ”اللہ عدل کا حکم دیتا ہے“۔ اسلامی مملکت عدل کا راستہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔

تیسری مستقل قدر ـــ احسان

(۳) بعض اوقات (مثلاً کسی پیدائشی نقص یا حادثات کی وجہ سے) ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی کسی استعداد میں مستقل طور پر کمی وقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دیگر ہم عصر افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کی اس کمی کو پورا کرنا احسان کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے جہاں عدل کا حکم دیا ہے وہاں احسان کو بھی ایک غیر متبدل اصول قرار دیا ہے۔ چنانچہ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ اللہ عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ احسان کے معنی ہیں حسن قائم رکھنا۔ توازن برقرار رکھنا۔

چوتھی مستقل قدر ـــ دشمن سے عدل

(۴) عدل کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ صرف ”اپنوں“ کے ساتھ ہی نہیں کیا جائیگا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کیا جائے گا۔ ارشاد ہے وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵/۸) ”کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہر حال میں عدل کرو۔ یہ روش تقویٰ سے زیادہ قریب ہے“۔ یہ بھی قرآن کریم کی رو سے ایک مستقل قدر ہے۔

(۵) عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے اور ہر شخص اپنے اعمال کے لئے خود جواب دہ ہو۔ اس کے لئے قرآن کریم نے کہا

پانچویں مستقل قدر — اپنا بوجھ آپ اٹھاؤ

کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی ($\frac{٦}{١٦٥}$) ”کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا“ - یہ قرآن کا بڑا جامع اصول ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر ہوسکتا ہے - یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا -

(٦) ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے - یہ بھی ایک غیر متبدل اصول ہے - ہر ایک کو قانون کی اطاعت کرنی ہوگی لیکن کوئی بھی ایسا قانون وضع نہیں کیا جاسکے گا جو خدا کی مقرر کی ہوئی مستقل اقدار سے ٹکرائے -

چھٹی مستقل قدر — نظم و نسق میں ہر ایک شریک ہوگا

مستقل اقدار کے مطابق حکومت قائم کرنا کسی ایک فرد یا پارٹی کا کام نہیں ہوگا - اس میں پوری کی پوری اُمت شامل ہوگی - اسی مقصد کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ . . . ($\frac{٣}{١٠٩}$) - ”تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے باہر لایا گیا ہے - تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم سب کو قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دو اور قانون کی خلاف ورزی سے روکو“ - اس سے دو باتیں واضح ہیں - ایک تو یہ کہ اسلامی حکومت تمام افراد کی مشترکہ امانت ہوگی - اور دوسرے یہ کہ اس اُمت کی ہستی کی وجہ جواز (Justification for Existance) یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں نوعِ انسان کی بھلائی ہو -

ساتویں مستقل قدر — امانات نااہلوں کے سپرد نہ کرو

(٧) حکومت چلانے کا فریضہ تو تمام اُمت کا مشترکہ ہوگا لیکن اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ امورِ نظم و نسق صرف اِن لوگوں کے سپرد کئے جائیں جو ان کے اہل ہوں - اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَهْلِهَا . . . . ($\frac{٤}{٥٨}$) ”اللہ تمہیں اس

امر کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں"۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں کیا جاسکتا۔

آٹھویں مستقل قدر—رزق کی ذمہ داری

(۸) قرآن کریم کی رو سے اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور انہیں اس کی ضمانت دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاهُمْ (۶/۱۵۲) "ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی"۔

یہ بھی ایک بنیادی حق ہے جو تمام افراد مملکت کو یکساں طور پر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مملکت میں بدنظمی یا بے انصافی کی وجہ سے ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلاسکتی۔

حب الوطنی کا جذبہ

(۹) یہ ظاہر ہے کہ اس نظامِ سیاست کی ابتداء کسی ایک خطۂ زمین سے ہوگی جس کی حفاظت تمام افراد مملکت کا اولین فریضہ ہوگا۔ اس حد تک ملک کی خیرسگالی (Partriotism) ایک مستحسن جذبہ قرار پائے گا۔ لیکن قرآن کریم کا منتہیٰ یہ ہے کہ اس نظام کو تمام عالمِ انسانیت تک پھیلا دیا جائے۔ اس لئے کہ اس کی رو سے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳)۔ "تمام انسان امتِ واحدہ ہیں"— اس کا مستقل اصول ہے۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس نظام کو اس طرح پھیلایا جائے کہ نوع انسانی اس کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر خود بخود اسے اختیار کرتی چلی جائے۔ وہ اسے جبراً کسی سے نہیں منوانا چاہتا۔ اس لئے کہ لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲۵۶) "دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جاسکتی"۔ اس کی طرف سے پیش کردہ مستقل اصول ہے۔ جو لوگ اس نظامِ زندگی کو اپناتے چلے جائیں گے، وہ ایک امت کے فرد بنتے جائیں گے۔ جو اس کے خلاف، کوئی دوسرا نظام تجویز اور اختیار

عالمگیر انسانی برادری

لا اِکراہ فی الدّین

قومیت کی تشکیل — آئیڈیا لوجی کی رو سے

کریں گے وہ دوسری قوم کے افراد ہوں گے۔ قرآن کریم کی رُو سے قومیت کی تشکیل کا یہ معیار (یعنی آئیڈیا لوجی) بھی ایک مستقل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح وہ چاہتا ہے کہ تمام انسان رفتہ رفتہ ایک قانون کے تابع آکر وحدت انسانیت کی زندگی بسر کریں۔ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی یہی وہ شکل ہے جسے عملی پیکر میں دیکھنے کے لئے مغرب کے مفکرین اور مدبرین اس قدر آرزو مند ہیں۔ چنانچہ پروفیسر کوبن اپنی اس کتاب کے آخری باب میں (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) لکھتا ہے۔

> دنیا کے مصائب کا جوحل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔ (صفحہ ۲۲۰)

مسٹر (Emery Reves) جس نے (The Anatomy of peace) کے عنوان سے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع کی ہے، کہتا ہے۔

عالمگیر نظام

> ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے)۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (صفحہ ۱٦۴)

مسٹر (Reves) دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

> کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے

> بعد، انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ھے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ھے۔ ھمارا فریضہ ھے کہ ھم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے اسے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاھئیے جن پر یہ اقتدار متشکل ھوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاھیئے تاکہ یہ مقصد خون ریزی کے بغیر حاصل ھو جائے۔ اگر اس مقصد کا حصول اس طرح ممکن نہ ھوا تو پھر تاریخ کا فولادی ھاتھ مجبور کر دے گا کہ ھم اور خونریزی کریں اور آج سے زیادہ مہلک آلات حرب و ضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو مغلوب کرکے وحدتِ اقتدار قائم کر لے۔ (صفحہ ۲۳۳)

جس ”اقتدارِ واحد“ کے لئے مسٹر (Reves) کا دل اس قدر مضطرب و بیقرار ھے (اور دنیا کے ھر دلِ درد مند کو ایسا ھونا چاھیئے) اس کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن کریم نے ”لا الٰہ الا اللہ“ کے انقلاب آفریں پیغام کے ذریعے کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ھے، اس (کلمۂ توحید) کے معنی ھی یہ ھیں

اقتدارِ واحد

کہ تمام نوع انسانی کو واحد اقتدار کے تابع زندگی بسر کرنی چاھیئے۔ اور وہ ”اقتدار واحد“ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا نہیں بلکہ خدا کا ھو سکتا ھے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر سمجھایا تھا کہ بتاؤ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹)۔ ”کیا مختلف اقتدارات بہتر ھیں یا ایک خدا کا اقتدار جو بڑی قوتوں کا مالک ھے؟“ قرآن کریم کی رو سے توحید کے معنی وحدتِ اقتدار کے ھیں۔ اور شرک سے مفہوم ھے متعدد اقتدارات۔ اسی کے لئے اس نے کہا تھا کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲/۴۰) ”خدا نے حکم دیا ھے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو“۔ اقتدار صرف اسی کا تسلیم کرو۔ اس کا یہ پیغام تمام نوع انسان کے نام

یہی توحید سے مطلب ہے

تھا۔ کسی خاص قوم، ملک یا گروہ کے نام نہیں۔ قُلْ یٰاَیُّھَاالنَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ — ان سے کہدو کہ اے نوعِ انسان! جو نظام زندگی میں لایا ہوں اگر تمہیں اس کے سچا ہونے میں کوئی شک ہے تو (میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم ضرور اسے اختیار کرو لیکن) فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ —"میں تو ان کا اقتدار تسلیم نہیں کر سکتا جن کا اقتدار تم، خدا کو چھوڑ کر، اختیار کئے ہو۔ میں تو صرف اسی خدائے واحد کا اقتدار تسلیم کرتا ہوں جس کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ تمہاری موت وحیات تک بھی اُس کے اقتدار کے تابع ہے"— وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اُن لوگوں کے زمرے میں رہوں جو خدا کے اقتدار پر یقین محکم رکھتے ہیں"، وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ($\frac{۱۰}{۱۰۴-۱۰۵}$) "اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ تو، ہر طرف سے منہ موڑ کر، اسی نظامِ زندگی کو اپنا نصب العین بنا اور، مختلف اقتدارات کو اختیار کرکے مشرکین میں سے مت ہوجا،"— یہی وہ وحدت اقتدار ہے جو اس عالمگیر نظامِ انسانی کی بنیاد بن سکتا ہے، جس کا تصور پروفیسر (Harold Laski) کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا، جب اس نے کہا تھا کہ

> دنیا میں اس وقت انسانی حالت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک عالمگیر نظام کی تشکیل کی جائے جس کے اراکین تمام دنیا کے افراد ہوں۔ (Human Rights- P. 91)

اور جس کے متعلق مسٹر (W. A. Gauld) نے اپنی کتاب (Man, Nature and Time) میں لکھا تھا کہ

> مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے.......

> ابھی تک اسی عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسن ظن قبل از وقت ھوگا۔ لیکن یہ حقیقت، کہ کم و بیش ھر ملک میں ایسے افراد موجود ھیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رھا ھے، اس امر کی ضمانت ھے کہ کچھ وقت کے بعد یہ خیال عملی شکل اختیار کر لے گا۔ (صفحہ ۲۸۴ - ۲۸۱)

قرآن کریم کا کہنا ھے کہ ایسا نظام آخرالامر دنیا میں قائم ھو کر رھے گا — خون ریزی سے نہیں بلکہ ذھنی تبدیلی سے، جو زمانے کے تقاضوں سے رفتہ رفتہ ھوتی چلی جا رھی ھے۔ مسٹر (Reves) کا یہ خیال غلط ھے کہ جدید قسم کے آلاتِ حرب و ضرب سے کوئی ایک قوم، باقی اقوام کو مغلوب کر کے، اپنا اقتدارِ واحد قائم کر لے گی۔ اب جو آلات حرب وضرب ایجاد ھو رھے ھیں اگر انہیں جنگ میں استعمال کیا گیا تو نہ قوم غالب باقی رھے گی نہ قوم مغلوب۔ پوری کی پوری نوع انسان تباہ ھو جائے گی۔ اس لئے وحدت انسانیت کا عالمگیر نظام، جو خدا کے اقتدار واحد کی بنیادوں پر استوار ھوگا، انسان کی داخلی تبدیلی سے ظہور میں آئے گا۔ یہی قرآن کا بتایا ھوا طریق کار (Process) ھے۔ لیکن اس کا آغاز بہرحال کسی ایک خطۂ زمین سے ھوگا۔ آخر وہ خطۂ زمین پاکستان کیوں نہ ھو؟

اگر ھم نے پاکستان میں قرآن کریم کے سیاسی نظام کو رائج کر لیا تو اس سے نہ صرف ھماری مشکلات ھی کا حل مل جائے گا بلکہ ساری دنیا کو اس جہنم سے نجات مل جائے گی جس میں وہ آج اس بری طرح سے گرفتار ھے۔ یہ وہ حقیقت ھے جس کا احساس ھم سے بھی پہلے مغرب کے مفکرین کے دلوں میں بیدار ھو رھا ھے۔ چنانچہ عصرِ حاضر کا نامور مورخ پروفیسر ٹوئن بی (A. J. Toynbee) اپنی کتاب (The World and the West) میں لکھتا ھے۔

> مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ھیں جن کا باعث فوز و فلاح ھونا مشکوک ھے۔ ان میں سے ایک ھماری نیشنلزم ھے۔

> ترک اور بعض دوسرے اسلامی اسلامک ممالک، نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلا لحاظِ اختلاف نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ، محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ . . .
>
> دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چُندھیا دیا ہے کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے عالمگیر مؤدت و اخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری تصور اپنے ہاں رائج نہیں کرینگے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ (صفحہ ۳۱ - ۳۰)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ غیر مسلم مفکر و مؤرخ ہمیں کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ ہم تو قومیت پرستی کے عذاب میں ماخوذ ہیں اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی (آسمانی) روشنی نہ تھی جو صحیح راستے کی طرف ہماری راہنمائی کرتی۔ لیکن تمہارے پاس تو (تیرہ سو سال سے) ایک قندیلِ خداوندی روشن تھی جو زندگی کے ہر دوراہے پر تمہاری راہنمائی کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بھی ہم اندھوں کے پیچھے لگ کر جہنم کے طرف چل پڑے؟

تمہیں تو ہماری راہنمائی کرنی چاہئے تھی اور بتانا چاہئیے تھا کہ انسانیت کی نجات و سعادت، آئیڈیا لوجی کی بنیادوں پر عالمگیر برادری کی تشکیل میں ہے، نہ کہ رنگ ۔ نسل ۔ زبان ۔ وطن کے اشتراک سے قومیت کے تصور پر! آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ملّت کی تشکیل، ہمارے لئے کوئی نیا نظریہ نہیں یہ تو دین کے ان اصولوں میں سے ہے جو خدا کی طرف سے اس زمانے سے ملنے شروع ہو گئے تھے جب انسان کو پہلے پہل وحی کی راہنمائی کی ضرورت پڑی تھی ۔ یہی وہ تصور تھا جس کی رو سے حضرت نوحؑ کے بیٹے کے متعلق کہہ دیا گیا تھا کہ وہ باپ کے "اہل" میں سے نہیں ہے ۔ اسی کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد (اور ساری قوم سے) کہدیا تھا کہ اُن میں اور ان میں بُعد و مغائرت کی وسیع خلیج حائل رہے گی جب تک یہ خدائے واحدِ کی محکومی تسلیم نہیں کریں گے ۔ اسی نظریہ کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کا شمار بیگانوں میں کیا گیا تھا ۔ پھر آخرالامر اسی اصول کے مطابق، مکہ کے رہنے والے قریش، خود نبی اکرمؐ کے ہم قبیلہ (بنو ہاشم) بلکہ آپؐ کے قریب ترین رشتہ دار (حقیقی چچا وغیرہ)، اشتراکِ رنگ ۔ نسل ۔ زبان ۔ وطن کے باوجود، ایک الگ قوم کے افراد قرار دیئے گئے تھے اورحبش کے بلالؓ ۔ روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ اپنی برادری کے اخوان ۔ لیکن آج اُسی دین کے نام لیواؤں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کہیں نسل کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت کی تشکیل ہو رہی ہے ۔ کہیں زبان کے اشتراک سے علیحدگی کے دعوے کئے جارہے ہیں ۔ کہیں وطنیت کی رو سے قوم ترتیب پا رہی ہے ۔ ہم یہ کچھ کررہے ہیں اور غیر مسلم ہمیں متنبہ کر رہے ہیں کہ تمہاری یہ روش تمہیں تباہیوں کی طرف لے جائیگی ۔ تم اپنے ہاں عالمگیر برادری کے اُسی تصور کو عام کرو جسے تمہارے دین نے انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے تجویز کیا تھا ۔

ظاہر ہے کہ عالمگیر برادری اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب تمام مسلم ممالک اپنے ہاں قرآنی نظامِ سیاست رائج کر لیں ۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ امکان پاکستان میں ہے ۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک میں کوئی نہ کوئی نظام پہلے سے

رائج ھے۔ لیکن پاکستان نے اپنے لئے کسی نظام کو تجویز کرنا ھے۔ اس اعتبار سے دیکھئیے تو اِس وقت ساری دنیا کی آنکھیں پاکستان کی طرف لگی ھوئی ھیں اور وہ اسے پکار کر رھی ھیں کہ!

تماشه کر اے محوِ آئینه داری تجھے کس تمنا سے ھم دیکھتے ھیں

خدا کرے کہ مملکتِ پاکستان دنیا کی اس حسین توقع کو پورا کر دکھائے جو اس نے اسکے ساتھ وابستہ کر رکھی ھے۔

یہ انقلاب ھو تو بڑا انقلاب ھو

والسلام

پرویز

بیالیسواں خط

اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

دو گروہ

نہیں سلیم ! یہ سوال کچھ انوکھا تمھارے ھی دل سے نہیں ابھرا جو اس کے زبان تک لانے میں تمھیں اس قدر تردد و تامل ھوتا ۔ یہ تو ھر اس شخص کے ذھن میں پیدا ھوگا جو ھمارے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اور دیکھے گا کہ مسلمان اپنے ابتدائی دور میں اس تیزی کے ساتھ ساری دنیا پر چھا گئے کہ اس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی ۔ اور اس کے بعد وہ اس طرح مائل بہ زوال ھوئے کہ پھر ان کے ابھرنے کی کوئی صورت ھی پیدا نہیں ھوئی ۔ تاریخ کے اس مطالعہ کے بعد (جو حقائق پر مبنی ھے) اظہارِ خیال کرنے والوں کے دو گروہ ھمارے سامنے آتے ھیں ۔ ایک گروہ اس نتیجے پر پہنچتا ھے (اور اس کا اظہار بیباکانہ کرتا ھے) کہ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے عربوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی جس کی بناء پر وہ ایران اور روما کی مملکتوں پر غالب آ گئے اور ساری دنیا میں پھیل گئے ۔ لیکن اسلام میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ھوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ۔ اس لئے جب زمانہ آگے بڑھا تو اسلام ناکام رہ گیا اور مسلمانوں کا عروج' انحطاط میں بدل گیا ۔ اس کے بعد یہ گروہ طنزاً کہتا ھے کہ اب جب کہ زمانہ اس قدر

آگے نکل گیا ہے، اسی ناکام تجربے کے دہرانے کی کوشش کرنا حماقت ہے*۔ دوسرا گروہ اس قدر بےباکی کی جرأت تو نہیں کرتا لیکن اس کے دل میں بھی یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا اور اُس میں فی الواقعہ یہ صلاحیت تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا، تو وہ چند قدم چل کر رُک کیوں گیا۔ برابر آگے کیوں نہ بڑھتا گیا؟ یہ خیال ان کے دل میں تعجب اور تشکیک کے ملے جلے جذبات اُبھارتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی ابدی صداقت کے متعلق ان کے ایمان میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔

گروہ یہ ہو یا وہ، یہ سوال بہرحال ایسا ہے جس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اور جس کا اطمینان بخش جواب، غیروں کے اعتراض کے مسکت جواب اور اپنوں کے شبہات کے ازالہ کا موجب ہوگا۔ اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اسے بلاتکلف پوچھ کر یہ موقعہ بہم پہنچا دیا کہ میں اپنی بصیرتِ قرآنی کے مطابق اِس مشکل عقدہ کو وا کرنے کی کوشش کروں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھو سلیم! کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ تمہیں معلوم ہے کہ اس کائنات میں، خدا کے متعین کردہ، غیر متبدل، محکم اصول (قوانین) کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگۂ عظیم و عجیب اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ کائنات کی ہر شے، ان قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{۳}{۸۳}$) ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے (قوانین کے سامنے) جھکے ہوئے ہیں“، وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ($\frac{۱۶}{۴۹}$)۔ ”یہ کبھی ان قوانین سے سرکشی نہیں برتتے“۔ اسے ”کائناتی اسلام“ سمجھو۔ اس کے قوانین نہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رُک گئے ہیں۔ یہ برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا کوئی سقم یا خلفشار نہیں۔ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ($\frac{۶۷}{۳}$) ”تخلیقِ خداوندی میں تم کوئی جھول نہیں پاؤ گے“۔

India wins Freedom - By. M. Abul Kalam Azad.

جس طرح خدا نے سلسلۂ کائنات کے لئے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں ، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار (بذریعہ وحی) عطا کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام ، زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ، آگے بڑھتے اور بلند ہوتے چلے جاتے ہیں — یعنی انہیں ، اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں — لیکن انسان کو چونکہ (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبور پیدا نہیں کیا گیا ، اس لئے اُسے اس کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے انحراف برت کر ، اپنے خود ساختہ مسلک پر گامزن ہو — اول الذکر راستہ اسے عروج و ارتقاء کی طرف لے جائے گا اور ثانی الذکر مسلک ، زوال و انحطاط کی طرف ۔

حق و باطل کی کشمکش

خدا کا تجویز کردہ نظامِ زندگی (الدین یا الاسلام) تمام نوع انسان کی عالمگیر ربوبیت کی ضمانت دیتا ہے اور زمین کے دسترخوان پر بکھری ہوئی نعمائے خداوندی کو ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے ۔ لیکن یہ چیز ان لوگوں پر شاق گذرتی ہے جو اپنی قوت کے بل بوتے پر ، رزق کے سرچشموں پر قابو پا کر ، دوسروں کو ان سے محروم رکھنے اور اس طرح ان سے اپنی من مانی کرانے کی فکر میں رہتے ہیں ۔ اس لئے یہ گروہ نظامِ خداوندی (الاسلام) کی مخالفت کرتا اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے حق و باطل کی کشمکش کہتے ہیں ۔ اس سے تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ الاسلام کائنات میں بھی کارفرما ہے اور انسانی دنیا میں بھی — اس فرق کے ساتھ کہ کائنات میں اس کی کہیں مخالفت نہیں ہوتی اور انسانوں کی دنیا میں اسکی مزاحمت ہوتی ہے ۔

اب آگے بڑھو! تمہیں اس کا علم ہے کہ اگر بیج تندرست و توانا (صالح) ہو اور اسے ضروری سامانِ نشو و نما مل جائے تو اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے اور آہستہ آہستہ اوپر کو اُبھرتی ایک دن تناور درخت بن جاتی ہے ۔ بالفاظ دیگر

یوں کہا جائے گا کہ اُس بیج میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اُوپر کو اُبھرے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے ۔ جن ابدی قوانین اور مستقل اقدار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے (اور جن کے مجموعہ کا نام الاسلام ہے) قرآن کریم کہتا ہے کہ ان میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ تمام موانعات کو راستے سے ہٹاتے ہوئے اوپر کو اُبھریں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہیں۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ...... ($\frac{۳۵}{۱۰}$) ”ان خوشگوار نظریاتِ حیات میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ ”خدا کی طرف“ اوپر کو اُٹھتے جائیں“ ۔ یعنی عروج و ارتقا کی وہ آخری منزل، جسے خدا نے ان کے لئے متعین کیا ہے، اس تک پہنچ کر رہیں ۔ دوسرے الفاظ میں، حق میں اس کی صلاحیت اور قوت ہے کہ وہ باطل کا مقابلہ کر کے اسے شکست دے اور اس طرح اپنے راستے پر چلتا جائے ۔ قرآن کریم اس باب میں کہتا ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ..... ($\frac{۲۱}{۱۸}$) ”ہم حق کا باطل پر نشانہ لگاتے رہتے ہیں تو حق باطل کا سر توڑ دیتا ہے اور اس طرح باطل شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے“ ۔ باطل راستے سے ہٹ جاتا ہے اور حق پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں چلے جاتا ہے ۔

حق ہمیشہ غالب رہتا ہے

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہمارا مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے ۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ دنیا میں باطل کا دور دورہ ہے ۔ وہی ہر جگہ مسلط نظر آتا ہے۔ حق کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ظلم۔ استبداد۔ قہرمانیت۔ بددیانتی دھوکا ۔ فریب ۔ دنیا کے بازار میں انہی کا سکہ رواں دواں ہے ۔ تو پھر ہم کیسے سمجھ لیں کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش میں حق ہمیشہ باطل پر غالب آتا ہے اور باطل خاسر و ناکام میدان چھوڑ جاتا ہے؟ تمہارا یہ شبہ بجا ہے لیکن ایک غلط فہمی پر مبنی ۔ اس غلط فہمی کے رفع ہو جانے سے اس شبہ کا ازالہ خود بخود ہو جائیگا ۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کے متعین کردہ تصوراتِ حیات میں اس کی صلاحیت تو موجود ہے کہ وہ (اپنے زورِ دروں سے) تمام موانعات کو راستے سے ہٹاتے

اسکی رفتار سست ھوتی ھے

ھوئے آگے بڑھتے چلے جائیں - لیکن ان کی اس طرح آگے بڑھنے کی رفتار (تمہارے اندازوں کے مطابق) بڑی سست ھے - سورۃ سجدہ میں ھے یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ - ''خدا اپنے امر کی تدبیر سما سے ارض کی طرف کرتا ھے''- یعنی خدا اپنی مشیت کے مطابق ایک اسکیم کی تجویز کرتا ھے - اس کی یہ تجویز ''عالم امر'' میں ھوتی ھے جو انتہائی بلندیوں پر ھے - لیکن، اس اسکیم کو عملی تشکیل دینے کے لئے، وہ اس کا آغاز پست ترین سطح سے کرتا ھے - جیسے وہ بیج جس میں شاہ بلوط کا تناور درخت بننے کی صلاحیت ھوتی ھے، پہلے مٹی میں دبایا جاتا ھے - اس مقام سے اُس شاہ بلوط کی نمود کی ابتدا ھوتی ھے - ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) ''پھر وہ اسکیم اس کی طرف اٹھتی ھے ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار برس کی ھوتی ھے''، یعنی خدا کی ہر اسکیم (جو حق پر مبنی ھوتی ھے) اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ کر رھتی ھے - یہ نہیں ھو سکتا کہ وہ راستے کے موانعات سے مغلوب ھوکر ناکام یا نا تمام رہ جائے - لیکن اس کی ترقی کی یہ رفتار بڑی سست ھوتی ھے جس کی وجہ سے وہ (بظاہر) آگے بڑھتی نظر نہیں آتی - یہ تو پھر بھی مجرد حقائق (Abstract Truths) کی بات ھے - نمود و ارتقاء کی رفتار تو محسوس، مادی اشیاء میں بھی ایسی غیر مرئی (Invisible) اور غیر محسوس (Imperceptible) ھوتی ھے کہ آنکھ اس کا اندازہ نہیں کرسکتی - علم الارتقاء (Organic Evolution) کے ماہرین بتاتے ھیں کہ کسی ایک نوع (Species) میں ذرا سی تبدیلی کے لئے لاکھوں برس کی مدت درکار ھوتی ھے - یہ نہیں کہ ایک نوع لاکھ برس تک اسی حالت میں رھتی ھے اور پھر اُس میں یک لخت تبدیلی پیدا ھو جاتی ھے - نہیں! اس میں یہ تبدیلی بتدریج ھو رھی ھوتی ھے لیکن اس کی رفتار ایسی غیر محسوس ھوتی ھے کہ اس تبدیلی کا احساس تک بھی نہیں ھو سکتا - کہیں لاکھوں برس میں جا کر، وہ تبدیلی مشہود شکل میں سامنے آتی ھے - یہ ھے ''خدائی اسکیم''، کی وہ رفتار جس کا ایک ایک دن ھمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس کا (اور قرآن کریم کے دوسرے مقام کے

مطابق ، پچاس پچاس ہزار برس کا) ہوتا ہے ۔ تم اس سست روی کا اندزہ کرنا چاہو تو کسی پودے کے پاس بیٹھ جاؤ ۔ ہفتوں ۔ مہینوں ۔ برسوں ۔ دن رات اس کے پاس رہو ۔ وہ اس دوران میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہوگا لیکن تمہیں اس کا احساس تک بھی نہ ہونے پائے گا کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو رہی ہے —— لو ! مجھے یاد آگیا ۔ پچھلے سال جب تم یہاں تھے تو تمہاری گھڑی کی منٹوں کی سوئی گر گئی تھی اور صرف گھنٹوں کی سوئی رہ گئی تھی ۔ دن بھر گھڑی تمہارے سامنے رہتی تھی ۔ گھنٹوں کی سوئی ایک سے دو ، دو سے تین ، تین سے چار تک پہنچ جاتی تھی ۔ لیکن تمہیں احساس تک بھی نہیں ہوتا تھا کہ گھڑی چل رہی ہے ۔

غلبہ حق ہی کا ہوتا ہے

حق و باطل کی کشمکش میں ، حق کا غلبہ اور باطل کی شکست ، اُس آہستہ خرامی سے ہوتی ہے جس میں ایک ایک دن کی مدت ہمارے حساب و شمار کے مطابق ہزار سال کی ہوتی ہے ۔ ہم تاریخ کے کسی ایک دور کو لیتے ہیں (جو دس بیس برس پر مشتمل ہوتا ہے) اور دیکھتے ہیں کہ اس میں باطل کا دور دورہ ہے ۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ غلبہ باطل ہی کا رہتا ہے ۔ اگر ہم ہزار سال کی تاریخ کا دقت نظر سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ جہاں اور جب ، خدا کے متعین کردہ کسی اصول کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ نظام کا ٹکراؤ ہوا ہے ، آخرالامر غلبہ خدائی اصول کو ہوا ہے اور انسانی نظام ناکام رہا ہے ۔ (اس کی مثالیں ذرا آگے چل کر تمہارے سامنے آئیں گی) ۔

چونکہ مسئلہ ذرا مشکل اور بات دقیق ہے ، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے اسے مختصر الفاظ میں دُہرا دوں ۔ میں نے کہا یہ ہے کہ

(۱) اسلام اُن غیر متبدل اصولوں کا مجموعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے (بذریعہ وحی) عطا کیا ہے تاکہ ، اسکے مطابق زندگی بسر کرکے ، کاروان انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے ۔

(۲) مفاد پرست گروہ، اس ضابطۂ خداوندی کی مخالفت کرتے ھیں اور اس طرح حق اور باطل میں کشمکش کا سلسلہ شروع ھو جاتا ھے۔

(۳) حق میں اس امر کی صلاحیت ھے کہ وہ باطل کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف بڑھتا جائے، لیکن!

(۴) اس کی رفتار اتنی سست ھوتی ھے کہ اس کا ایک ایک دن ھمارے حساب و شمار کے مطابق ھزار ھزار سال کا ھوتا ھے۔

لیکن! اس کے ساتھ قرآن کریم کچھ اور بھی کہتا ھے، اور وہ اس سلسلہ کی بڑی اھم کڑی ھے۔ سورۂ فاطر کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ھے اس کا اگلا حصہ یوں ھے اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵/۱۰) "خوشگوار نظریات زندگی میں اس کی صلاحیت ھوتی ھے کہ وہ اپنے نصب العین کی طرف بلند ھوتے جائیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسان کے اعمال صالح کی تائید بھی شامل ھو جائے تو اس سے انھیں مزید ارتقاع (بلندی) حاصل ھو جاتی ھے۔ اس سے سلیم! بات صاف ھو گئی۔ یعنی قوانین خداوندی، اپنی عام (سست) رفتار سے خود بخود چلتے رہتے ھیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ھو کہ انسانوں کی کوئی جماعت انھیں اپنے ھاں عملاً نافذ کر کے معاشرہ کو ان کے خطوط پر متشکل کر لے، تو ان کی رفتار بڑی تیز ھو جاتی ھے۔ اور ان کے جو نتائج ھزار ھزار برس میں جا کر ظہور میں آنے تھے، وہ دنوں کے اندر سامنے آ جاتے ھیں۔ یوں سمجھو کہ عام حالات میں، انسانی معاشرہ میں تبدیلیاں ارتقائی طور پر (By Evolution) نمودار ھوتی ھیں لیکن انسانی جماعت کی رفاقت سے یہ تبدیلیاں، انقلابی طور پر (By Revolution) ظہور میں آجاتی ھیں۔ یا علم الارتقاء کی اصطلاح میں یہ تبدیلیاں فجائی ارتقاء سے (By Emergent Evolution) نمودار ھو جاتی ھیں۔

اسکی رفتار تیز کی جا سکتی ھے

اس ضمن میں ایک اور نقطہ بھی سمجھنے کے قابل ھے۔ جب خدا کے ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے جادہ پیما ھوتے ھیں تو ذھن انسانی عام طور پر

انھیں اپناتا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک تبدیلی نے ہزار برس میں جا کر نمودار ہونا ہے تو اس طویل مدت میں، ذہن انسانی کی سطح بھی اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ وہ اُس بلند تصور کو اپنا سکے۔ لیکن جب کسی خاص جماعت کے اعمال صالح سے یہ حقائق غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھ جائیں تو اس جماعت سے باہر کے انسانوں کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ ان حقائق کے ہم دوش ہو جائے۔ اس لئے وہ حقائق ان انسانوں کے لئے غیر مانوس رہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی بچے کی تعلیم کا سلسلہ جاری کریں اور اسے بتدریج آگے بڑھاتے چلے جائیں تو وہ ایک دن نہایت آسانی سے ایم۔ اے کے مشکل ترین اسباق کو سمجھ لے گا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ اس کے سامنے کوئی مشکل سوال آگیا ہے۔ لیکن اگر دسویں جماعت میں ایم۔ اے کا کورس اس کے سامنے رکھ دیا جائے تو اس کا ذہن اسے اپنے لئے غیر مانوس پائے گا۔ اگر ہم چاہیں کہ اسے دس سال میں ایم۔ اے تک پہنچائیں تو شروع ہی سے اس کی تعلیمی رفتار کو (اسی نسبت سے) تیز تر کرنا ہوگا جس کے لئے خاص انتظامات و اہتمامات کی ضرورت ہوگی۔

انسانی عقل کا طریق

انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ وہ (Trial and Error) سے کسی نتیجہ تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ پھر اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کے تجربات کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ نے صحیح نتائج پیدا نہیں کئے۔ اس طرح جب وہ نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے تو عقل انسانی دوسرا نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس طرح پیہم تجربات کے بعد، کہیں صدیوں میں جا کر وہ صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ اُس وقت یہ نظریہ اس کے لئے غیر مانوس نہیں ہوتا۔ اس تمام دوران میں ذہن اسے اپنا چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، وحی خداوندی کی رو سے صحیح نظریات زندگی بیک وقت انسانوں کے پاس آجاتے ہیں۔ اس لئے انسانی ذہن کو ان سے مانوس کرنے کے لئے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

(اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

ظہور اسلام

اس طویل تمہید کے بعد سلیم! تم اصل سوال کی طرف آؤ۔ خدا کے ابدی قوانین (الاسلام) اپنی معمولی رفتار سے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔ جس حد تک ذہن انسانی انہیں اپنا چکا تھا، وہ اس حد تک ان سے مانوس تھا۔ ان کا باقی حصہ ہنوز اس کی دسترس سے باہر تھا کہ اتنے میں، سر زمین عرب میں، نبی اکرمؐ کا ظہور قدسی ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے ابدی قوانین (الاسلام) کا مجموعہ بذریعہ وحی حضورؐ کو عطا فرمایا۔ ان قوانین کا جو حصہ ہنوز ذہن انسانی کی دسترس سے باہر تھا، حضورؐ کے مخاطبین نے اسے اپنے لئے غیر مانوس پایا اور اس کی مخالفت شروع کر دی۔ آپؐ نے اپنی بے مثال تعلیم اور بے نظیر عمل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حقائق کس طرح شرفِ انسانیت کے ضامن اور ان کی فلاح و بہبود کے کفیل ہیں۔ جن سعید روحوں نے، اپنے تعصب کو ایک طرف رکھ کر، انہیں سمجھنے کی کوشش کی، ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ حضورؐ سے متفق ہوگئے۔ اس طرح مومنین کی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہوتی چلی گئی۔ اس جماعت کے اعمال صالح (تعمیری پروگرام) نے خدا کے ابدی حقائق کی رفتار میں تعجب انگیز تیزی پیدا کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے ایسے محیرالعقول نتائج مرتب ہو کر سامنے آئے کہ تاریخ کے اوراق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ کچھ کسی مافوق الفطرت یا غیر معمولی اسباب کی رو سے ظہور میں نہیں آیا تھا۔ یہ خدا کے اسی ابدی قانون کے مطابق ہوا تھا جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ۔ خوشگوار نظریات حیات اپنے زور دروں سے اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں اور (انسانوں کے) اعمال صالح انہیں ترفع (بلندی) عطا کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس جماعت کے اعمال صالح کی رو سے ہوا تھا جنہوں نے ان قوانین کی رفتار میں ایسی غیر معمولی تیزی پیدا کر دی تھی کہ ان کے جو نتائج کہیں ہزار برس میں جا کر محسوس طور پر سامنے آتے تھے وہ چند دنوں میں مشہود ہو گئے۔

رفتار میں تیزی

اگر یہ سلسلہ اسی طرح سے قائم رہتا تو یہ حقائق اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلے جاتے (او سوچو سلیم! کہ اس طرح انسان اس وقت تک کہاں پہنچا ہوتا؟) لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ انسانی جماعت کے اعمالِ صالح ان حقائق کے ساتھ نہ رہے۔ لہذا ان حقائق نے پھر اپنی سابقہ (معمولی) رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ یہ تھوڑا سا زمانہ جس میں ان حقائق کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق سامنے آگئے تھے، وہ زمانہ ہے جس کے متعلق دنیا کے مؤرخین اور مفکرین یہ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اس وقت تک کامیاب رہا۔ اس کے بعد ناکام ہو گیا۔ حالانکہ جو کچھ فی الحقیقت ہؤا وہ صرف اس قدر ہے کہ اسلام اپنی معمولی رفتار (ہزار ہزار برس کے ایک ایک دن) سے چلا آرہا تھا۔ درمیان میں اسے خارجی قوت مل گئی جس سے اس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی۔ بعد میں وہ خارجی قوت الگ ہوگئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گیا۔ بالفاظ دیگر، نہر اپنی معمولی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ ایک مقام پر ٹھوکر (Fall) کی وجہ سے اس کی رفتا غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ جب یہ خارجی تحرک (Impetus) ختم ہو گیا تو وہ پھر اپنی سابقہ رفتار سے بہنے لگ گئی۔ یہ کہنا کہ نہر صرف اتنے وقت تک بہتی رہی جب تک اس کی لہروں سے اس کی رفتار محسوس طور پر نظر آتی تھی اور اس کے بعد وہ جوئے رواں کی بجائے ساکت و ساکن جوہڑ بن گئی، کم نگہی کی دلیل ہے۔

پھر وہی آہستہ خرامی

چار اہم شقیں

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، اس میں تین چار باتیں مزید غور کے قابل ہیں۔

(۱) وہ کیا چیز تھی جس سے اُس خاص دور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمالِ صالح، خدائی قوانین کے لئے اس قدر تحرک کا موجب بن گئے؟

(۲) بعد میں وہ چیز باقی کیوں نہ رہی؟

(۳) اگر وہ چیز باقی نہیں رہی تھی، تو بھی اُس زمانے کے عام انسانی ذہن نے ان بلند حقائق کو اپنا کیوں نہ لیا؟ اور

(۴) اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ قوانین خداوندی، بعد میں پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گئے اور اب تک چلے جا رہے ہیں۔ یعنی یہ نہر، جوئے رواں ہے۔ ساکن جوہڑ نہیں جو ایک مقام پر رک کر کھڑی ہو گئی ہو اور آگے چلنے کے قابل نہ رہی ہو۔

یہ سوالات ایسے ہیں جو بڑے گہرے غور و تدبر کے محتاج ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اسے بڑی توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔

نظام تعلیم و تربیت

سب سے پہلے شق اول کو لو۔ یعنی اس سوال کو کہ وہ کیا چیز تھی جس سے اُس خاص دور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمالِ صالح سے خدائی قوانین کو ایسی تقویت (Momentum) مل گئی۔ یہ چیز سلیم! بڑی صاف اور سیدھی تھی۔ قرآن کریم نے اسے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے، جہاں کہا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کا طریق عمل یہ تھا کہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیَاتِہٖ۔ وَ یُزَکِّیْھِمْ۔ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَۃَ ...... (۶۲/۲)۔ اس پروگرام کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن کریم پیش کرتے تھے۔ یعنی جن لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی تھی ان کے سامنے قرآن کریم اور خالص قرآن کریم پیش کیا جاتا تھا۔ اس میں انسانی خیالات، تصورات، نظریات، معتقدات کی قطعاً آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے قرآن کریم ملتا تھا اور اسی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جاتی تھی۔ اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸)۔ ”میں اور میرے متبعین خدا کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں“۔ یعنی قرآن کریم کو دلائل و براہین اور علم و بصیرت

کی بنا پر پیش کیا جاتا تھا۔ اسے نہ معجزات کے زور سے منوایا جاتا تھا، اور نہ ھی کسی کے سر پر تلوار رکھ کر اسے مسلمان ھونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

جو لوگ اس طرح علیٰ وجہ البصیرت (دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ) قرآن کریم کی صداقت کو تسلیم کر لیتے، ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ھو جاتا۔ نبی اکرمؐ انھیں سمجھاتے کہ خدا کے احکام و قوانین (الکتاب) کیا ھیں اور ان کی غرض و غایت (الحکمتہ) کیا۔ اس طرح انھیں ' الاسلام کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنی عقل و فکر سے کام لینے اور پیش آمدہ معاملات کا حل دریافت کرنے کے طور طریقے سکھائے جاتے۔

اور اس کے ساتھ ھی، صحیح آزادی کی ایسی فضا پیدا کی جاتی جس سے ان کی ذات (Personality) کی نشو و نما (تزکیہ نفس) ھوتی جاتی۔ ان کی ذھنی اور قلبی صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ھوتی۔ انھوں نے (اس سے پیشتر) انسانوں کی خود ساختہ رسوم و قیود کی جن زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا وہ سب ایک ایک کرکے ٹوٹ جاتیں اور وہ محسوس کر لیتے کہ وہ دنیا میں نہ کسی انسان کے محکوم ھیں نہ محتاج۔ (قرآنی معاشرہ میں کوئی کسی کا محکوم و محتاج نہیں ھوتا)۔ اس سے ان کی ذات کی نشو و نما ھوتی۔

یہ تھا وہ سیدھا سادہ پروگرام جس سے نبی اکرمؐ نے ایک ایسی جماعت پیدا کردی تھی جس کے اعمال صالح، قوانین خداوندی کی رفتار میں اس قدر محیر العقول تیزی پیدا کرنے کا موجب بن گئے تھے اور اس طرح ایک ایسا معاشرہ قائم ھو گیا تھا جس میں اسلام کے درخشندہ و تابناک نتائج چند دنوں میں دنیا کے سامنے آگئے تھے۔

قرن اول کے مسلمانوں میں فرق مدارج

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ھے کہ جتنے لوگ نبی اکرمؐ کی زندگی میں مسلمان ھو گئے تھے (اگرچہ اصطلاح میں ان سب کو صحابہؓ کہتے ھیں) ان سب کو تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے استفادہ کے یکساں مواقع حاصل نہیں ھوئے

تھے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ حجرات میں ان بدوی قبائل (اعراب) کا ذکر ہے جو نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایّام میں، اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ”ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تم یہ کہو کہ ہم (اسلامی مملکت کے) مطیع و فرمانبردار ہو گئے ہیں۔ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا“۔ یہ تو بدوی قبائل کے متعلق تھا۔ خود قریش کے متعلق (جو صلح حدیبیہ یا فتح مکّہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے) فرمایا کہ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا۔ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۷/۱۰) ”تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے (راہِ خدا میں) اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں۔ اور جنہوں نے فتح کے بعد اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں۔ یہ دونوں (گروہ) برابر نہیں ہو سکتے۔ اول الذکر کے درجات، ثانی الذکر کے مقابلہ میں بہت بلند ہیں۔ اگرچہ اسلام کی برکات و حسنات کے سلسلہ میں اللہ کے وعدے دونوں کے ساتھ ہیں“۔ یہ (بلند مدارج کے حامل) وہ حضرات ہیں جنہیں قرآن کریم نے ”مومن حقّاً“ کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ انفال میں ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۷۴) ”اور جو لوگ ایمان لائے۔ انہوں نے ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں ہر قسم کا جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے (ان مہاجرین کو) پناہ دی۔ اور (دین کے استحکام میں ہر قسم کی) مدد کی۔ یہی لوگ ہیں پکے اور سچے مومن۔ ان کے لئے ہر تخریب سے حفاظت کا سامان اور با عزت رزق ہے“۔ جنہوں نے ان کے بعد ہجرت کی اور جہاد کیا، ان کے متعلق کہا گیا کہ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۸/۷۵) ”وہ بھی تم

میں سے ہیں''۔ یہی (اول الذکر) وہ ''السابقون الاولون'' ہیں جنہیں قرآن نے ''محمد رسول اللہ و الذین معہ'' کہہ کر پکارا ($\frac{۴۸}{۲۹}$)۔ اور شجرِ اسلام کی آبیاری میں ان کی خدماتِ جلیلہ کو وجد و مسرت کے عالم میں سراہا ہے ($\frac{۴۸}{۲۹}$)۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا سلیم! کہ بعد کے مسلمانوں کے ایمان و عمل کی قرآن کریم نے تعریف نہیں کی۔ جنہوں نے ان ''السبقون الاولون'' کی حسن کارانہ انداز سے پیروی کی، ان کے متعلق بھی قرآن کریم نے کہا ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ ($\frac{۹}{۱۰۰}$) اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے''۔ جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے اس سے بتانا یہ مقصد ہے کہ اس جماعت میں بعد میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اس انداز سے اسلام نہیں لائے تھے جس انداز سے ''السابقون الاولین'' ایمان لائے تھے۔ نیز بعد میں آنے والوں کو تعلیم نبویؐ سے نسبتاً کم حصہ ملا تھا۔ ''السابقون الاولون'' برسوں کے غور و فکر کے بعد اُس وقت ایمان لائے تھے جب ایمان لانے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر کی مخالفت کا نشانہ بنا لینا اور ہر قسم کی مصیبتوں سے دو چار ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان اسی صورت میں لایا جاسکتا تھا جب انسان انتہائی غور و فکر کے بعد صداقت کو پہچان لے۔ لیکن جب اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی اور مسلمانوں کو ہر طرف غلبہ حاصل ہو رہا تھا اس وقت ایمان لانا، (قرآن کریم کے الفاظ میں) اپنے آپ کو اسلامی مملکت کے سامنے (Surrender) کر دینے کے مرادف تھا۔ یہ تو تھا ان دو گروہوں کے ایمان لانے کے محرکات کا فرق۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم فرق یہ بھی تھا کہ بعد میں مسلمان ہونے والوں کو تعلیم و تربیت نبویؐ سے استفادہ کا بہت کم موقعہ ملا تھا۔

اب اگلی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی اس سوال کو کہ جس پروگرام کے مطابق نبی اکرمؐ نے اس قسم کی جماعتِ مومنین پیدا کر دی تھی، وہ پروگرام آگے کیوں نہ چلا؟ اس سلسلہ میں تم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ صاحب وہ تو رسولؐ کی منفرد شخصیت تھی جس نے اپنی بے مثال ''روحانی قوتوں'' سے اس

ایک غلط فہمی کا ازالہ

قسم کا انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ (رسول کے علاوہ) دوسرے انسانوں کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ اس لئے جب رسول اللہؐ دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، یہ سلیم! بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے دل سے نکالنا نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ خیال دل میں باقی رہے تو اس کا صرف اتنا ہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب اگر ہم لاکھ چاہیں، تو بھی اسلام کو دوبارہ زندہ نہیں کرسکتے۔ اس تصور کا نتیجہ، ناامیدیٔ جاوید ہوتا ہے یعنی اس حالت کو سنوارنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی طرف سے ابدی مایوسی۔ یہ جو ہم میں، ہر صدی کے بعد، خدا کی طرف سے ''مجدد'' کی آمد یا آخری زمانے میں ''ظہورِ مہدی'' کا عقیدہ آگیا ہے، یہ اسی مایوسی کا پیدا کردہ ہے۔ (قرآن کریم میں ختم نبوت کے بعد، کسی آنے والے کا ذکر نہیں)۔ اور یہ جو ہمارے ہاں آئے دن نبوت کے دعوے ہوتے رہتے ہیں، ان کا بنیادی سبب بھی یہی غلط تصور ہے (کہ اسلام کا احیاء نبی کے بغیر ہو نہیں سکتا)۔ لہذا اس غلط تصور کا ذہن سے نکالنا از بس ضروری ہے کہ اسلام نے جو کچھ کرکے دکھایا تھا وہ نبی اکرمؐ کی مافوق الفطرت قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آپؐ کے بعد نہ وہ سلسلہ باقی رہ سکتا تھا، نہ اب اس کا احیاء ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے جو کہلوایا ہے کہ اِنَّمَا آنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ۔۔۔۔ (۱۸/۱۱۰) ''حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے'' تو یہ اسی بنیادی غلط فہمی کے دور کرنے کے لئے ہے۔ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ حضورؐ کی یہ وہ خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسر شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خصوصیت مافوق الفطرت تھی۔ لیکن اس کے بعد اسلام کو ایک عملی نظام کی صورت

جو کچھ رسول اللہؐ نے کیا تھا وہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا

میں متشکل کرنے کے لئے آپؐ نے جو کچھ کیا وہ کسی مافوق الفطرت قوت کی بنا پر نہیں کیا۔ وہ بشری حیثیت سے کیا۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بار بار اعلان کرتا ہے کہ حضورؐ کو قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا)۔ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، خدا کی طرف سے وحی دئیے جانے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن اس وحی کو ایک عملی نظام بنانے کے لئے آپؐ نے جو کچھ بشری حیثیت سے کیا، وہ سلسلہ بدستور آگے چلا۔ خلافت (یعنی آپؐ کی جانشینی) اسی حیثیت سے اور اسی مقصد کے لئے تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے یہ کہہ کر واضح کر دیا تھا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ (۳/۱۴۳) ”محمدؐ بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی رسول ہو گذرے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ تو آپؐ کی ذات تک ہی محدود تھا) اپنی پہلی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہونے والا نہیں۔ اسے آگے چلنا تھا اور (نبی کے بغیر) یہ آگے چل سکتا تھا۔ آپؐ نے جو فرمایا تھا کہ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰی بَصِيْرَةٍ۔ ”میں تمہیں اللہ کی طرف سے علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں“۔ تو اس کے بعد اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ کا اضافہ کیا تھا (۱۲/۱۰۸)۔ یعنی میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۶) ”وہ معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے“۔ اور یہی فریضہ آپؐ کی اُمت کا بھی قرار دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹) ”تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ”تم معروف کا حکم دیتے ہو۔ اور منکر سے روکتے ہو“۔ لہذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ”تلاوت

آیات قرآنی ۔ تعلیم کتاب و حکمت ۔ اور تزکیۂ قلوب و اذہان'' کا جو پروگرام حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا وہ آپؐ کی ذات تک محدود تھا ۔ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا ۔ وہ آگے بڑھا اور شجر اسلام نے جو ثمرات عہد نبویؐ میں دینے شروع کئے تھے ان کا سلسلہ بدستور قائم رہا ۔ لیکن کچھ وقت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں :—

یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا ؟

رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں سلسلۂ دعوت و تبلیغ (پہلے) مکہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہا ، اور اس کے بعد مدینہ اور اس کے گرد و پیش تک ۔ جن حضرات (رضؓ) کی تعلیم و تربیت اس دوران میں ہوئی ، اسلام کے حقائق و تصورات ان کے قلب و دماغ میں پختگی سے مرتسم ہو گئے تھے ۔ بعد میں ، جب پورا عرب مسلمان ہو گیا، تو ان کی حالت وہی تھی جس کی طرف قرآن نے ''اعراب کے مسلمان ہونے'' کے ضمن میں اشارہ کیا ہے ۔ (جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں) ایک تو ان کے مسلمان ہونے کے محرکات اور تھے ۔ یعنی ابتدائی حضرات (رضؓ) ایک مدت تک غور و فکر کے بعد اسلام علٰی وجہ البصیرت قبول کرتے تھے ، لیکن یہ (بعد کے مسلمان) قرآن کریم کے الفاظ میں ، اسلامی مملکت کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے ۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوا تھا ۔ دوسرے یہ کہ بدقسمتی سے انہیں تعلیم و تربیت نبویؐ سے استفادہ کا موقع کم ملا تھا ۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اور یہ ملک کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے ۔ نیز ، اس کے بعد نبی اکرمؐ زیادہ عرصہ تک اس دنیا میں تشریف فرما نہ رہے ۔ حضورؐ کی وفات جلدی ہو گئی ۔

یہ حالت خود نبی اکرمؐ کی حیات مقدسہ کے آخری ایام میں تھی ۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی حدود بہت وسیع ہو گئیں ۔ (ان کے زمانہ میں مملکت اسلامی بائیس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی) ۔ ایران کی پوری مملکت اور روما کا بیشتر حصّہ پرچم اسلامی کے زیر سایہ آگیا تھا ۔ اگر ان علاقوں کے

فتوحات کا سلسلۂ دراز

باشندے مملکت اسلامی سے صرف معاهدات کرتے اور اپنے مذهب پر قائم رهتے، تو صورت حالات اور هوتی۔ لیکن یہ سب مسلمان هو گئے۔ اس سے نقشہ بدل گیا۔ ظاهر هے کہ یہ لوگ بالکل اسی طرح مسلمان هوئے تھے جس طرح (قرآن کریم میں بیان کردہ) ''اعراب،، مسلمان هوئے تھے (بلکہ ان کی حالت آن سے بھی گئی گذری تھی۔ وہ تو پھر بھی برسوں سے اپنے گردو پیش صحیح مسلمانوں کو دیکھ رهے تھے اور اسلامی تصورات کا چرچا سن رهے تھے۔ ان نومسلموں کو یہ بات بھی میسر نہیں هوئی تھی)۔ ان نو مسلموں کی تعداد اس قدر کثیر۔ رقبہ اس قدر وسیع۔ اور آس زمانے میں وسائل رسل و رسائل اس قدر محدود۔ ظاهر هے کہ ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ناممکن نہیں تو بیحد مشکل ضرور تھی، جس انداز سے السابقون الاولون کی تعلیم و تربیت هوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کو اسکا بڑا خیال تھا اور وہ اس کے متعلق بہت کچھ سوچتے تھے۔ یہی وہ مقامات هیں جن کی نزاکت و اهمیت کے پیش نظر قرآن کریم نے (سورۂ النصر) میں یہ کہہ کر تاکید کی هے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً ۔ ''جب خدا کی فتح و نصرت آجائے اور تو دیکھے کہ لوگ خدا کے دین میں فوج درفوج داخل هو رهے هیں،،۔ تو اُس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ مقصد حاصل هو گیا۔ همارا پروگرام ختم هو گیا۔ نہیں! اِس وقت تو اپنے پروگرام پر اور شدت سے عمل کرنے کی ضرورت هوتی هے۔ اس لئے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۔ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّاباً (۱۱۰/۳)۔ (اُس وقت) اپنے نشو و نما دینے والے کی حمدیت کے پروگرام میں اور زیادہ سر گرمی دکھاؤ۔ اس سے حفاظت کا سامان طلب کرو۔ وہ (اپنی رحمت کے ساتھ) تمہاری طرف رجوع کرنے والا هے،،۔ حضرت عمرؓ کو اس کا اس قدر احساس تھا کہ (ابن حزم کی تحقیق کے مطابق) آپ نے قرآن کریم کے کم و بیش ایک لاکھ نسخے مملکت کے طول و عرض میں پھیلا دیئے تھے۔

حضرت عمرؓ کی بے وقت شہادت

اس کے بعد ان کے سامنے تعلیم و تربیت کا مزید پروگرام بھی تھا۔

لیکن (امت اور اسکے ساتھ عالم انسانیت کی) انتہائی بدقسمتی کہ قبل اس کے کہ وہ اپنے پیش نظر پروگرام کو عمل میں لاتے، وہ غیر متوقع طور پر (بے وقت) شہید کر دیئے گئے اور (نو مسلموں کا) یہ پورے کا پورا پزاوہ نا پختہ رہ گیا۔

ظاہر ہے کہ جب اس قدر کثیر آبادی، اس انداز سے ایک نیا دین قبول کرے تو وہ صرف ''مملکت کی فرمانبرداری،، کی حد تک ''نیا دین'' ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے معتقدات، تصورات، نظریات سب وہی رہتے ھیں جو پہلے تھے اور جو صدیوں سے ان میں متوارث چلے آرہے تھے۔ (تم نے سلیم! بابا بھیلو خاں کو دیکھا تھا۔ اس کا خاندان دو پشتوں سے مسلمان تھا لیکن بابا کی حالت یہ تھی کہ جب چھینک آتی، بے ساختہ ''جے نندی،، اس کے منہ سے نکل جاتا۔ میں نے اس سے ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگا کہ میاں! جے نندی جاتی جائے گی۔ الحمد للّٰہ آتی آئے گی—یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پرانی ''جے نندیاں'' تعلیم و تربیت سے جاتی ھیں۔ ایسا نہ ہو تو پھر یہ اعماقِ قلب سے بمشکل نکلتی ھیں۔ معاشرہ کے اثر سے، ان کے لباس میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن یہ جاتی نہیں۔ اور ان کے لباس میں تبدیلی آ جانا اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے)۔

جذبۂ انتقام

یہ تو ان نو مسلم ممالک کے عوام کی حالت تھی۔ جہاں تک ان کے اوپر کے طبقے کا تعلق تھا، بات اور بھی گہری تھی۔ انہوں نے اُن عربوں سے شکست کھائی تھی جنہیں وہ ابھی کل تک وحشی اور جنگلی شمار کیا کرتے تھے۔ اور شکست بھی ایسی جس سے ان کی اس قدر وسیع سلطنت اور ایسی قدیم تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ ہونے کو تو مسلمان (یعنی اسلامی مملکت کے فرمانبردار) ہو گئے لیکن اس شکست اور محکومی کا احساس ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور اپنے حریف عربوں کی شان و شوکت کے منظر سے ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھتی تھی۔ انہوں نے یہ انتقام دو طرح سے لیا۔ ایک تو بساطِ سیاست پر، جہاں انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے اُمتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اور دوسرے، مذہب کے میدان میں۔ وہ اچھی طرح جانتے

تھے کہ جس چیز نے عربوں کو اس قدر قوت اور اقتدار عطا کر دیا ہے وہ اسلام کے حقائق ہیں۔ جب ہرمزان، پابجولان، حضرت عمرؓ کے سامنے آیا اور آپ نے اس سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کل تک تمہاری قوت کا یہ عالم تھا کہ عرب تمہاری سرحدوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اب یہ کیفیت ہے کہ تم کسی میدان میں بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے؟ تو اس نے جو کچھ جواب میں کہا، وہ سلیم! سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا

> کل تک طاقت کا مقابلہ طاقت سے تھا جس میں ہم بہت آگے تھے۔ خدا نہ تمہارے ساتھ تھا نہ ہمارے ساتھ۔ اب جس وقت ہم میں اور تم میں مقابلہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ خدا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ نہیں ہوتا*۔

یہ بات اس نے بڑے پتے کی کہی تھی۔ اہلِ ایران کے اربابِ فکر و نظر کا طبقہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ خدا کے ابدی قوانین ہیں جن کی اتباع سے اس قوم میں اس قدر انقلاب واقع ہوگیا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنا بدلہ لینے کے لئے اسکیم ہی یہ سوچی کہ ان لوگوں کو قوانین خداوندی (کتاب اللہ) سے دور ہٹا دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا یہ کہ تمام غیر اسلامی معتقدات و تصورات کو اسلام کا لبادہ اوڑھا کر مسلمانوں کے معاشرے میں داخل کرتے چلے گئے اور اس طرح، خدا کے ابدی قوانین کی جگہ، انسانوں کے خود ساختہ قوانین و تصورات نے لے لی۔ (اس وقت جو اسلام دنیا میں رائج ہے، اس کا بیشتر حصہ انہی قوانین و تصورات پر مشتمل ہے)۔ اس حقیقت کو مصری مورخ محمد حسین ہیکل نے اپنی

---

*اسے قرآن کریم کی اس آیت کا ترجمہ سمجھئے جس میں کہا گیا ہے کہ ذَالِکَ بِاَنَّ اللہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ وَ اَنَّ الْکَافِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ (۴۷/۱۱) یہ اس لئے ہے کہ اللہ مومنین کا سرپرست اور کارساز ہے اور کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں۔

عجمی سازش

مشہور کتاب—عمر فاروق اعظمؓ—میں عمدہ انداز سے بیان کیا ھے۔ اس نے پہلے ان خیالات کو پیش کیا ھے جو اس موضوع پر تاریخ المورخ (Historian's History of the world) میں درج ھیں۔ اور اس کے بعد اپنی رائے لکھی ھے۔ تاریخ المورخ کا بیان (ھیگل کے الفاظ میں) یہ ھے کہ

> (ایرانیوں کی*) مذھب کی اس تبدیلی کا اثر سیاسی پہلو پر بھی پڑا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ (حضرت) محمدؐ کے چچازاد بھائی اور شرعی وارث** (حضرت) علیؓ عربی کے گرد جمع ھو گئے جنہیں خلافت سے دور رکھا گیا تھا۔ اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدس کا وہ ھالہ قائم کر دیا گیا جو ان کے اسلاف اپنے قومی بادشاھوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ اور پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو ’’آسمان کا بیٹا، مقدس بادشاہ‘‘ کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اسے ’’سید و مرشد‘‘ لکھا جاتا تھا، اسی طرح انہوں نے بھی اپنے اسلام کے زمانے میں (حضرت) علیؓ کو امام کا لقب دیدیا جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اھم معانی کا مالک ھے، اگر اس کے حامل میں دنیوی اقتدار اور عقلی برتری جمع ھو جائیں۔

---

* ان نو مسلموں میں یہودی۔ عیسائی اور ایران کے مجوسی سب ھی شامل تھے لیکن چونکہ ان میں ایرانیوں کی بہت زیادہ کثرت تھی اور انہی نے سب سے زیادہ اسلام کو متاثر کیا، اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ھے۔ لیکن جب ھم ’’عجمی اسلام‘‘ کہتے ھیں تو اس سے مراد ھر غیر قرآنی نظریہ ھوتا ھے خواہ وہ کہیں سے آیا ھو۔

** خلافت میں وراثت کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا۔ (طلوع اسلام)

> جب (حضرت) علی رضؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت) حسن رضؓ اور (حضرت) حسین رضؓ کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے۔ کہا جاتا ہے کہ (حضرت) حسین رضؓ نے اکاسرۂ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج کے بعد امامت، مقدس حق سے رشتہ بدامن ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں (حضرت) حسین رضؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔
>
> وہ بغاوت جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر رسول اللہؐ کے قرابت داروں، بنو عباس، کو تخت پر بٹھایا، ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی۔ جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصولِ امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جسے تاج پہنانے کی راہ میں انہوں نے اپنی تمام کوششیں صرف کر دی تھیں۔
>
> (ہیکل اردو ترجمہ صفحہ ۳۱۹-۲۰)

اس اقتباس کے بعد، ہیکل لکھتا ہے۔

> یہ واقعات جو تاریخ المورخ میں لکھے ہیں اور جن کا ذکر تمام مورخین نے کیا ہے، عہدِ فاروقی کے بعد پیش آئے۔ یہاں ہم نے ان کا ذکر، پڑھنے والوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرنے کے لئے، کیا ہے کہ ایرانیوں کے دل شروع ہی سے عربی حکومت پر مطمئن نہیں تھے، بلکہ وہ اس سے اِباء کرتے تھے۔ اول اول انہوں نے اسکے خلاف اعلانیہ بغاوت کرنی بھی چاہی لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو دوسرے ذرائع سے اقتدار حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے اور عام زندگی کے تمام میدانوں میں انہیں اقتدار کا

> بہت بڑا حصه بھی مل گیا ۔ مسلمانوں کے ایران فتح کرنے سے ایرانی اس قدر نشتر به دل تھے که ان کے چند آدمی حضرت عمرؓ کی جان کے دشمن ہوگئے ۔ یہاں تک که کہا جاتا ھے که حضرت عمرؓ کی شہادت جو فتح خراسان کے کچھ ھی دن بعد ہوئی ، ایرانی سازش ھی کا نتیجه تھی۔ (ایضاً صفحه ۴۲)

تم جانتے ہو سلیم! که میں نه شیعه ہوں نه سنّی ۔ اس لئے مجھے مسلمانوں کے کسی فرقے کے مخصوص معتقدات سے کوئی تعلق نہیں — میں ھر اس عقیده اور تصور کو غلط سمجھتا ہوں جو قرآن کے خلاف ھو — اس لئے مسئله زیر نظر کو بھی میری نگاہ فرقه دارانه عینک سے نہیں دیکھتی ۔ میں جو کچھ کہنا چاھتا ہوں وہ یه ھے که ان مفتوحه علاقوں کے نو مسلموں نے اپنے معتقدات کو اسلام کا رنگ دے کر مسلمانوں کے معاشرے میں پھیلا دیا اور آہسته آہسته انہیں اس ”خدا“ (یعنی کتابِ خدا) سے بیگانه بنا دیا جو غیر مسلموں کے مقابله میں مسلمانوں کے غلبه کا باعث تھا ۔ اس طرح انھوں نے فولادی شمشیروں کا بدله ذهنی شمشیروں کے ذریعه لے لیا ۔ ان کی اس سازش کو اس (بد قسمت) واقعه سے اور تقویت مل گئی که عباسیوں نے سلطنت ھی ایرانیوں کے بل بوتے پر حاصل کی تھی جس سے ان کا اقتدار معاشرے کے ہر گوشے پر چھا گیا تھا ۔ اور چونکه یه پڑھے لکھے لوگ تھے اس لئے ان کا وضع کردہ ”جدید اسلام“ کتابی شکل میں بھی عام ہوگیا ۔ ہمارے ہاں جو کچھ دین کے نام سے پڑھایا جاتا ھے وہ بیشتر انہی کتابوں پر مشتمل ھوتا ھے ۔ حقیقت یه ھے که اس حادثه کے بعد ہماری تاریخ (سیاست اور مذھب کے دونوں میدانوں میں) انہی عجمی ریشه دوانیوں کی متنوع داستان ھے ۔

یه تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صحیح اسلام سے متعلق تعلیم و تربیت کا وہ سلسله، جسے نبی اکرمؐ نے شروع کیا اور جو خلافت کے اولین ایام تک جاری رہا، آگے چل کر رک گیا — اور نه صرف یه که وہ سلسله رک گیا بلکه اس کی جگه ایک نئے ”اسلام“ نے لے لی — اس ضمن میں بعض لوگ کہا کرتے ھیں که اگر حضرت ابوبکرؓ

یہ فتوحات نہ ہی ہوتیں ۔ تو اچھا تھا؟

اور عمرؓ کے زمانہ میں یہ لڑائیاں نہ لڑی جاتیں تو اسلام اس مصیبت سے بچ جاتا جو ان نو مسلموں کے ھاتھوں اس پر وارد ھوئی لیکن وہ اس رائے کے اظہار کے وقت ایک اھم حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ھیں ۔ یہ لڑائیاں، جوع الارض (ھوسِ ملک گیری) کی تسکین کے لئے نہیں لڑی گئی تھیں ۔ میں اپنے موضوع سے دور ھٹ جاونگا ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ان لڑائیوں کے محرکات و اسباب کیا تھے ۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ

(۱) اسلام ایک نظامِ زندگی ھے جو صرف، ایک آزاد اسلامی مملکت میں عملی شکل میں سامنے آ سکتا ھے ۔ یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لئے نبی اکرم ؐ نے ایک مملکت کی تشکیل کی اور اس مملکت کا تحفظ، حضور کے جانشینوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا ۔

(۲) ایران اور روم کی مملکتیں، اِس جدید اسلامی مملکت کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی تھیں ۔ یہ مملکت ان کی نگاھوں میں حریفِ تازہ تھی اور وہ لوگ اس کے استحکام میں اپنے لئے سخت خطرہ محسوس کرتے تھے ۔ ان کی دلی خواھش تھی کہ وہ اس مملکت کو صفحہ ھستی سے مٹا ڈالیں ۔ اگر خلافت کے اس دور میں، ان مملکتوں کے مشؤم عزائم کی روک تھام نہ کی جاتی تو اسلامی مملکت کا وجود باقی نہ رھتا ۔ اس مقصد کے لئے جیوش اسلامیہ کا آگے بڑھنا ناگزیر تھا ۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ھے، اگر یہ ممالک صرف معاھدات کر لیتے تو بھی صورت مختلف ھوتی ۔ لیکن وھاں کے باشندے (شبا شب) مسلمان ھوگئے اور اس سے وہ خرابیاں پیدا ھو گئیں جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ھے ۔ اس پر انتہائی بد قسمتی یہ کہ حضرت عمرؓ بے وقت شہید کر دئیے گئے ۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رھتے اور ان ممالک میں اسلام مستحکم طور پر رائج ھو جاتا تو پھر اس قدر خطرات پیدا نہ ھوتے ۔

(۳) اس مقام پر اتنا اضافہ ضروری ھے کہ اسلامی مملکت میں صرف دفاعی جنگ کی شکل ھی پیدا نہیں ھوتی ۔ جنگ کی ایک ضرورت اور بھی لاحق ھو جاتی ھے ۔ مثلاً اگر کسی دوسری مملکت کے علاقہ میں (غیر مسلم) انسانوں پر سخت مظالم ھو رھے ھوں اور ان بیچاروں کا کوئی پرسانِ حال نہ ھو، تو اسلامی مملکت کے لئے ضروری ھو جاتا ھے کہ وہ ان مظلوموں کی مدافعت کے لئے ھر ممکن کوشش کرے ۔ جس کی آخری (اور بعض حالات میں ناگزیر) صورت، جنگ ھوتی ھے ۔ (یہ وھی مقصد ھے جس کے لئے اب تجویز ھو رھا ھے کہ اقوامِ متحدہ (U. N. O) کے پاس اپنی فوجیں ھونی چاھئیں تاکہ وہ انہیں عندالضرورت ان علاقوں میں بھیج سکے جہاں قانون شکنی ھو رھی ھو اور اس کی روک تھام کی کوئی اور صورت باقی نہ رھے) ۔ یہ بھی ایک مقصد تھا جس کے لئے خلافت کو اپنی فوجیں بعض مقامات کیطرف بھیجنی پڑیں ۔

ان حالات کے پیش نظر، سلیم! تم اس سے متفق ھو گے کہ جو لوگ یہ کہتے ھیں کہ خلافت کو یہ لڑائیاں نہیں لڑنی چاھیئے تھیں، وہ حقیقت سے کس قدر بےخبر ھیں ۔

انسانی ذھن نے اسلامی حقائق کو اپنایا کیوں نہ ؟

اب تم تیسری شق کو لو ۔ یعنی اس سوال کو کہ اگر تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جاری نہ بھی رہ سکا تھا، تو بھی عام ذھنِ انسانی نے اسلام کے ان حقائق کو، جو اس طرح بے نقاب ھو کر اس کے سامنے آ چکے تھے، خود بخود کیوں نہ اپنا لیا؟ اس نے خود ساختہ قوانین کو ان پر کیوں ترجیح دی؟ اس سوال کے متعلق ضمناً پہلے بھی لکھا جا چکا ھے ۔ یعنی جب ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے چلتے ھیں تو ذھنِ انسانی ان سے رفتہ رفتہ مانوس ھوتا رھتا ھے ۔ لیکن جب وہ انقلابی طور پر نمودار ھوتے ھیں تو اپنے زمانہ کی سطح سے بہت اونچے ھوتے ھیں ۔ اس لئے عام انسانی ذھن ان کا خوگر نہیں ھوتا جب تک خاص تعلیم و تربیت سے اُسے ان کے لئے تیار نہ کیا جائے ۔ اسی حقیقت کو

دوسرے الفاظ میں یوں کہا کرتے ہیں کہ انقلابی آواز قبل از وقت ہوتی ہے۔ ”انقلابی آواز،، کے معنی ہوتے ہیں خدا کے کسی ابدی قانون کو انسانی رفتار سے سامنے لانے کی دعوت۔ اور ”قبل از وقت،، سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں وہ آواز اٹھتی ہے، اُس زمانے تک کا انسانی ذہن اُس قانون سے مانوس نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے کا انسانی ذہن اس قانون سے مانوس ہوچکا ہوتو وہ آواز انقلابی نہیں ہوتی۔ اسے اسی فضا کی پیداوار کہا جائیگا۔ یہی وجہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ انقلابی آواز کے لئے اس کا دور سازگار نہیں ہوتا۔ ”سازگار نہیں ہوتا،، سے مراد یہ ہے کہ اس دور کے انسان اسے اچھی طرح (Appreciate) نہیں کر سکتے۔ ان کی فکری سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ اس غیر معمولی آواز سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرسکیں۔ وہ آواز ان کے لئے بڑی غیر مانوس ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ تم رسول کی دعوت کو تو چھوڑو، کہ وہ اپنے دور سے صدیوں آگے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں تو عام نابغہ (Genius) کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ہاتھوں اپنی قدر ناشناسی کا رونا روتے مرجاتا ہے۔ تم اپنے محبوب (شاعر) غالب کو دیکھو۔ وہ کس طرح اپنے زمانے کی پستیٔ سطح کا شکوہ سنج ہے! کہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ—مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست— کہیں اپنی اس دشواری کا گلہ خواں ہے کہ— گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل—لیکن چونکہ اپنے مقام اور اپنے دور کی سطح سے خوب واقف ہے اس لئے نہایت حتم و یقین اور خود اعتمادی سے یہ کہہ کر اپنے دور سے آگے نکل جاتا ہے کہ

زمانہ کی شکوہ سنجی

قدرِ شعر من بہ گیتی بعدِ من خواھد شدن
ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواھد شدن

یہی کچھ اقبال کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی اپنے آپ کو ”گلِ نخستیں“۔ ”آدمِ اول“ اور ”شاعرِ فردا“ کہتا ہوا چلا گیا۔ اور اپنی آواز کے قبل از وقت ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کر گیا کہ

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک
هماں گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چه گفت و با که گفت واز کجا بود

اور غالب ھی کی طرح یہ ''پیشگوئی'' کر گیا کہ

پس ازمن شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند
جهانے را دِگرگوں کرد یک مردِ خود آگاهے

اور ، ایک غالب اور اقبال ھی پر کیا موقوف ھے ۔ یہ جو تمہیں آج مختلف ممالک کی تاریخ میں آسمانِ فکر و نظر کے درخشندہ ستارے نظر آ رھے ھیں ، ان سب کے ساتھ ان کے زمانے نے یہی کچھ کیا تھا ۔ وہ اپنے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے تک کے محتاج رھے ۔ محتاج ھی نہیں رھے بلکہ ان کی زندگی اکثر قید و بند میں گذری اور مصائب وآلام کا شکار رھی ۔ وہ گمنامی کی زندگی جئے یا بدنامی کی موت مرے ۔ لیکن مرنے کے بعد ، آنے والے زمانے نے ان چیتھڑوں ۔ گدڑیوں تک کو ڈھونڈ نکالا جن میں انہوں نے زندگی کے دن کاٹے تھے اور انہیں اپنے عجائب گھروں کی یادگار اور پرستش گاھوں کی زینت بنایا ۔ ان کا ایک ایک لفظ سونے کے حروف میں لکھا اور جواھرات کے ترازوؤں میں تولا گیا ۔

قرآنی انقلاب کی بلند سطح

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! ذرا اس زمانے کی علمی ، ذھنی ، فکری ، معاشی ، معاشرتی ، تمدنی ، سیاسی اور عمرانی سطح پر غور کرو جس میں قرآن کریم آیا ۔ اور اس کے بعد اس انقلاب آفریں پیغام کو دیکھو جو قرآن کریم لایا ۔ تمہیں خود معلوم ھو جائے گا کہ وہ پیغام اس زمانے کی سطح سے کس قدر اونچا اور اُس دور سے کتنا آگے تھا ۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں دنیا کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے مفکرین سے لے کر عام انسانوں تک ، مندروں اور قربانگاھوں ، معبدوں اور خانقاھوں کی پُراسرار اعجوبہ پرستیوں کے شکار اور راھبوں ، پجاریوں ، منتریوں اور کاھنوں کے دامِ

تزویر کے اسیر تھے اور انھیں کارو بارِ خداوندی کے براہ راست کار پرداز تصور کرتے تھے۔ اُس زمانے میں یہ آواز، کہ انسان اور بندے کے درمیان کوئی تیسری طاقت حائل نہیں، کس قدر زمانے کی سطح سے اونچی تھی؟

جس زمانے میں ساری دنیا کا معمول یہ تھا کہ راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور شاہنشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتی اور ان کی اسی نہج پر پرستش کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ پکار کہ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اور یہ کہ انسانوں کو اپنے معاملات باھمی مشاورت سے طے کرنے چاھئیں، اُس دور کے کان کے لئے کس قدر ناآشنا اور اُس زمانے کے قلب کے لئے کتنی نامانوس تھی۔

جس زمانے میں عزت کا معیار نسلی تفوق، شرف و مجد کا معیار خاندانی اور قبائلی نسبتیں، اور قیادت و سیادت کا مدار حسب و نسب پر سمجھا اور مانا جاتا ہو اور ان امتیازات کے استحکام و بقا کے لئے ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور ایسا کرنے میں ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر ملک اور ہر قوم انتہائی فخر محسوس کرے، اُس زمانے میں یہ پیغام کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا ھے اور عزت و تکریم کا معیار اس کے ذاتی جوھر ھیں، نہ کہ آبائی نسبتیں، کس قدر اجنبی اور ''غیر فطری'' تھا!

جس دور میں انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چاردیواریوں اور قوموں کی حدبندیوں کی رُو سے ھوتی تھی اور وطن اور قوم کی خاطر جان دینا زندگی کا مقدس ترین فرض سمجھا جاتا تھا۔ اُس دور میں یہ دعوت کہ انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل، وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک سے نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی رُو سے ھوتی ھے، کس قدر ناقابل فہم اور ''ماورائے سرحد ادراک'' تھی!

جس زمانے میں حالت یہ تھی کہ انسان نے، فطرت کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر تغیر کے لئے ایک ایک الگ ''خدا'' تجویز کر رکھا تھا، جس کی

خوشنودی اور ناراضگی ہر خوش آئند یا الم انگیز واقعہ کا موجب بنتی تھی۔ اس زمانے کے انسان سے یہ کہنا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں ہر معلول (Effect) کے لئے ایک علت (Cause) اور ہر سبب کے لئے ایک مسبب ہے اور یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قاعدے کے مطابق ہوتا ہے، جس میں کبھی کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی، کتنا بڑا محیر العقول تصور اور کیسا ناقابلِ تسلیم دعوےٰ تھا۔

جس زمانے میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ، اپنے آپ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ موہوم قوتوں کے سامنے بے دست و پا سمجھکر، اپنے آپ کو قدم قدم پر مجبور و مقہور پاتا تھا، اس زمانے میں انسان سے یہ کہنا کہ ان موہوم قوتوں کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی تمام موجود قوتیں اس کے لئے تابع فرمان کردی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا کام لے۔ یہ ایک ایسی آواز تھی جس پر کوئی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

جس زمانے میں انسان کی علمی سطح کا یہ عالم تھا کہ گاؤں میں جو شخص دس سے اوپر گنتی جانتا اسے مافوق البشر تصور کیا جاتا، اس زمانے میں، اور تو اور، خود پیغمبر کے متعلق یہ اعلان کہ وہ تمہارے ہی جیسا انسان ہے، انسان کے ذہن میں سمانے والی بات ہی نہیں ہوسکتی تھی۔

جس زمانے میں یہ ایک مسلمہ تھا کہ مقدس بزرگ وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی شعبدہ سرزد ہو، اس زمانے میں یہ کہنا کہ ہم نے پیغمبر تک کو بھی کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا اور کسی دعوےٰ کے جھوٹے اور سچے ہونے کا معیار یہ ہے کہ علم و بصیرت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں اور اس کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، ایک ایسی بات تھی جسے ''عقل'' تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی۔ پیغمبر—اور معجزہ ہی کوئی نہیں! مذہب کی باتیں اور ان کا مدار عقل وبصیرت پر!! شریعت کی رسومات اور ان کی پرکھ، نتائج کی رو سے!!! اسے اگر وہ بوالعجبی قرار نہ دیتے تو اور کیا کہتے؟

جس زمانے میں مزدور (Labourer) تو ایک طرف، غلام (Slave) تک کو فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ قرار دیا جاتا ھو۔ اس زمانے میں یہ آواز اٹھانا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کا مالک بن بیٹھے ''پاگل پن'' کی بات نہیں تو اور کیا قرار پاتی ؟

اور جس زمانے میں قارون کی سی دولت کو خدا کا فضل قرار دیا جاتا ھو۔ زمینداری اور جاگیرداری کو فطرت کا عطیہ ٹھہرایا جاتا ھو اور ذاتی املاک و مقبوضات پر کسی قسم کی حد بندی خلاف قانون و شریعت قرار پاتی ھو۔ اس زمانے میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ دولت جمع کرنا بدترین جرم ھے۔ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ھو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہیئں۔ ھر فرد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما، معاشرہ کا بنیادی فریضہ ھے۔ کس قدر تحیر انگیز آواز ھوگی۔

ذرا غور کرو سلیم! کہ چھٹی صدی عیسوی میں اس قسم کے تصوراتِ حیات اور اس انداز کے نظریات زندگی، اُس وقت کے ذھن انسانی کے لئے، کس قدر نامانوس تھے۔ یہ وہ انقلاب آفرین تصورات تھے جنہیں اپنانے کے لئے زمانہ ابھی تیار نہیں تھا۔ دنیا ان سے ابھی بہت پیچھے تھی۔ وہ تو خیر پھر بھی چھٹی صدی عیسوی تھی جسے ازمنہ مظلمہ (Dark Ages) کہتے ھیں۔ قرآن کے انقلابی تصورات کا تو یہ عالم ھے کہ خود ھمارا زمانہ، یہ بیسویں صدی جسے تہذیب و تمدن اور علم و عقل کا بلند ترین مظہر سمجھا جاتا ھے، یہ بھی اس کے کئی ایک تصورات سے ھنوز بہت پیچھے ھے۔ ان تصورات کی سطح اتنی بلند ھے کہ ابھی زمانہ کو نہ معلوم ان تک پہنچنے کے لئے کتنی منزلیں اور طے کرنی پڑیں۔ ان حالات میں تعجب انگیز بات یہ نہیں کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام (تمہارے خیال کے مطابق) زیادہ عرصہ تک چلا کیوں نہیں۔ تعجب انگیز بات تو یہ ھے کہ اس زمانے میں اتنے لوگ کس طرح پیدا ھو گئے جنہوں نے اپنے زمانے کی سطح سے اتنے

بلند اور نامانوس تصورات کو اپنا لیا اور انہیں عملاً متشکل کر دیا۔

حیرت انگیز انقلاب

سلیم ! جب میں اس مسئلہ کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ھوں تو اس ذات اقدس واعظم ؐ کی تحیر انگیز تعلیم و تربیت کے حسن تصور سے میری روح وجد میں آجاتی ھے جس نے اس دور میں ایسے افراد تیار کر لئے جنہوں نے اس قسم کے نظام کو اپنا کر دکھایا۔ میرے نزدیک حضور ؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی ھے کہ، جن حالات میں دنیا کا ھر نابغہ (Genius) اپنے زمانہ کی قدر ناشناسی کا رونا رو کر اور اپنے آپ کو "آنے والے زمانے کا انسان" کہہ کر چلا جائے، حضور ؐ ان حالات میں یہ کہیں کہ خیرالقرون قرنی۔ سب سے بہتر میرا زمانہ ھے جس میں اس قسم کا انقلاب آفریں نظام، جو زمانہ کی سطح سے منزلوں اونچا ھے، اس حسن و خوبی سے متشکل ھو کر سامنے آ گیا ھے۔ اگر تم سلیم، ! اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھو تو حضور نبی اکرم ؐ، تمام دنیا کے انقلابی قائدین میں سب سے آگے اور سب سے اونچے نظر آئیں گے۔ ذرا سوچو ! کہ ان تصورات کو جن تک زمانہ تیرہ سو سال میں بھی کماحقہٗ نہیں پہنچ سکا، نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ذھن نشین کرانا بلکہ انہیں ان کے ھاتھوں سے عملاً متشکل کرا دینا، اعجاز نہیں تو اور کیا ھے ؟ کتاب و حکمت کی ایسی حقیقت کشا اور محیرالعقول تعلیم اور انسانی صلاحیتوں کا اس قدر ناقابل تصور تزکیہ (نشوونما) اسی قسم کے معلم و مربی کے ھاتھوں عمل میں آسکتا تھا۔ یہی تھا حضور ؐ کا وہ عدیم النظیر کارنامہ جس پر خدا اور کائنات کی تمام تعمیری قوتیں، غلغلہ ھائے تبریک و تحسین بلند کرتی تھیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (۳۳/۵۶)۔

محیر العقول معاشرہ

اور حضور ؐ کے ساتھ اس جماعتِ مومنین کے لئے بھی، جو ساری دنیا سے الگ ھٹ کر، اور اپنے زمانے کی سطح سے منزلوں بلند ھو کر، اس قسم کے ناممکن التصوّر نظام کو عملاً متشکل کر رھے تھے (ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ (۳۳/۴۳)۔ سوچو سلیم ! اُس زمانے میں (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ھے)

قریش کے مرکز مکہ کے اندراس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور عجم (ـارس) کا ایک ”عامی،، (سلمانؓ) روم کا ایک مزدور (صہیبؓ) اور حبش کا ایک غلام (بلالؓ) نہ صرف ایک ہی دسترخوان پر بیٹھکر کھاتے تھے بلکہ باہمی رشتے ناطے بھی کرتے تھے، کس قدر محیرالعقول تھا۔ پھر اس معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا کر دینا کہ اور تو اور خود رسول اللہؐ جب کسی غلام اور لونڈی سے بھی کوئی بات کہتے تو وہ بغیر کسی جھجک کے پوچھ لیتے کہ حضورؐ آپ ایسا وحی کی رو سے فرماتے ہیں یا یہ آپ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپ فرماتے کہ یہ میا ذاتی مشورہ ہے تو وہ نہایت آزادی سے کہدیتے کہ معاف فرمائیے! اس باب میر میرا فیصلہ کچھ اور ہے اس لئے میں اس مشورہ کو نہیں مان سکتا۔ کتنا بڑا تھا ہ انقلاب جو ذہنیتوں میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ امور مملکت میں ایسا نقشہ پیدا کر دینا کہ اگر کسی دوسرے کی رائے زیادہ بہتر ہے تو امیر مملکت (نبی اکرمؐ) اسے خود اپنی رائے پر ترجیح دیتے اور بڑے سے بڑے اہم معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے، کتنی بڑی تبدیلی کا آئینہ دار تھا۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو بسول اللہؐ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ کا پورے مجمع سے یہ کہا کہ جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا، وہ سمجھ لے کہ اس کا خدا مر گیا ہے۔ لیکن جو خدائے حی و قیوم کا پرستار ہے اسے معلوم ہونا چاہئیے کہ س کا خدا زندہ و پائندہ ہے۔ محمدؐ خدا کے ایک رسول تھے۔ وہ اپنا وقت پورا کرکے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ اس سے اس نظام پر کچھ اثر نہیں پڑتا جسے حضورؐ نے قائم کیا تھا۔ سوچو سلیم! کہ یہ آواز اس زمانے میں کتنی قبل از وقت تھی۔ پھر حضورؐ کی وفات پر، لوگوں کا جمع ہو کر اپنے میں سے ایک امیر چن لینا اور بلالحاظ قرابت و وراثت سب کا اسے امیر تسلیم کرنا اس دور کے ذہن انسانی کے لئے کس قدر نامانوس واقعہ تھا! اور خود رسول اللہؐ کا یہ اعلان کہ میرے گھر میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں۔ اور جو اشیائے مستعملہ میں چھوڑ رہا ہوں، اس کا کوئی وارث نہیں۔ وہ تمام امت کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اس زمانے کے لئے کس قدر تحیر انگیز تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا

بہ حیثیت امیرالمومنین ، صرف اتنا کفاف (روزینہ) لینا جتنی ایک مزدور کی اُجرت ھوتی ھے ، اور اپنی وفات کے وقت اس رقم کو بھی بیت المال میں یہ کہہ کر واپس داخل کر دینا کہ معلوم نہیں میں اس رقم کے برابر کام بھی کر سکا ھوں یا نہیں ، اس زمانہ کی سطح سے کس قدر اونچا فیصلہ تھا ؟ حضرت عمرؓ کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ قیصر کی بیوی نے (تمہارے عطر کے تحفہ کے بدلہ میں) جو جواھرات بھیجے ھیں وہ بہ حیثیت امیرالمومنین کی بیوی کے بھیجے ھیں نہ کہ تمہاری ذاتی حیثیت سے ، اس لئے انھیں بیت المال میں داخل کرانا چاھئیے ، اس زمانے کی فضا میں کس قدر تعجب انگیز سی بات تھی ! اور ان کا یہ فیصلہ کہ مفتوحہ زمینیں سپاھیوں میں تقسیم نہیں ھونی چاھئیں بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رھنی چاھئیں ۔ تاکہ اس سے موجودہ اور آنے والی نسلیں یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں ۔ اس دور کے لوگوں کے لئے کس قدر حیرت افروز تھا ! پھر وادیٔ شام کی اس بڑھیا کا یہ کہنا کہ اگر خلیفتہ المسلمین ، امت کے تمام افراد کے حالات سے باخبر رھنے اور ان کی ضروریات کو ازخود پورا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خلافت کو چھوڑ کر الگ ھو جانا چاھیئے ، کیونکہ وہ اس کا اھل نہیں ، اس زمانے کے لئے کس قدر ناقابلِ تصور تھا ۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ میں گیہوں کی روٹی اس وقت کھاؤں گا جب مجھے یقین ھو جائے گا کہ مملکت کے ھر فرد کو گیہوں کی روٹی میسر آرھی ھے ورنہ میں جو کی روٹی ہی کھاؤں گا ، اس زمانے کے آسمان کی آنکھ کے لئے کیسا تحیر انگیز تھا ؟ سوچو سلیم ! کہ اس زمانے میں اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں اس قسم کے فیصلے بہ تکلف نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کا عام معمول بن کر ازخود سامنے آنے جائیں ، کس قدر قبل از وقت تھا ؟ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ھوں) ذھن انسانی تو تیرہ صدیاں آگے بڑھنے پر بھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ وہ ان تصورات کو اپنا کر زندگی کا معمول بنا لے ۔ لہذا اس زمانے میں اس قسم کا نقشہ پیدا کر دینا کتنی بڑی کامیابی تھی ۔

ذہن انسانی کو بلند کیا جا سکتا ہے

اس مقام پر اس غلط فہمی کا رفع کر لینا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کہا ہے کہ انقلابی دعوت اس زمانے کے عام ذہن انسانی سے بہت اونچی سطح پر ہوتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دور کا انسانی ذہن اس دعوت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ دعوت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں) اس کے لئے خاص جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے، اور انسانی ذہن بڑا سہل انگار واقع ہوا ہے۔ یہ محنت اور کاوش سے جی چراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقلید کی روش (جس میں انسان کو کچھ سوچنا ہی نہیں پڑتا، بلکہ اس میں سوچنا حرام سمجھا جاتا ہے) بڑی آسانی سے، خود بخود آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محنت اور کاوش سے ہر دور کے انسانی ذہن کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔ اسلام کے قرن اول کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔

ہنگامی انقلاب سے فائدہ کیا؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس قسم کے ہنگامی انقلابات سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر خاص جدوجہد اور کد و کاوش سے کچھ وقت کے لئے ابدی قوانین کی رفتار تیز کر کے ان کے نتائج غیر معمولی طور پر نمودار کر لئے جائیں اور اس کے بعد، انسانی ذہن اور اس کا معاشرہ پھر اسی سطح پر چلا جائے، تو عالمِ انسانیت کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ متعین شکل میں اس سوال کا مطلب یہ ہوگا کہ قرنِ اول کے اسلام نے دنیائے انسانیت کو کیا دیا؟۔

اس نے دنیائے انسانیت کو بہت کچھ دیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ خدا کے ابدی قوانین و حقائق ایک مدون کتابی شکل (قرآن کریم) میں دنیا کے سامنے آگئے کہ جس کا جی چاہے انہیں عملی پیکر میں لا کر ان کے خوشگوار نتائج حاصل کر لے۔

دوسرے یہ کہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ قوانین ایسے ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ محض ”شاعر کا خواب“ (Utopia) نہیں، ایک

ممکن العمل (Practicable) ضابطہء حیات ھے جس پر تاریخ کے ایک دور میں عمل کیا گیا تھا ۔ اور اس کے نتائج سامنے آ گئے تھے۔ حقیقت یہ ھے کہ اس قسم کے انقلابی دور زمانے کی امامت کرتے ھیں ۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ھے ، عقل کا طریق کار تجرباتی ھے ۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ھے ۔ اس پر عمل کرتی ھے ۔ صدیوں کے تجربہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ھے کہ وہ نظریہ غلط تھا اس لئے تجربہ ناکام رھا ۔ اس کے بعد ، عقل کسی دوسرے نظریہ پر تجربہ شروع کر دیتی ھے ۔ لیکن اگر کسی انقلابی دور کے نتائج اس کے سامنے ھوں تو اسے اپنے تجربہ کے متعلق صحیح نتیجہ تک پہنچ جانے کے لئے زیادہ وقت درکار نہیں ھوتا ۔

اسلام نے دنیا کو کیا دیا ؟

تم سلیم ، زمانہ قبل از اسلام کی انسانی تاریخ ، اور زمانہ بعد از اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالو اور پھر دیکھو کہ دنیا نے جس تیزی سے زمانہ بعد از اسلام میں ترقی کی ھے ، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی ۔ اور یہ بھی اس صورت میں ھوا ھے جب کہ اسلام کے قرنِ اول کی صحیح اور خالص تاریخ دنیا کے سامنے نہیں ۔ اگر اُس دور کی غیر مخلوط تاریخ دنیا کے سامنے ھوتی تو تم دیکھتے کہ آج دنیا کا نقشہ کیا ھوتا؟ یوں سمجھو کہ اس قسم کا انقلابی دور، زمانے کی گاڑی کو ایسا دھکا (Push) دیدیتا ھے جس سے اسکی رفتار میں خاصی تیزی آ جاتی ھے اور کتنا ھی فاصلہ وہ محض اپنے زورِ دروں (Momentum) سے طے کرتی چلی جاتی ھے ۔ یہ اُسی زور دروں کا اثر تھا کہ ، اگرچہ صحیح اسلامی معاشرہ کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رھا ، لیکن مسلمان (اس کے بعد بھی) صدیوں تک دنیائے علم وفن میں اقوامِ عالم کی امامت کرتے رھے ۔ یہ وہ حقیقت ھے جس کا اعتراف ، مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور مؤرخین تک نے کیا ھے ۔

یورپ کو مہذب اسلام نے بنایا

مثلاً برفا (Briffault) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب (The Making of Humanity) میں ایک خاص باب اس موضوع کے لئے وقف کیا ھے ۔ اور اس کا نام ھی اس نے ”دارالحکمت“ رکھا ھے ۔ وہ اس میں لکھتا ھے کہ

> یورپ کو حیات نو پندرھویں صدی میں نہیں ملی - یہ اسے عرب اور اندلسی مسلمانوں کے کلچر کے اثرات سے ملی - یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا گہوارہ، اٹلی نہیں بلکہ ھسپانیہ تھا - جب یورپ آہستہ آہستہ، وحشت اور بربریت کے انتہائی پست نقطہ تک پہنچ چکا تھا تو اس وقت بغداد، قاھرہ، ٹالیدو، نئی تہذیب اور تازہ افکار کے مراکز بن رہے تھے - یہی وہ مراکز تھے جن سے دنیا کو نئی زندگی عطا ھوئی - جس نے ارتقائے انسانیت کی ایک جدید منزل بننا تھا - جب مسلمانوں کی نئی ثقافت محسوس شکل میں سامنے آئی تو دنیا میں حیات تازہ کی نمود شروع ھوئی . . . . . اگر عرب نہ ھوتے تو یورپ کو کبھی تہذیب کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا - (صفحہ ۱۸۹-۹۰)

یہ ہے جو کچھ دنیا کو اسلام کے انقلابی دَور کے دھکے سے ملا -

اِس کا ثبوت کہ اسلام آگے چل رہا ہے

اب چوتھی شق کو سامنے لاؤ - یعنی یہ سوال کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اسلام کے ابدی حقائق اپنی معمولی رفتار سے آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں - کسی جگہ رک کر کھڑے نہیں ہوگئے - اس کے لئے سلیم! پہلے اُس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا جب قرآن نازل ہوا - اور اس کے بعد، اِس تیرہ سو سال میں انسانی تاریخ کا مطالعہ - اس سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ اس تیرہ سو سال میں انسان، مختلف تجارب کے بعد، اُن تصورات کو اختیار کرتا چلا آرہا ہے جو قرآن نے دیئے تھے، یا اُن تصورات کی طرف جارہا ہے جو قرآن سے پہلے دنیا میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے -

دنیا کے فیصلے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت عین ''فطرت انسانی'' کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے - قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور یہ تصور دیا کہ انسانوں

کو اپنے معاملات باھمی مشاورت سے طے کرنے چاھئیں ۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے ۔ اُس وقت ذھن کے لئے یہ تصور نامانوس تھا ۔ تم بتاؤ کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال میں، ذھن انسانی کا رُخ ملوکیت کی سمت رھا ھے یا وہ آھستہ آھستہ ''اسلام قبول کرتا'' چلا گیا ھے اور قبول کرتا چلا جا رھا ھے؟

انسانی ذھن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزوِ لاینفک ھے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ ۔ اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جاسکتا ۔ قرآن کریم نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ھیں ۔ اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلاف انسانیت ھے ۔ اس وقت کے ذھن انسانی کی عام سطح نے اس تصور کو نا قابلِ قبول سمجھا ۔ لیکن بتاؤ کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصور کو قابلِ قبول سمجھا یا اپنے قدیمی تصور کو؟

ذھن انسانی کا اس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر، یعنی ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ھے ۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ محض توھم پرستی ھے ۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوھرِ ذاتی سے ھے نہ کہ انتساباتِ نسبی سے ۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا ۔ لیکن تم غور کرو کہ اس زمانے کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وھی نہیں جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا؟

اُس زمانہ میں ذھن اِنسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ھیں اس لئے ھیرو ورشپ (مشاھیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ھے ۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ تصور ذھن انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ھے ۔ اب قومیں آئیڈیا لوجی کی بنیاد پر مرتب ھونگی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی ۔ اُس زمانے نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا اس لئے اسے رد کردیا ۔ لیکن تم بتاؤ کہ کیا آج تمہارے زمانہ کا رخ اس رد کردہ تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ھے؟

اُس زمانے میں جاگیرداری ، زمینداری ، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابق فطرت سمجھا جاتا تھا ۔ قرآن کریم نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ ہر فرد انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشو و نما ہے اس لئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے ۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں ۔ اُس زمانے نے اس تصور کو ٹھکرا دیا لیکن ذرا غور کرو سلیم! کیا زمانہ اسی ٹھکرائے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب اور بے چین نہیں ہے؟

اُس زمانے میں مختلف خاندانوں ، قبیلوں ، قوموں کا تو تصور تھا لیکن عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا ۔ قرآن کریم نے آکر کہا کہ نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل اس طرح ہوسکتی ہے کہ تمام دنیا کا نظامِ حکومت ایک ہو ۔ یہ بات اُس زمانے کے عام ذہن میں نہ آئی ۔ لیکن ذرا غور کرو سلیم! کہ اس کے بعد دنیا کا رخ عالمگیر انسانیت کی منزل طرف ہے یا انسانوں کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کی طرف؟ آج دنیا نیشنلزم کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہے؟ اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہو تو (میری کتاب) ”انسان نے کیا سوچا“ میں سیاسیات سے متعلق باب پڑھو ۔ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی ۔ نیشنلزم کے بعد ، مغربی مفکرین نے انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کی طرف رخ کیا ۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد انہوں نے محسوس کرلیا کہ یہ راستہ بھی انہیں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جاسکتا ۔ چنانچہ اب وہ اسے چھوڑ کر ، عالمگیر انسانیت (Universalism) اور تمام دنیا میں واحد حکومت (One World Government) کے تصورات کی طرف آرہے ہیں ۔ لیکن اس کے لئے انہیں کوئی بنیاد نہیں ملتی جس پر اس کی عمارت استوار کریں (یہ بنیاد ، قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی) ۔

میں نے یہ چند باتیں سلیم! محض بطورِ مثال لکھدی ہیں ، ورنہ زندگی کا

کونسا شعبہ ہے جس میں انسان ، اپنے ناکام تجارب کے بعد ، اس راستہ پر چل نہیں پڑا ، یا اس راستے کی تلاش میں نہیں ، جسے قرآن کریم نے کاروان انسانیت کو منزل مقصود کی طرف لے جانے والا راستہ بتایا ہے ۔ زمانہ قرآن کریم کے انقلاب آفریں حقائق میں سے بعض کو اپنا چکا ہے ، بعض کو اپنانے کے لئے مضطرب و بیقرار ہے ۔ اور جو حقائق باقی ہیں وہ اس زمانے کی سطح سے بھی اونچے ہیں ۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم تمام نوع انسان کے لئے آخری اور مکمل راہ نمائی ہے ، لہذا اسکے حقائق زمانے کی لہروں کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) ”ہم نوع انسان کو اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ بات اُبھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کریم ایک حقیقتِ ثابتہ ہے“ ۔ زمانہ انفس و آفاق کی ان نشانیوں کو دیکھ کر ، قرآن کریم کے ابدی حقائق کو اپناتے اور اس طرح رفتہ رفتہ ”مسلمان ہوتے“ چلا جارہا ہے ۔

جو کچھ شروع میں کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں پھر سن لو کہ :

نگہء باز گشت

(۱) اسلام مجموعہ ہے ان ابدی حقائق ، غیر متبدل قوانین اور مستقل اقدار کا جنہیں نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے بذریعہ وحی عطا کیا گیا ہے اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ۔

(۲) اسلام اپنی آفاقی رفتار سے (جو ہمارے حساب و شمار کے مطابق بہت سست ہوتی ہے) چلا آرہا تھا اور اس طرح عام ارتقائی طریق سے (By Evolution) اپنے حقائق کو آہستہ آہستہ انسانی معاشرہ کا جزو بنارہا تھا کہ نبی اکرمؐ کا ظہور ہوا ۔

(۳) نبی اکرمؐ نے برسوں کی سعیٔ پیہم سے ، ایک جماعت تیار کی جس کے عملی پروگرام سے اسلام کے حقائق کی آفاقی رفتار میں بڑی تیزی آگئی اور ان کے

نتائج، انسانی حساب و شمار کے مطابق، محسوس شکل میں سامنے آ گئے۔ یہ ھے وہ دور جس کے متعلق کہا جاتا ھے کہ اسلام ایک کامیاب تجربہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔

(۴) کچھ عرصہ کے بعد، وہ طریق کار (یعنی دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت اور تعلیم کتاب و حکمت) جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا باقی نہ رہا۔ اس طرح وہ خارجی قوت جس نے اسلام کے ابدی قوانین کی رفتار میں اس قدر محیرالعقول تیزی پیدا کر دی تھی، ختم ھو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ آفاقی (سست) رفتار سے آگے چلنے لگ گیا۔ اس سے سطح بین لوگ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ھیں کہ اسلام تھوڑی دور چل کر ناکام رہ گیا۔

اسلام اور مسلمان قوم کا فرق

ھماری بنیادی غلطی یہ ھے کہ ھم اسلام اور مسلمان قوم کو ایک ھی تصور کر لیتے ھیں اور مسلمانوں کی پستی اور بوں حالی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ھیں کہ اسلام دنیا میں ناکام رہا ھے۔ وہ چند قدم چل کر رک گیا اور زمانے کے بڑھتے ھوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ اگر ھم اسلام اور مسلمان قوم کے فرق کو سمجھ لیں تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ھوں۔ اسلام کے حقائق کی نمود تخلیق کائنات کے ساتھ ھی ھو گئی تھی او انھوں نے رفتہ رفتہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ راستے میں مختلف زمانوں میر، مختلف اقوام نے انہیں اپنایا تو انہیں سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ھو گئیں۔ جب انھوں نے ان حقائق کا ساتھ چھوڑ دیا تو (باقی اقوام کی طرح) مصیبتود کا شکار ھو گئیں۔ آج سے قریب چودہ سو سال پہلے، سر زمین عرب کی ایک قوم نے ان حقائق کو اپنایا تو اسے محیرالعقول ترقی نصیب ھوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا تو اس پر زوال آگیا۔ لیکن اسلام بدستور آگے چلتا رہا۔ یہ دیکھنے کے لئے، کہ اسلام کس طرح خراماں خراماں آگے بڑھتا اور زمانہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ھے، ھمیں مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ نوع انسان کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاھئیے۔ اس سے

اسلام کی تاریخ کے شواہد

واضح ہو جائے گا کہ ہر وہ نظام جسے ذہن انسانی نے وضع کیا، چند دنوں تک زندہ رہ کر ناکام ثابت ہو گیا۔ اور آگے صرف اسلام بڑھا۔ جب فرانس کے گلی کوچوں میں ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی طرح ڈالنے کے لئے انقلاب برپا کیا گیا ہے، تو وہ بھی اسلام کی تاریخ کی ایک کڑی تھی۔ اور جب امریکہ میں غلامی کے انسداد کے لئے لڑائیاں لڑی گئیں تو وہ بھی اسلام ہی کی زریں داستان کا ایک باب تھا۔ جب ہندوستان میں اچھوتوں کو "ہری جن" (روح خداوندی کے حامل) قرار دیئے جانے کی تحریک اٹھی تو وہ بھی اسلام ہی کی ایک ابدی حقیقت کی نمود تھی۔ اور اب جو امریکہ میں سیاہ اور سفید فام افراد میں تمیز رنگ و نسل مٹانے کی جد و جہد ہو رہی ہے تو یہ بھی اسلام ہی کی طرف ایک قدم اٹھ رہا ہے۔ جب اقوام عالم نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مختلف قوموں کے تنازعات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کی پیش کردہ تجویز پر عمل درآمد کی صورت تھی۔ اور اب جو ذہن انسان میں یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہے کہ دنیا سے اسلحہ کا وجود ختم کر دیا جائے تو یہ بھی اسلام ہی کے پروگرام کی ایک کڑی ہے (جس نے چودہ سو سال پیشتر کہا تھا کہ جنگ کی اس وقت تک ضرورت ہے جب تک جنگ خود اپنے ہتھیار نہ رکھ دے)۔ غرضیکہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جہاں جہاں کوئی تحریک نوع انسانی کو صحیح آزادی اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے اٹھی ہے وہ زآن ہی کی شمع نورانی کی ایک کرن تھی، اور جہاں جہاں انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے حیات ناکام ثابت ہوئے ہیں، وہ اسلام کے ابدی قوانین کی صداقت ہی کا ثبوت تھا۔ تم اگر اس نگاہ سے دیکھو سلیم! تو یہ حقیقت واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی تلاش پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفےٰ ؐ اورا بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ؐ است

تاریخ انسانیت کا اس انداز سے مطالعہ کرنے سے تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لوگے کہ (نہ صرف یہ کہ) اسلام کسی مقام پر رک نہیں گیا، بلکہ یہ بھی کہ

اسلام ھی آگے بڑھ رھا ھے

اسلام کے سوا کوئی نظام زندگی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی مقام پر جا کر ناکام نہ ثابت ھو گیا ھو اور اس کی جگہ اسلام کے اصول نے نہ لے لی ھو۔ قرآن کریم نے جب اسلام کے متعلق کہا تھا کہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (۴۸/۲۸) — کہ یہ نظام خداوندی، تمام انسانی نظام ھائے زندگی پر غالب آئے گا — تو یہ ایک حقیقت کا بیان تھا۔ قرآن کریم نے ھمیں بتایا ھے کہ انسان کا مستقبل روشن ھے۔ جب (تخلیق آدم کے سلسلہ میں) ملائکہ نے خدا سے کہا کہ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) — کہ یہ دنیا میں فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں کرے گا — تو اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۱) — میں جانتا ھوں جو تم نہیں جانتے — اس کے معنی یہ ھیں کہ انسان کی آخری منزل، جس میں یہ صحیح مقام آدمیت پر پہنچے گا، وہ ھوگی جس میں فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا خاتمہ ھو جائے گا۔ اور لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) کا دور دورہ ھوگا۔ انسان کو اس منزل کی طرف اسلام لئے جا رھا ھے اور یہ اسے وھاں تک پہنچا کر رھے گا۔ اس لئے کہ یہ خدائے ”رب العالمین“ کا تجویز کردہ نظام ھے اور رب کہتے ھی اسے ھیں جو کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے، بتدریج، نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اگر خدا کا تجویز کردہ نظام آخری منزل تک نہ پہنچے اور راستے ھی میں رک جائے تو وہ خدا رب العالمین نہیں ھو سکتا۔ دنیا اس پروگرام کے مختلف اجزاء کو ایک ایک کرکے اپنا رھی ھے۔ لیکن ان الگ الگ اجزاء سے قرآنی نظام کے نتائج کبھی مرتب نہیں ھو سکتے۔ نظام ایک غیر منقسم وحدت ھوتا ھے جو اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کرتا ھے جب اسے بالکلیہ (As a Whole) اختیار کیا جائے (جس طرح دوائی کا نسخہ اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج پیدا کر

سکتا ھے جب اس کے تمام اجزاء صحیح اوزان کے ساتھ جمع کرکے دوائی بنائی جائے) ۔ جو قوم اس نظام کو بالکلیہ اختیار کرلے اسے جماعت مومنین کہا جاتا ھے اور یہی لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ کی مصداق قرار پا سکتی ھے ۔ انسان نے آخرالامر اس مقام تک پہنچنا ھے، خواہ یہ اپنے تجرباتی طریق سے پہنچے یا ایمان کی رو سے ۔ ایمان کی رو سے یہ صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے کرلے گا اور ان تمام نقصانات سے بچ جائے گا جو تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ھیں ۔

اس مقام پر یہ سوال بھی سامنے آتا ھے کہ یہ کیا وجہ ھے کہ دنیا کی باقی قومیں اس قدر آگے بڑھ رھی ھیں اور مسلمان ان سب سے پیچھے ھیں ۔ اس کی تفصیلی وجوھات تو تمہیں ”اسباب زوال امت“ میں ملیں گی ۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ دنیا کی دیگر اقوام ”انفس و آفاق کی نشانیوں“ پر غور و فکر کے بعد، قرآنی حقائق کو اپنائے جا رھی ھیں اور مسلمان اس ”عجمی اسلام“ کو سینے سے لگائے ھوئے ھیں جس کی رو سے سوچنا اور سمجھنا حرام ھے ۔ لہذا یہ اقوام عالم میں سب سے پیچھے ھیں ۔ جس دن انہوں نے پھر سے ”یتلوا علیھم ایاتہ“ کا پروگرام اپنے سامنے رکھ لیا —— یعنی خالص قرآن کریم کو اپنا نصب العین بنا لیا —— اقوام عالم کی امامت ان کے حصّے میں آجائے گی ۔

کہو سلیم! اب بھی تمہارا یہی خیال ھے کہ اسلام آگے نہیں چلا؟ اسے پھر سمجھ لو کہ (گوئٹے کی تشبیہہ کے مطابق) اسلام ایک صاف اور شفاف ندی ھے جو رواں دواں اپنی منزل کی طرف بہے جا رھی ھے ۔ جو قوم اس ندی کے پانی سے اپنی زمین سیراب کرلے گی اس کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی ۔ تاریخ کے ایک دور میں عرب کی قوم نے ایسا ھی کیا تو اسے ”ایک ایک دانے کے عوض سو سو دانے ملے“ ۔ جب اس نے اس ندی سے پانی لینا بند کر دیا تو اس کی کھیتیاں سوکھ گئیں ۔ سطح بین نگاھوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ وہ ندی ھی سوکھ گئی ۔ یہ غلط ھے ۔ وہ ندی بدستور بہے جارھی ھے جس کا جی چاھے اس سے اپنے کھیتوں کو سیراب کرلے ۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَآءِ وَهٰؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ

رَبِّکَ مَحْظُوْرًا (١٧/٢٠) تیرے نشو و نما دینے والے کا ابرِ کرم، ہر ایک کو (اسکی سعی و عمل کے مطابق) سیرابی عطا کئے جا رہا ہے۔ اس کی یہ بخشش کبھی نہیں رکتی بلکہ جوئے رواں کی طرح جاری و ساری رہتی ہے۔

هست ایں میکده و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ باده بانداز‌ۂ جام است ایں جا

مسلمانوں کی کھیتیاں اس لئے سوکھ گئیں کہ انہوں نے اس آسمانی ندی سے آبیاری چھوڑ دی۔ ندی بدستور بہے جا رہی ہے۔ اگر سلیم! تمہارے ریڈیو سے نغمۂ نو بہار کی حیات بخش آواز آنی بند ہو گئی ہے تو تمہارے ریڈیو سیٹ میں نقص پیدا ہو گیا ہے۔ خدائی ریڈیو اسٹیشن سے بدستور پروگرام نشر ہو رہا ہے اور نشر ہوتا رہیگا ھی حتّٰی مطلع الفجر۔

قرآن کریم نے اسلامی نظام کی اس خصوصیت کبریٰ کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ سورۂ ابراھیم میں ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ۔ (١٤/٢٤) ”کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے خوشگوار نظریۂ حیات کو (کس طرح) مثال دے کر سمجھایا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے بارآور درخت کی سی ہے جس کی جڑ بہت مضبوط ہو اور اس کی شاخیں بلند فضا میں پھیلی ہوئی ہوں“۔ یعنی اس نظامِ زندگی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں پاتال تک پہونچی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ حوادثِ زمانہ کی آندھیاں اور جھکڑ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اپنی جگہ مضبوط اور محکم کھڑا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ کسی ایک ملک تک محدود نہیں۔ (دوسرے مقام پر اس کے متعلق کہا ہے کہ لَا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ (٢٤/٣٥) یہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند ہے)۔ اس کے بعد ہے تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّھَا (١٤/٢٥)۔ قرآنی نظام کا یہ شجرِ طیب، اپنے نشو و نما دینے

والے کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، اپنا پھل ہر وقت دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی خاص موسم (خاص زمانہ) میں اس نے پھل دیا اور اس کے بعد خشک ہو گیا۔ یہ ہمیشہ پھل دیتا ہے۔ یعنی یہ نظام جہاں مکان (Space) کی حدود سے ماوراء ہے وہاں زمان (Time) کی قیود سے بھی ناآشنا ہے۔

اس حقیقت کو سورۂ الرعد میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ۔ جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال (اس باغ کی سی) ہے جس میں ہمیشہ پانی کی ندیاں رواں ہوں اور اس کی وجہ سے اس کے درخت ہر وقت سرسبز و شاداب رہیں۔ اُکُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵)۔ اس باغ کے پھل بھی ہمیشہ رہیں اور اس کا سایہ بھی۔

اب ظاہر ہے کہ جس شجرِ طیب کے متعلق خدا یہ کہتا ہو کہ وہ ہمیشہ پھل دیتا رہے گا اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے ایک زمانہ میں تو پھل دیا اور پھر خشک ہو گیا، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) جس زمانہ کے متعلق سطح بیں نگاہیں یہ کہتی ہیں کہ صرف اسی میں شجر اسلام نے اپنا پھل دیا تھا، اُس میں ہؤا یہ تھا کہ مومنین کی جماعت نے اپنے حسن عمل کی آبیاری سے اس کی ثمر براری کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ (۴۸/۲۹) کی اس سعی و کاوش کے نتیجہ کو بھی قرآن کریم نے کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے جہاں کہا ہے کہ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـٔهٗ۔ اس کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی ننھی سی سوئی نکالتی ہے۔ فَاٰزَرَهٗ پھر وہ اسے مضبوط کرتی ہے۔ فَاسْتَغْلَظَ۔ سو وہ موٹی ہو جاتی ہے۔ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ۔ پھر وہ اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ (۴۸/۲۹)۔ وہ (اس طرح بارآور ہو کر) کسان کے دل کو خوش کرتی ہے تاکہ ان کی وجہ سے ان لوگوں کو غصہ میں لائے جو اس نظام کی صداقت کا انکار کرتے تھے۔ یعنی جس شجر طیب نے اپنی آفاقی رفتار سے دیر میں جا کر ثمر بار ہونا

تھا ، اس جماعت کے سعی و عمل سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے بار آور ہو گیا ۔ جب انسانی دست و بازو کی یہ رفاقت ساتھ نہ رہی تو وہ درخت پھر اپنی معمولی رفتار سے بڑھنے ، پھولنے اور پھلنے لگا ۔

باقی رہی وہ جماعت جس نے اُس زمانے میں اس شجرِ طیب کے ثمرشیریں سے اس طرح جھولیاں بھر لی تھیں ، تو اس کی یہ خوش حالی اُس نظام سے پیوستگی کا نتیجہ تھی ۔ جب اس نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو وہ اس نظام کے ثمرات سے بھی محروم ہو گئی ۔ اس کے متعلق سورۂ ابراھیم کی اُس آیت کے تسلسل میں جسے اوپر درج کیا گیا ھے ، قرآن مجید نے کہا ھے کہ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ وَ یُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ ۔ وَ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَاءُ (۱۴/۲۷) اللہ ، جماعتِ مومنین کی ، دنیا اور آخرت میں جو جڑیں مضبوط کرتا ھے تو اس نظریۂ زندگی کی رو سے ایسا کرتا ھے جو خود محکم اور مضبوط ھے ۔ جب تک وہ اس کے ساتھ پیوست رہتی ھے ، ثابت اور مستحکم رہتی ھے ۔ جب اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ھے تباہ اور برباد ہو جاتی ھے ۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ھے ۔ وہ نہ کسی کو یونہی ثبات و قرار عطا کرتا ھے نہ بلا سبب کسی کی جڑیں اکھیڑتا ھے ۔ جس قسم کا نظام کوئی قوم اختیار کر لیتی ھے اس قسم کا اس کا انجام ہوتا ھے ۔ اسلام نہ کبھی ناکام ثابت ہوا ھے ، نہ ناکام ثابت ہوگا ۔ اس کے علاوہ ہر نظام آخرالامر ناکام رھے گا ۔ وَالْعَصْرِ ۔ زمانہ (کی تاریخ) اس حقیقت پر شاھد ھے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ انسان (اپنے خود ساختہ نظامہائے حیات پر چلنے سے) ہمیشہ نقصان میں رھے گا ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ ۔ کامیاب وہ جماعت رھے گی جو نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھے اور اپنے اعمالِ صالحہ (سے اس کی ثمرباری کی رفتار کو تیز کر دے) ۔ لیکن یہ ہنگامی پروگرام نہیں کہ کسی ایک زمانے میں اس پر عمل پیرا ہو کر وہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کامیاب و کامران رھے گی خواہ بعد میں اس نظام کو چھوڑ ہی کیوں نہ دے ۔ بالکل نہیں ۔ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳) ۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اس جماعت کے افراد ایک دوسرے کو اس نظام حق و صداقت کی تلقین کرتے رہیں اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کی تاکید کریں ۔ جب تک مسلمان اس پروگرام پر عمل پیرا رہے ، قوانین خداوندی کے نتائج حسنہ نے ان کی جھولیاں بھر دیں ۔ جب انہوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ان کے ثمرات سے محروم ہو گئے ۔

اور اس کے بعد وہ قوانین اپنی سابقہ رفتار سے آگے چلتے گئے اور چلے جا رہے ہیں !

یہ ہے سلیم ! مختصر الفاظ میں ، اس سوال کا جواب کہ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں ؟ کہو ! تمہارا کیا خیال ہے ؟ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں ؟

والسلام

پرویز

تینتالیسواں خط

فرائض رسالت۔ بسلسله ''اسلام آگے کیوں نه چلا''؟

مجھے خوشی هوئی سلیم! که میرے سابقه خط سے تمهارے شکوک و شبهات رفع هوگئے۔ حقیقت یه هے که اگر انسان، اپنے ذاتی معتقدات و نظریات سے الگ هٹ کر، قرآن کریم پر غور و فکر کرے تو شکوک و شبهات باقی نهیں ره سکتے۔ یهی تو اس کتابِ عظیم کا اعجاز هے۔

جس نقطه کی تم نے مزید وضاحت چاهی هے، وه فی الواقعه ایک مستقل موضوع هے اور سابقه خط میں وه محض ضمناً سامنے آیا تھا۔ مختصر الفاظ میں تمهارا سوال یه هے که تشکیل دین کے سلسله میں جو کچھ نبی اکرمؐ نے کیا تھا، وه اگر آپؐ کے نبی هونے کی حیثیت سے تھا، تو پھر حضورؐ کے بعد کوئی اور اُن امور کو سر انجام نهیں دے سکتا تھا۔ نه هی اب دے سکتا هے، (کیونکه نبوت حضورؐ پر ختم هو چکی هے)۔ لهذا حضورؐ کی وفات کے بعد، دین کی وه شکل قائم نهیں ره سکتی تھی۔ نه هی اب دوباره قائم کی جاسکتی هے۔ اس صورت میں یه سوال هی بیکار هے که ''اسلام آگے کیوں نه چلا''۔ وه آگے چل هی نهیں سکتا تھا۔ لیکن اگر وه ایسے امور تھے جنهیں ''غیر از نبی'' بھی سرانجام دے سکتے تھے (اور دے سکتے هیں) تو پھر اسلام کا وهی سلسله بدستور قائم رکھا جا سکتا تھا (اور اب

بھی اُسے قائم کیا اور آگے چلایا جا سکتا ہے) ۔ اس خط میں ، اسی نقطہ کی مزید وضاحت مقصود ہے ، اگرچہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے ، ضمناً یہ نقطہ سابقہ خط میں بھی سامنے آچکا ہے ۔

نبی اور رسول

قرآن کریم کی رو سے ، نبی اور رسول ، ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں ۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی صاحبِ کتاب نہیں ہوتا ، یہ قرآن کریم سے بے خبری کی دلیل ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ہر مامور من اللہ (خواہ اسے نبی کہہ کر پکارا جائے یا رسول کے لقب سے) صاحبِ کتاب ہوتا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالٰی نے ''انبیاء'' کے متعلق کہا ہے کہ وَ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتَابَ بِالۡحَقِّ (۲/۲۱۳) ''اللہ نے ان سب کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب نازل کی'' ۔ اور سورۃ حدید میں ''رسولوں'' کے متعلق ارشاد ہے ''وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتَابَ (۵۷/۲۵)'' ۔ ''ہم نے ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی،، ۔ یہ بات ہے بھی بالکل ٹھیک ۔ جو بھی خدا کی طرف سے آئے گا وہ خدا کا پیغام لے کر آئے گا (اسی کو خدا کی کتاب کہتے ہیں) ۔ اگر وہ خدا کا پیغام لے کر نہیں آتا ، تو اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ لہذا ، نبوت اور رسالت میں ، اس جہت سے کوئی فرق نہیں ۔ لیکن جو سوال تم نے اٹھایا ہے ، اسے ذہن نشین کرنے کی خاطر اتنا سمجھ لو کہ (میرے اس خط میں) ''نبوت'' سے مفہوم ہوگا نبی اکرمؐ کا خدا کی طرف سے وحی پانا ۔ اور ''رسالت'' سے مقصود ہوگا، اُس وحی کے مطابق ، معاشرہ کی تشکیل کرنا ۔ اسے عملی شکل میں نافذ کرنا ! اس اعتبار سے نبوت نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گئی ۔ حضورؐ کے بعد ، کوئی شخص خدا سے وحی نہیں پاسکتا ۔ خدا نے جس قدر وحی انسانوں کی راہنمائی کے لئے بھیجنی تھی وہ قرآن کریم میں منضبط ہو گئی اور قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے لیا ۔ لہذا اب گفتگو صرف ان امور کے متعلق رہ جاتی ہے جنہیں حضورؐ نے ، اس وحی کو ایک عملی نظام کی شکل میں نافذ کرنے

نبوت اور رسالت

کے سلسلے میں، سرانجام دیا تھا ۔ ان امور کو، محض سمجھنے سمجھانے کی خاطر، "فرائض رسالت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ھے ۔ اب تم غور سے سنو کہ یہ فرائض رسالت کیا تھے اور آیا یہ فرائض (نبوت کی طرح) حضورؐ کی ذات تک محدود تھے یا ان کا سلسلہ آگے بھی چل سکتا تھا؟

تبلیغ رسالت

خدا کی طرف سے وحی پانے کے بعد، رسول کے ذمے سب سے پہلا فریضہ یہ عائد ھوتا تھا کہ وہ اس وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ اپنی ذات تک ھی محدود نہ رکھے ۔ چنانچہ حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ

> یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ
> (۵/۶۷)
>
> اے رسول! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ھے اسے (دوسروں تک) پہنچاؤ ۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو (اس کا مطلب یہ ھوگا کہ) تو نے خدا کے پیغام کو (دوسروں تک) نہیں پہنچایا ۔

یعنی رسول کا سب سے بڑا فریضہ یہ ھے کہ وہ خدا کی وحی کو، جو اس پر نازل کی جائے، دوسروں تک پہنچائے ۔

تصوف اور نبوت

میں نے تمہیں ایک خط میں، تصوف کے متعلق، تفصیل سے لکھا تھا ۔ تمہیں یاد ھوگا کہ اس میں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب کسی صوفی سے کہا جائے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا ھے (یعنی "مشاھدہ حق") ذرا ھمیں بھی بتائیے کہ اس کی کیفیت کیا ھے، تو اس کے جواب میں وہ کہے گا کہ یہ باتیں سمجھنے سمجھانے کی نہیں ۔ خود مشاھدہ کرنے کی ھیں۔ کون کسی کو بتا سکتا ھے کہ "شراب کے نشے کی کیفیت کیا ھوتی ھے؟"

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا، تا نچشی

تم وھاں کے احوال و کوائف کا پوچھتے ھو؟ وھاں کی تو کیفیت یہ ھے کہ

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

جسے وھاں کی کچھ خبر ھو جاتی ھے، پھر خود اس کی اپنی خبر بھی نہیں ملتی (کہ وہ کہاں گیا اور اس کے ساتھ کیا ھوا؟)۔ یہ اھل تصوف کی باتیں ھیں (جو محض باتیں ھی باتیں ھیں)۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ھوتی ھے۔ اسے خدا کی طرف سے جن حقائق کا علم حاصل ھوتا ھے وہ ان حقائق کو دوسروں تک پہنچاتا ھے اور اس طرح انہیں بھی ''اس بادہ کے نشہ میں'' برابر کا شریک کرلیتا ھے۔ نبوت اور تصوف کے اس فرق کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ھے۔ مجھے یاد پڑتا ھے کہ اس کے متعلق میں اس سے پہلے بھی لکھ چکا ھوں۔ لیکن یہ وہ حقائق ھیں جنہیں جتنی مرتبہ سامنے لایا جائے، کم ھے—تاج محل کو جتنی مرتبہ بھی دیکھئے، ھر بار ایک نئی کیفیت پیدا ھوتی ھے۔ کیٹس کے الفاظ میں، حسن، مسرتِ دوام کا موجب ھوتا ھے (A thing of Beauty is joy for ever)—— سنو، وہ اس باب میں کیا کہتے ھیں۔

> ''محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاھد ھے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا''۔
>
> یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوھیؒ) کے ھیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ھے، جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاھتا۔ اور جب واپس آتا بھی ھے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ھے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی

> مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجرد گاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے، وہ کس انداز کی ہے۔

بہرحال رسول کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ یہ گویا تشکیلِ معاشرہ کی پہلی اینٹ ہوتی ہے۔

دعوت علیٰ وجہ البصیرت

رسول اپنا یہ پیغام دوسروں تک، علیٰ وجہ البصیرت پہنچاتا ہے۔ اس میں کسی معجزہ یا مافوق الفطرت قوت سے کام نہیں لیتا۔ وہ دلیل و برہان کی رو سے اپنا پیغام دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جو اسے نہیں مانتے، ان سے بھی دلیل و برہان طلب کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی عقل و فکر اور دانش و بینش کو اپیل کرتا ہے اور اس طرح، اپنے پیغام کی حقانیت کو ثابت کرکے، اسے دوسروں سے منواتا ہے۔ سورۃ یوسف میں ہے۔

> قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْ اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (۱۲/۱۰۸)
>
> (ان سے کہہ دو کہ) یہ میرا راستہ ہے۔ میں خدا کی طرف

> علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور
> میرے متبعین بھی (ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور ایسا ہی کرینگے)

اس میں زبردستی نہیں

رسول کو اس کا بھی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جسے چاہے صحیح راستے پر لگا دے۔ یعنی اس سے اپنا پیغام منوا لے۔ اس کا کام پیغام پہنچانا ہے۔ ماننا نہ ماننا دوسروں کے اختیار میں ہے۔ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۲۸/۵۶) ”تو اسے ہدایت نہیں دے سکتا جسے تو محبوب رکھے۔ لیکن اللہ اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت لینا چاہے“ (یا جسے اللہ اپنے قانون مشیئت کے مطابق ہدایت دے)۔ اور وہ ”قانون مشیئت“ یہ ہے کہ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۱۰/۱۰۰) ”جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے“۔

ایمان کے معنی ہیں کسی بات کی صداقت کو برضا و رغبت، بطیبِ خاطر تسلیم کر لینا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اعترافِ حقیقت میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول، نہ تو کسی سے بزورِ شمشیر، اپنے پیغام کو منواتا ہے (کہ یہ جسمانی اِکراہ ہے) اور نہ ہی معجزات کے ذریعے (کہ یہ ذہنی اِکراہ ہے)۔ سورۃ یونس میں ہے۔

> وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ
> جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا
> مُؤْمِنِينَ (۱۰/۹۹)۔
>
> اگر تیرے رب کی مشیت ہوتی تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب ایمان لے آتے (وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا) تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول بار بار اعلان کرتا ہے کہ أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ۔ ”میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں“۔ اس کے مخالف، جو اپنی توہم پرستیوں کی بناء پر،

رسول کی بشریت

سمجھتے تھے کہ رسول کو مافوق البشر ہونا چاہئیے۔ اس پر اعتراض کرتے۔ وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ . . . . . يَاْكُلُ مِنْهَا . . . . . . (۲۵/۷-۸) ”اور کہتے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (اگر یہ خدا کا فرستادہ تھا تو) اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ ہو کر لوگوں کو ڈراتا۔ یا اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جاتا۔ یا اس کا کوئی (طلسماتی قسم کا) باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا . . . .“ یعنی انہیں اس پر اچنبھا ہوتا کہ رسول بھی انہی جیسا ایک انسان کیوں ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ . . . فِي الْاَسْوَاقِ . . . (۲۵/۲۰) ”ہم نے تجھ سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے“۔

یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن کریم نے ان امور کی اس قدر وضاحت یہ بتانے کے لئے کی ہے کہ نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی کا ملنا) تو ایسی خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی وہ مافوق الفطرت خاصہ تھا۔ لیکن اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں کوئی مافوق الفطرت قوت یا ذریعہ کار فرما نہیں تھا۔

جماعت کی تشکیل

جو لوگ اس طرح رسولؐ کے پیغام کو تسلیم کر لیتے، رسولؐ انہیں ایک جماعت کے رشتے میں منسلک کئے جاتا۔ شاہراہ حیات پر گامزن ہونے کے لئے انہیں ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دیئے جاتا۔ اسے تزمیل کہتے ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہؐ کو يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر پکارا گیا ہے (۷۳/۱)۔ یعنی نہایت حسن و خوبی اور شدت و کثرت سے عمل تزمیل کرنے والا۔ قافلہ کی بہت عمدہ ترتیب دینے والا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ الدین، اپنے اپنے طور پر، پوجا پاٹ یا ایشور بھگتی کا نام نہیں۔ یہ اجتماعی نظام زندگی ہے اور رسولؐ کا فریضہ، ہم آہنگ افراد کو جماعت کے رشتے میں پرونا ہے۔

تعلیم و تربیت

یہ جماعت محض فارم ممبری پر دستخط کرنے سے وجود میں نہیں آتی۔ اس کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیز بھی فرائض رسالت میں داخل ہوتی ہے۔ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۵۱) ”جیسا کہ ہم نے تم میں، تم ہی میں سے ایک رسول؏ بھیجا۔ وہ خدا کی آیات تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمہاری ذات کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور تمہیں قوانین خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے“۔ وہ انہیں تلقین کرتا کہ وہ کتاب اللہ کا اتباع کریں۔ اور اس کے سوا کسی اور کی بات نہ مانیں — اِتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ...... (۷/۳) ”جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا کسی دوسرے چارہ سازوں کا اتباع نہ کرو“۔

اتباع کتاب اللہ

لیکن وہ کتاب اللہ کے اتباع کی تلقین صرف اپنی اس جماعت کے افراد ہی کو نہیں کرتا۔ خود بھی اس کا اتباع کرتا ہے اور اس کا کھلے الفاظ میں اعلان کرتا ہے۔ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي (۷/۲۰۳)۔ ”ان سے کہو کہ میں صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کیا جاتا ہے“۔

مملکت کی تشکیل

اس جماعت کے ایمان محکم اور عمل پیہم سے آہستہ آہستہ ایک مملکت وجود میں آجاتی ہے جس میں یہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ خود بھی خالص قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں اور دوسروں کو بھی ان کی انسانیت ساز برکات میں شریک کر سکیں۔ یہ مملکت یونہی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آجاتی بلکہ خدا کے اٹل پروگرام کے مطابق متشکل ہوتی ہے، جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ

اٰمَنُوْا مِنْکُمْ ..... هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ($\frac{۲۴}{۵۵}$) ”جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور اعمال صالح کریں، ان سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں استخلاف فی الارض (ملک میں حکومت) عطا کرے گا جیسا اس نے ان لوگوں کو حکومت عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ۔ اور وہ ان کے لئے ان کے اس دین (نظام زندگی) کو متمکن کر دے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے ۔ اور وہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا ۔ (اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ) وہ صرف میری محکومی اختیار کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں ۔ اور جو کوئی اس کے بعد، اس راہ سے انکار کر دے گا تو یہی لوگ ہوں گے جو (امن و آزادی کی اس راہ سے نکل کر) دوسری راہ پر چل پڑیں گے“ ۔ اس مملکت کے قیام کے لئے، انہیں ان کے ”مخالفین کی زمینوں ۔ بستیوں اور مال و دولت کا وارث“ بنا دیا جاتا ہے ۔ ($\frac{۳۳}{۲۷}$) ۔

سورۂ نور کی مندرجہ بالا آیت ($\frac{۲۴}{۵۵}$) میں کہا گیا ہے کہ یہ اسی قسم کا استخلاف فی الارض ہے جس قسم کا تم سے پہلے ان اقوام کو عطا ہوا تھا جنہوں نے ایمان و اعمال صالح سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیا تھا ۔ اس سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے ۔ فَقَدْ اٰتَیْنَا اٰلَ اِبْرَاهِیْمَ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَةَ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مُلْکًا عَظِیْمًا ۔ ($\frac{۴}{۵۴}$) ”یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی عطا کی اور ایک بہت بڑی مملکت بھی“ ۔

صدر مملکت

ظاہر ہے کہ اس مملکت کا رئیس (Head of the State) بھی رسولؐ ہی ہوتا ہے ۔ اس کی موجودگی میں اور کون صدر مملکت ہو سکتا تھا؟ وہ اس مملکت میں ”معروف کا حکم دیتا اور منکر سے روکتا ہے“ ($\frac{۷}{۱۵۷}$) ۔ یعنی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرتا ہے ۔ سورۂ نساء میں ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ .... ($\frac{۴}{۱۰۵}$) ”ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں میں، اس علم کی رو سے جو اللہ نے تجھے دیا ہے (متنازعہ فیہ امور کے) فیصلے کرے“ ۔ اس لئے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ
هُمُ الْكَافِرُوْنَ ($\frac{۵}{۴۴}$)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی
لوگ کافر ہیں۔

مملکت کے واجبات کی وصولی

رسول، صدر مملکت کی حیثیت سے، لوگوں سے مملکت کے واجبات وصول کرتا ہے۔ ($\frac{۹}{۱۰۳}$; $\frac{۸}{۱}$; $\frac{۸}{۴۱}$; $\frac{۵۹}{۷}$)۔ ان آیات میں مال غنیمت۔ انفال۔ فے۔ صدقات وغیرہ کی وصولی کا ذکر ہے۔ وہ میدان جنگ میں فوجوں کی کمان بھی کرتا ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ
مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ($\frac{۳}{۱۲۰}$)

اور جب تو صبح سویرے اپنے اہل خانہ سے رخصت ہوا۔ اور پھر
(میدان جنگ میں) مومنین کو لڑائی کے مورچوں پر بٹھاتا تھا۔
اور اللہ (سب کچھ) سننے والا، جاننے والا ہے۔

فوجوں کی کمان

چنانچہ قرآن کریم میں متعدد لڑائیوں کا ذکر ہے جن میں رسول اللہؐ بہ حیثیت سپہ سالار شریک تھے۔

افسران ماتحت

امور مملکت کی سرانجام دہی کے لئے، وہ مختلف علاقوں میں افسرانِ ماتحت مقرر کرتا ہے۔ اور لوگوں کے نام فرمان جاری کرتا ہے کہ وہ اِن افسران کے احکام کی اطاعت کریں۔ لیکن لوگوں کو ان افسروں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ اپیل، مرکز مملکت (یعنی خود رسولؐ) کے پاس آتی ہے جس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوتا ہے۔ سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی نظامِ مملکت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ

فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ
تَاْوِيْلًا (۴/۵۹)

اے ایمان والو ! اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؑ کی ۔ اور تم میں سے جو صاحب اختیار بنا دیئے جائیں ، ان کی ۔ پھر اگر کسی معاملہ میں (تمہارا اور ان افسران ماتحت کا) تنازعہ ہو جائے تو اس معاملہ کو اللہ اور رسولؑ کی طرف لوٹا دو ، اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو ۔ یہ (طریقِ کار) بہتر اور انجام کار اچھا ہے ۔

میں تمہیں سلیم ! اس سے پہلے ، متعدد خطوط میں بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم میں " اللہ اور رسولؑ " کی اطاعت سے کیا مقصود ہے ۔ اس لئے اس نقطہ کی مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں ۔ اس مقام پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسول (بہ حیثیت صدر مملکت) افسران ماتحت کا تعین کرتا ہے اور ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل سنتا ہے ۔

وہ یہ تمام نظم و نسق ، اپنی جماعت کے مشورہ سے کرتا ہے ۔ اسے خدا کی طرف سے اس کا حکم دیا جاتا ہے ۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ ...... (۳/۱۵۸) "تو معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کیا کر ۔ اور پھر جب کسی معاملہ کا فیصلہ کر لے اور اسے انجام دینے کا تہیہ ، تو قانون خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہو جا" ۔

اپنی جماعت کے ساتھ یہ مشاورت محض " رسمی " نہیں ہوتی تھی ۔ قرآن کریم نے اس جماعت کو بڑی اہمیت دی ہے ۔ سورۂ انفال میں ہے يَآ اَيُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۸/۶۴) ۔ اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ اے نبیؑ ! اللہ تیرے لئے ، اور مومنین میں سے جو تیرا اتباع

کرتے ھیں، ان کے لئے کافی ھے۔ اور یہ معنی بھی کہ اے نبیؐ! اللہ، اور مومنین میں سے جو تیرا اتباع کرتے ھیں، وہ تیرے لئے کافی ھیں۔ یہی وہ جماعت مومنین ھے جس کا ذکر قرآن کریم نے اس وجد و مسرت کے ساتھ کیا ھے۔

جماعت کی اھمیت

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ...... اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸/۲۹)۔ ”محمدؐ، اللہ کا رسولؐ۔ اور اس کے ساتھی! ان کی کیفیت یہ ھے کہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور باھمد گر بڑے ھمدرد اور مشفق۔ تو انھیں دیکھتا ھے، کبھی رکوع میں ھیں، کبھی سجدے میں (ھمیشہ قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کئے) وہ اپنے رب کا فضل اور اس کے قوانین سے ھم آھنگی چاھتے ھیں۔ اطاعت خداوندی کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ھیں۔ توریت اور انجیل میں یہ ان کی مثال ھے — کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی ننھی سی سوئی نکالتی ھے۔ پھر اسے مضبوط کرتی ھے سو وہ موٹی ھو جاتی ھے۔ پھر اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ھو جاتی ھے۔ کسان کا دل اس (کھیتی کی برومندی سے) باغ باغ ھو جاتا ھے اور ان کے مخالفین اس سے غم و غصہ میں (اپنی انگلیاں کاٹتے) ھیں۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لاتے اور اعمال صالح کرتے ھیں، اللہ نے ان سے (تباھیوں سے) حفاظت اور اجرعظیم کا وعدہ کر رکھا ھے،،۔ یہ تھی وہ جماعت جس کے ساتھ مشورہ سے رسول اللہؐ امور مملکت کو سرانجام دیتے تھے۔

اجتہادی غلطیاں

ان فیصلوں میں کبھی غلطی بھی ھو جاتی تھی۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ھے کہ

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ۚ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰)

ان سے کہدو کہ اگر میں غلطی کرتا ھوں تو یہ (غلطی) میری اپنی وجہ سے ھوتی ھے (اور اس کی ذمہ داری بھی مجھ پر ھے) اور اگر میں سیدھے راستہ پر ھوں تو یہ اس وحی کی بنا

پر ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ (سب کچھ) سننے
والا اور (سب کے) قریب ہے۔

خدا کی طرف سے تادیب

اگر یہ اجتہادی غلطی ایسی ہوتی جس کا اثر دین کے کسی اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اسکی تادیب بھی ہو جاتی۔ (مثلاً) ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہ جانے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے انہیں اجازت دے دی۔ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ۔ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکَاذِبِیْنَ (۹/۴۳) ”اللہ تجھے معاف کرے۔ تو نے کیوں انہیں اجازت دیدی (انہیں اجازت نہیں دینی چاہیئے تھی) تاآنکہ تجھ پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور تو معلوم کر لیتا کہ کون جھوٹے ہیں“۔ اسی طرح سورۃ تحریم میں ہے کہ حضورؐ نے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا۔ چونکہ آپؐ کے اس فیصلے کے نتائج بڑے دور رس ہو سکتے تھے اس لئے قرآن کریم میں تادیب آ گئی کہ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ .... (۶۶/۱) اے نبی! جو اللہ نے تیرے لئے حلال ٹھہرایا ہے اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے“؟ سورہ عبس میں ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰی۔ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی .... (۸۰/۱-۱۰)، ”(تو نے اے رسولؐ!) برا منایا اور منہ پھیر لیا، اس بات پر کہ تیرے پاس اندھا (کیوں) آ گیا؟ تجھے کیا خبر ہے کہ شاید یہی اندھا (اس سے) اپنی ذات کو نشو و نما دے لیتا یا (کم از کم) نصیحت قبول کر لیتا اور اسے نصیحت فائدہ دے جاتی۔ جو (پیغامِ خداوندی کی) پروا نہیں کرتا (اور اپنے آپ کو اس سے مستغنی سمجھتا ہے) تو اس کی طرف تو متوجہ ہوتا ہے (حالانکہ) اگر وہ اپنی ذات کی نشو و نما نہ کرنا چاہے تو (اس سے) تجھ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ (اس کے برعکس) جو تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے اور (قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب سے) ڈرتا ہے، تو اس سے بے رخی برتتا ہے“۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ وحیٔ خداوندی کی روشنی میں، امور مملکت کے سرانجام دینے میں، جزئی معاملات میں رسولؑ سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ نیز آپؑ (بحکم خداوندی) اس کا اعلان بھی کرتے رہتے تھے کہ مجھے خدائی اقتدارات میں کوئی عمل دخل نہیں۔ قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ...... لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ($\frac{۷}{۱۸۸}$) ”ان سے کہدو کہ میں (اور تو اور) خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ بجز اس کے جو اللہ کے قانون مشیت کے مطابق وارد ہو۔ اور اگر میں علم غیب رکھتا تو بہت سا مال و دولت (یا اچھی اچھی چیزیں) اپنے لئے اکٹھا کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میرا فریضہ تو صرف یہ ہے کہ جو لوگ قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کریں انہیں ان کی اس روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دوں۔ اور جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں، انہیں ان کے حسن عمل کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دوں“۔ نہ ہی رسولؑ، خدا کی وحی (قرآن کریم) میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکتا تھا۔ سورۂ یونس میں ہے۔

خدائی اقتدارات میں دخل نہیں

قرآن کریم میں تبدیلی نہیں کر سکتا تھا

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیَاتُنَا ..... یَوْمٍ عَظِیْمٍ ($\frac{۱۰}{۱۵}$)

> جب ان کے سامنے ہمارے واضح احکام پیش کئے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور قرآن کریم لاؤ (جس میں ان کے مطلب کی باتیں ہوں) یا اس میں کچھ تبدیلی ہی کر دو۔ ان سے کہو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کسی قسم کا رد و بدل کر دوں۔ میں تو بس اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں عذاب کے بہت بڑے دن سے ڈرتا ہوں۔

فرائض رسالت

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا سلیم، کہ رسالت کے فرائض کیا تھے۔ مختصر الفاظ میں دہرا دوں کہ رسولؐ کا فریضہ یہ تھا کہ

(۱) وحیٔ خداوندی کو لوگوں تک پہنچائے۔

(۲) یہ دعوت و تبلیغ، علیٰ وجہ البصیرت ہوتی تھی جس میں کسی مافوق الفطرت قوت سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔

(۳) جو لوگ، علم و بصیرت کی بنا پر، اس دعوت کو قبول کرتے تھے، انہیں ایک جماعت کے رشتے میں پرو دیا جاتا تھا۔

(۴) اس جماعت کی ذہنی اور قلبی تعلیم و تربیت بھی رسولؐ کے فرائض میں داخل تھی۔

(۵) رسولؐ خود بھی وحیٔ خداوندی کا اتباع کرتا تھا اور اپنی جماعت سے بھی اس کی اطاعت کراتا تھا۔

(۶) اس جماعت کے ایمان و اعمال صالح سے آہستہ آہستہ ایک مملکت وجود میں آجاتی تھی جس کا صدر اول خود رسولؐ تھا۔

(۷) رسولؐ وہ تمام فرائض ادا کرتا تھا جو مملکت کو چلانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ وہ مملکت کے واجبات وصول کرتا اور انہیں مناسب مقامات پر صرف کرتا تھا۔ افسران ماتحت کا تقرر کرتا اور ان کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتا تھا۔ افراد مملکت کے اعمال کی نگرانی کرتا تھا ($\frac{۲}{۱۴۳}$)۔ حتیٰ کہ لڑائیوں میں، عندالضرورت، فوجوں کی کمان بھی کرتا تھا۔

(۸) یہ تمام فرائض وہ اپنی جماعت کے مشورے سے سر انجام دیتا تھا۔ اس جماعت کو دین کے نظام میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

(۹) ان امور کے فیصلوں میں بعض اوقات غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ اگر غلطی (Serious) قسم کی ہوتی تو اس پر وحی کی رو سے تادیب بھی ہو جاتی تھی۔

(۱۰) رسولؐ کو خدائی اختیارات و اقتدارات میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی وہ وحیٔ خداوندی میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا مجاز تھا۔ وہ، وحی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے نظام مملکت کو قائم کرتا اور آگے بڑھاتا تھا۔

رسول اللہؐ کے بعد

تم سوچو سلیم! کہ ان میں سے کوئی فریضہ بھی ایسا ہے جو رسول اللہؐ کی ذات گرامی سے مخصوص ہو اور جو حضورؐ کی وفات کے بعد آگے نہ چل سکتا ہو؟ قطعاً نہیں۔ یہ تمام فرائض ایسے تھے جنہیں حضورؐ کے جانشین (خلفاء) اسی طرح سر انجام دے سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو خاتم النبیین کہہ کر، منصب نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی پانے کے منصب) کو تو ختم کر دیا لیکن جہاں تک منصب رسالت (یعنی وحی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل) کا تعلق تھا، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا۔ سورۂ آل عمران کی یہ آیت کئی مرتبہ تمہارے سامنے آچکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
> الرُّسُلُ ۔ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ
> أَعْقَابِكُمْ ۔ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ
> يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۔ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ (۳/۱۴۴)
>
> اور محمدؐ اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے بھی اللہ کے رسولؐ گذر چکے ہیں پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پا جائیں، یا (کسی لڑائی میں) قتل کر دیئے جائیں، تو کیا تم الٹے پاؤں (اپنے نظام کہن کی طرف) پلٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی (اس طرح) الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ (ان کے برعکس

> جو لوگ (خدا کے اس دین کی) قدر سمجھیں گے، خدا انہیں اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

خلافت راشدہ میں

قرآن کریم کی اس قسم کی واضح اور بیّن ہدایات کے بعد، یہ کہنا کہ رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے، وحی کی رو سے کرتے تھے (اور وحی کا سلسلہ حضور کی ذات پر ختم ہو گیا) اس امر کا اقرار اور اعلان ہے کہ حضور کی وفات کے بعد دین کا یہ سلسلہ علیٰ حالہٖ باقی نہیں رہ سکتا تھا — جانشینان رسول اللہ (خلفائے کرام رض) کے دل میں اس قسم کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے، باہمی مشاورت سے کرتے تھے، اس لئے آپ کی وفات سے دین کے نظام میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اس نظام کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا اور آگے چلایا۔ مملکت دن بدن وسیع ہوتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے تقاضے بڑھتے جاتے تھے۔ اس وجہ سے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے۔ ان امور کے تصفیہ کے لئے وہ دیکھتے تھے کہ اگر کوئی پہلے کا فیصلہ ایسا ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تو وہ اسے علی حالہٖ باقی رکھتے تھے۔ اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی تھی تو باہمی مشاورت سے اس میں تبدیلی کر لیتے تھے اور اگر کسی نئے فیصلے کی ضرورت ہوتی تھی تو اُسی وقت باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے تھے۔ یہ سب کچھ قرآن کریم کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا اور اسی کو آپ کے جانشینوں رض نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباع سنت تھا۔ یعنی رسول اللہ نے جو طریق اختیار فرمایا تھا اس کا اتباع۔ ایک آئینی حکومت (Constitutional Govt.) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اِن حضرات کو اس کا علم تھا کہ مستقل اور غیر متبدل قوانین و اقدار کا مجموعہ صرف اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس میں حالات کے تغیر سے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ نبی اکرم نے اپنے فیصلوں (احادیث) کا کوئی مجموعہ

احادیث

مرتب کر کے امت کو دیا، نہ ھی خلفائے راشدینؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا۔ مسلم کی حدیث ھے کہ رسول اللہؐ نے حکم دے دیا تھا کہ آپؐ سے قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور نہ لکھا جائے۔ جس نے کچھ لکھا ھے وہ اسے مٹا ڈالے۔ بخاری کی حدیث ھے کہ (رسول اللہؐ کی وفات کے بعد) لوگ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس گئے اور آپ سے دریافت کیا کہ حضورؐ نے کیا چھوڑا ھے۔ آپ نے کہا کہ حضورؐ نے مابین الدفتین (مجلد قرآن کریم) کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ حافظ ذھبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ھے کہ

> رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ھو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ھوتا ھے اور تمہارے بعد جو لوگ ھوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ھوگا۔ تو رسول اللہؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ھمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ھے۔ اس کے حلال کئے ھوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ھوئے کو حرام سمجھو*۔

اسی طرح سیوطی نے تنویرالحوالک شرح موطا امام مالک میں ایک روایت میں کہا ھے کہ

> حضرت عمرؓ نے احادیث کو لکھوانا چاھا اور اس بارے میں اصحاب رسول اللہؐ سے مشورہ کیا تو عام صحابہؓ نے اس کا مشورہ دیا لیکن وہ ایک مہینہ تک خود غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رھے۔ اس کے بعد ایک دن انھوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ میں نے، جیسا کہ تم

---

* بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی (علامہ محمد الخضری مرحوم) شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ صفحہ ۱۶۱

> لوگوں کو معلوم ہے تم سے تحریر احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہیں کتابوں میں مشغول ہو گئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو مخلوط نہ کروں گا۔ اس لئے انھوں نے تحریر احادیث کا کام چھوڑ دیا*۔

حتیٰ کہ حضرت علیؓ کے متعلق (امام بخاری کے حوالے سے) روایت ہے کہ

> آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس بجز کتاب اللہ کے اور ان احادیث کے جو اس صحیفے میں درج ہیں، پڑھنے کی اور کوئی کتاب نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس صحیفے کو کھولا تو اس میں صرف چار حدیثیں درج تھیں جن میں سے ایک میں مختلف اونٹوں کے صدقات کا بیان تھا**۔

جب تک اسلامی مملکت کا یہ نظام قائم رہا، (جسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے) تمام امور کے فیصلے اُسی طریق پر ہوتے رہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و آئین کی چار دیواری میں رہتے ہوئے، اپنے حالات کے مطابق، مختلف امور کے فیصلے باہمی مشاورت سے۔ اس وقت تک انہی فیصلوں کی اطاعت ”اللہ اور رسولؐ“ کی اطاعت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی کتاب اللہ کی اطاعت اس عملی نظام مملکت کی وساطت سے جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا۔ بعد میں جب یہ خلافت باقی نہ رہی اور دین اور سیاست میں تفریق پیدا ہو گئی تو ”اللہ اور رسولؐ“ کی اطاعت کے ایک نئے مفہوم کی ضرورت پڑی۔ اللہ کی

دور ملوکیت میں

---

*بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی (علامہ محمد الخضری مرحوم) شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ صفحہ ۱۶۳۔

**تاریخ فقہ اسلامی صفحہ ۶۴-۱۶۳، اسی کتاب میں چاروں حدیثیں موجود ہیں۔

اطاعت کے متعلق سمجھ لیا گیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ھے۔ باقی رھی رسولؐ کی اطاعت تو، اس کا ذریعہ سوائے احادیث رسول اللہؐ کے اور کیا ھو سکتا تھا۔ اس کے لئے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اب اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت نے، دو مستقل (جداگانہ) اطاعتوں کی شکل اختیار کرلی۔ رسولؐ کی اطاعت کو، اللہ کی اطاعت کی طرح، مستقل اور غیر متبدل حیثیت دینے کے لئے، یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو قرآن کریم کے اندر ھے اور دوسری احادیث کے مجموعوں میں۔ اول الذکر کا نام وحی متلو رکھا گیا اور ثانی الذکر کا وحی غیر متلو۔ یہ اصطلاحات اُسی زمانہ کی وضع کردہ ھیں۔ رسول اللہؐ اور خلافت راشدہ کے زمانے میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع ھوا کہ حدیث رسول اللہؐ قرآن کریم کو منسوخ بھی کر سکتی ھے۔ لہذا مستقل اور غیر متبدل حیثیت، احادیث کی رہ گئی۔

فقہ

لیکن زمانے کے تقاضے اس قدر بڑھتے جا رھے تھے کہ نئے معاملات کے متعلق احادیث میں بھی فیصلے نہیں ملتے تھے۔ اس کے لئے ائمہ فقہ نے اجتہاد شروع کیا اور نئے نئے معاملات کے متعلق قرآن کریم اور حدیث کی روشنی میں احکام مستنبط کرنے لگے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے ان اجتہادی فیصلوں (یعنی فقہ) نے بھی مستقل اور غیر متبدل پوزیشن اختیار کرلی اور قرآن و حدیث دونوں ان کے تابع ھو گئے۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ نے یہ کہہ دیا کہ

> ھر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ھو جس پر ھمارے اصحاب ھیں، وہ یا تو ماوّل ھے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ھو وہ ماوّل یا منسوخ ھے۔ (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی صفحہ ۴۲۱)

یہی سلسلہ امت میں آج تک جاری ھے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ یہ صورتِ حالات کیوں پیدا ھوئی؟ فقط اس چیز کے باقی نہ رھنے سے جو الدین کی عمارت کی

پس چہ باید کرد

بنیاد تھی۔ یعنی خلافت علیٰ منہاجِ رسالت —— جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں (مسلمانوں کی مملکت نہیں، بلکہ اسلامی مملکت)۔ وہ مملکت جو اس نقشہ پر قائم ہو جسے رسول اللہؐ نے مرتب فرمایا تھا۔ یعنی جس میں قرآن کریم کے غیر متبدل قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، پیش آمدہ معاملات کے فیصلے باہمی مشاورت سے طے پائیں۔ یہی وہ نظام ہے جس کے احیاءؔ کے لئے میں کوشاں ہوں۔ جب یہ نظام قائم ہو گیا تو پھر نہ کوئی فرقہ باقی رہے گا اور نہ فقہ اور حدیث کے موجودہ جھگڑے۔ اس لئے کہ یہ تمام فرقے اور جھگڑے، دین (نظام مملکت) کے، انفرادی مذہب بن جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں —— دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں فرقے نہ ہوں۔ لہذا جب تک اسلام بھی "مذہب" رہے گا اس وقت تک فرقے بھی موجود رہیں گے —— جب یہ الدین میں تبدیل ہو جائے گا تو پھر امت میں وہی وحدت پیدا ہو جائے گی جو اُس زمانے میں موجود تھی جب یہ الدین کی شکل میں متشکل تھا۔ اُس وقت اُمت وہی فرائض انجام دے گی جو رسول اللہؐ سر انجام دیتے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس مقام پر رسول اللہؐ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ ($\frac{۷}{۱۵۷}$) "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے"۔ اور دوسری جگہ یہی فریضہ امت کا بتایا گیا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ($\frac{۳}{۱۰۹}$) "تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو۔ اور منکر سے روکتے ہو"۔ اس لئے کہ ختم نبوت کے بعد، اسی امت کو وارث قرار دیا گیا ہے ($\frac{۳۵}{۳۲}$)۔ اس کتاب کی وارث امت کو فرائضِ رسالت سر انجام دینے ہوں گے۔ جب یہ ان فرائض کو سر انجام دے گی، اسلام پھر اپنی حقیقی شکل میں سامنے آجائے گا۔ والسلام

فروری ۱۹۶۰ء پرویز

چوالیسواں خط

ضبط ولادت

(FAMILY PLANNING)

[''سلیم کے نام خطوط'' کی اس جلد کو سابقہ خط کے ساتھ ختم ھوجانا چاھئے تھا۔ لیکن اس دوران میں' عنوان بالا پر، ایک مقالا شائع ھؤا ھے جس کی اھمیت کا تقاضا ھے کہ اسے اس جلد میں شامل کیا جائے۔ بالخصوص اس لئے کہ اس جلد میں ''جنسیات کا تمدن پر اثر'' کے عنوان سے جو خط شائع ھو رھا ھے، ضبط ولادت اسی کی کڑی ھے۔ امید ھے قارئین اس اھمیت کے پیش نظر، ترتیب کی اس بے ربطی سے درگذر فرمائینگے]

طلوع اسلام

تم نے ٹھیک کہا ھے، سلیم کہ آجکل دنیا میں، جس مسئلہ نے (ایٹم بم کے بعد) اقوام عالم کی توجہات کو سب سے زیادہ اپنی طرف مرکوز کر رکھا ھے وہ برتھ کنڑول یا ضبط ولادت ھے۔ اس سے پہلے، ضبط ولادت کے آلات وادویات یا طرق وذرائع محض انفرادی دلچسپی کا موجب تھے۔ لیکن اب انھوں نے اجتماعی حیثیت اختیار کر لی ھے اور اسی نسبت سے اس مسئلہ کی اھمیت بھی بڑھ گئی ھے۔ آس وقت مانع حمل تدابیر بالعموم اس مقصد کے لئے استعمال کی جاتی تھیں کہ ناجائز جنسی اختلاط پر مہر تصدیق ثبت نہ ھونے پائے۔ اس میں شبہ نہیں

کہ اُس وقت یہ تدابیر بعض حالات میں جائز مقاصد کے لئے بھی استعمال کی جاتی تھیں —— مثلاً بیوی کی صحت کے پیش نظر —— لیکن ان کا عمومی مقصد ناجائز تعلقات کے نتائج و عواقب سے محفوظ رہنا ہی تھا۔ اب اس مسئلہ نے اور شکل اختیار کر لی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس رفتار سے دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے، زمین کی پیداوار (یعنی سامان خوردو نوش) میں اس نسبت سے اضافہ نہیں ہو رہا —— نہ ہی سردست (یا یوں کہیئے کہ فوری طور پر) ایسا کیا جانا ممکن ہے۔ اس لئے خدشہ یہ ہے کہ اگر صورت حالات کچھ وقت تک یہی رہی تو دنیا بھوک سے مرجائے گی۔ اس مشکل اور خدشہ کے پیش نظر سوچا یہ جا رہا ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے آبادی کا یہ بے محابا اضافہ محدود ہو جائے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی (یا Family Planning) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ (جس طرح آجکل ہمارے ہاں ہو رہا ہے) ایک میاں بیوی کے ہاں جتنے بچے پیدا ہو سکتے ہیں، ہوتے چلے جائیں، بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ملک میں سامان خوراک کی نسبت سے، بچوں کی تعداد کی حد بندی ہو جائے۔

دیگر اقوام عالم اس مسئلہ پر قومی مصالح کی روشنی میں غور و فکر کر رہی ہیں۔ یعنی وہ یہ سوچتی ہیں کہ اس سوال کا قومی معیشت، ملکی سیاست اور عوام کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ لیکن تم جانتے ہو سلیم! کہ ہمیں اس پر (ان مصالح کے علاوہ) ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنا ہوگا۔ یعنی یہ کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہے؟ ہمارے مذہبی طبقہ میں، اس سلسلہ میں دو گروہ سامنے آرہے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ ضبطِ ولادت بالکل جائز ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ قطعاً ناجائیز ہے۔ اس حد تک ناجائز کہ

> ایسی کوئی تحریک اگر آنحضرتؐ کے سامنے اٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اس کے خلاف ایسا ہی جہاد کرتے جیسا شرک و بت پرستی کے خلاف آپؐ نے کیا۔

(ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۰ء۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

جو گروہ ضبط ولادت کو جائز قرار دیتا ھے وہ اپنے خیال کی تائید میں ان احادیث کو پیش کرتا ھے جن میں کہا گیا ھے کہ نبی اکرمؐ نے عزل* کی اجازت دی تھی۔ دوسرا گروہ ان احادیث کی صحت سے تو انکار نہیں کرتا لیکن کہتا یہ ھے کہ

> عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ھیں ان کی حقیقت بس یہ ھے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریاں بیان کیں اور آنحضرتؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبی(ؐ) سے حدیث میں منقول ھیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا بھی ھے تو وہ ھرگز ضبط ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کارفرما ھے۔ (ایضاً)

لیکن سلیم! میں کہتا ھوں کہ عزل سے متعلق روایات سے اس مسئلہ کے جواز یا عدم جواز کی سند پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ھے۔ اس لئے کہ یہ روایات پکار پکار کر کہہ رھی ھیں کہ نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اطہر کی طرف ان کی نسبت کسی طرح بھی صحیح نہیں ھو سکتی۔ یعنی ان روایات کا مضمون بتا رھا ھے کہ یہ وضعی ھیں۔ حضورؐ نے ایسا کبھی نہیں فرمایا ھوگا۔ عزل سے متعلق بخاری کی ایک روایت میں ھے

> حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ھے کہ ایک دن وہ نبیؐ کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ھم (جہاد میں) قید کی ھوئی لونڈیوں سے جماع کرتے ھیں۔ چونکہ ھم ان کو بیچنا چاھتے ھیں (اس لئے یہ نہیں چاھتے کہ وہ حاملہ ھو جائیں) پس آپ عزل کی نسبت کیا رائے دیتے ھیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کیا تم لوگ ایسا کرتے ھو؟ تم کو کچھ مجبوری نہیں ھے اگر

---

* جنسی اختلاط تو کرنا لیکن مادۂ تولید کا انزال رحم کے اندر نہ ھونے دینا۔

> تم ایسا نہ کرو۔ اس لئے کہ جس جان کا پیدا کرنا اللہ نے مقدر کر دیا ہے وہ ضرور پیدا ہوگی**۔

دوسری روایت ہے کہ

> ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید کو دیکھا ہے اور میں نے ان سے (کچھ) دریافت کیا تھا تو انھوں نے کہا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہم نبی (ؐ) کے ہمراہ گئے تو ہم نے عرب کے قیدیوں میں سے کچھ قیدیوں کو پایا۔ پھر ہمیں عورتوں کی خواہش ہوئی اور تجرد نے ہم پر غلبہ پا لیا تو ہم نے عزل کی خواہش کی۔ پس ہم نے رسولِ خدا (ؐ) سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو تم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ قیامت تک جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہوگی*۔

یہ روایات کسی تبصرہ، اور اپنے وضعی ہونے کے لئے، کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ میرے نزدیک انہیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی جسارت اور حضورؐ کی شانِ اقدس میں انتہائی سوء ادبی ہے۔

مذہبی طبقہ کی طرف سے ضبط ولادت کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہیں کہ:-

(۱) اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔
(۲) یہ قتلِ اولاد ہے جو اسلام میں بہت بڑا جرم ہے۔
(۳) بھوک کے خوف سے ایسا کرنا، خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ہے۔

** بخاری جلد اول۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی صفحہ ۴۹۲۔

* بخاری جلد اول۔ ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی۔ صفحہ ۵۷۳

قبل اس کے کہ اس سوال (ضبطِ ولادت) کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے، مختصر طور پر مندرجہ بالا اعتراضات کا جائزہ لینا ضروری ھے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ ھے کہ اس سے حرامکاری کے دروازے کھل جاتے ھیں۔ اول تو یہ دیکھو سلیم! یہ اعتراض ''ضبط ولادت'' کے خلاف نہیں بلکہ ان تدابیر کے خلاف ھے جو عام طور پر اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی ھیں۔ سوال یہ ھے کہ اگر کوئی شخص ضبط ولادت کا مسلک اختیار کرتا ھے لیکن حرامکاری سے بچا رہتا ھے، تو اس کا یہ مسلک اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیسا ھوگا۔ اگر یہ مسلک جائز ھوگا تو پھر ضبط ولادت کے خلاف کوئی اعتراض نہیں ھونا چاھئیے۔ اعتراض ان تدابیر کے خلاف ھونا چاھیئے جن سے حرامکاری کے پھیلنے کا اندیشہ ھو۔ اور اگر ضبط ولادت، بہرحال ناجائز ھے تو پھر یہ سوال ھی پیدا نہیں ھونا چاھیئے کہ اس کے لئے ذرائع کس قسم کے استعمال کئے جاتے ھیں۔ اگر ضبط ولادت ناجائز نہیں، اور ملک کے اجتماعی مصالح کے پیش نظر اس کا اختیار کیا جانا ضروری ھے تو پھر سوچنا یہ چاھیئے کہ

(i) اس کے لئے ذرائع ایسے اختیار کئے جائیں جو حرامکاری پھیلانے کا سبب نہ بن سکیں۔ اور

(ii) اگر سردست ایسے ذرائع میسر نہیں آسکتے، تو ایسی تدابیر اختیار کرنی چاھئیں جن سے لوگ ان ذرائع کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

یہ دلیل کہ چونکہ لوگ ان ذرائع کا غلط استعمال کریں گے اس لئے اصل مقصد ھی کو ختم کر دینا چاھیئے، جس قسم کا وزن رکھتی ھے، اھل علم و دانش کے لئے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسا ھی ھے جیسے (مثلاً) یہ تجویز کیا جائے کہ چونکہ لوگ بلا ٹکٹ سفر کرتے ھیں اس لئے ریلوں کو بند کر دیا جائے۔ یا عورتیں مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر خود کشی کر لیتی ھیں، اس لئے مٹی کے تیل کا استعمال (بلکہ یوں کہیئے کہ ماچس کا استعمال) ممنوع قرار دے دیا جائے۔ یا ملک میں آئے دن چاقو چلنے کی وارداتیں ھوتی رہتی ھیں اس

لئے چاقو بننے بند کر دینے چاھیئں ۔ حتیٰ که اس دلیل کو اور آگے بڑھایا جائے تو کھه دیا جا سکتا ھے که چونکه حرامکاری بھرحال عورتوں کی موجودگی سے ھوتی ھے اس لئیے حرامکاری کو بند کرنے کے لئے تمام عورتوں کو ملک بدر کر دیا جائے !

جیسا که اوپر کھا گیا ھے ، اگر ضبط ولادت فی نفسهٖ ناجائز نھیں ، تو پھر ھمارے لئے سوچنے کی بات صرف یه ھوگی که اس مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کیا اختیار کئے جائیں ۔ اور وہ کون سی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان ذرائع کا غلط استعمال نه ھو ۔

دوسرا اعتراض یه ھے که یه ''قتل اولاد'' ھے ۔ یعنی اگر جنسی اختلاط کیا جائے اور حمل قرار نه پانے دیا جائے تو اس کا مطلب یه ھے که ھم اپنی اولاد کو قتل کرتے ھیں ۔ یه اعتراض بے حد کمزور ھے ۔ اولاً یه که جو بچه وجود ھی میں نھیں آیا اسے قتل کس طرح کیا جا سکتا ھے ؟ اگر یه کھا جائے که انسان کے مادۂ تولید میں بچه بن جانے کی صلاحیت ھوتی ھے ۔ اگر استقرارِ حمل روک دیا جائے تو وہ صلاحیت محسوس پیکر اختیار نھیں کرتی اس لئے یه قتلِ اولاد ھے ۔ تو اس دلیل کا بوداپن واضح ھے ۔ مثلاً

(۱) اگر ایک شخص جوان ھو جانے کے باوجود ، نکاح نھیں کرتا ۔ یا دیر میں نکاح کرتا ھے تو اسے بھی قتل اولاد کا مرتکب قرار پاجانا چاھیئے ۔ اس لئے که اس نے اپنے اس عمل سے ، نه معلوم کتنے بچوں کو وجود میں آنے سے روک دیا !

(۲) مادۂ تولید کے ایک قطرہ میں کروڑوں نھیں تو لاکھوں جرثومے ھوتے ھیں جن میں سے ھر جرثومه میں بچه بن جانے کی صلاحیت ھوتی ھے ۔ اول تو یه بھی نھیں ھوتا که ھر جنسی اختلاط پر بالضرور حمل قرار پا جائے ۔ اس صورت میں ، ھر اختلاط سے لاکھوں بچے قتل ھو جاتے ھیں ۔ اور جب حمل قرار پا جائے تو ، ان لاکھوں جرثوموں میں سے ، صرف ایک جرثومه بچه کی صورت اختیار کرتا ھے

(یا زیادہ سے زیادہ دو تین جرثومے)۔ باقی تمام جرثومے ضائع چلے جاتے ھیں۔ ان جرثوموں کو بھی ھلاک شدہ اولاد تصور کرنا چاھیئے۔

(۳) استقرار حمل کے بعد جنسی اختلاط تو بہرحال قتل اولاد قرار پا جائے گا۔ کیونکہ اس کے بعد تمام جرثومے ضائع ھو جاتے ھیں۔ نیز اگر میاں بیوی میں سے کوئی عقیم (بانجھ) ھو تو فریق ثانی کے تمام حیات آور جرثومے مستقلاً ضائع ھو جاتے ھیں۔ کیا اسے بھی قتل اولاد تصور کیا جائے گا۔

ان اعتراض کرنے والوں کی کوتاہ نظری پر غور کرو۔ یہ لوگ ان بچوں کے ”قتل“ پر تو ماتم کرتے ھیں جو وجود ھی میں نہیں آتے لیکن ان بچوں کی طرف ان کی نگاہ قطعاً نہیں اٹھتی جو (غذا کی کمی کی وجہ سے) کمزور پیدا ھوتے ھیں۔ کیڑوں مکوڑوں کیطرح گلیوں کی گندی نالیوں میں رینگتے پھرتے ھیں اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ھو کر مر جاتے ھیں۔ یہ محض اس لئے ھوتا ھے کہ ان کی پرورش اور خوراک کا مناسب انتظام نہیں ھو سکتا۔ یہ حضرات بچوں کے اس اسطرح قتل کو تو قابل اعتراض نہیں سمجھتے لیکن بچوں کو وجود میں نہ لانے کو جرم عظیم قرار دیتے ھیں۔ اگر اتنے ھی بچے پیدا ھوں جتنوں کی عمدہ پرورش ھو سکے تو اسطرح بچوں کا قتل واقعہ ھی نہ ھو۔

اب تیسرے اعتراض کو لو۔ یعنی یہ کہ بچوں کی پیدائش پر حد بندی کے معنی یہ ھیں کہ ھمیں اللہ کی رزاقیت پر ایمان نہیں۔ یہ سوال نسبتاً تفصیلی گفتگو چاھتا ھے۔

قرآن کریم میں ھے وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔ (۱۷/۳۱؛ ۶/۱۵۲) ”اور تم اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ھم انہیں بھی رزق دیتے ھیں اور تمہیں بھی“۔ اس سے بھی وسیع مفہوم میں دوسرے مقام پر ھے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) ”زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق

اللہ کے ذمہ نہ ھو’’۔ ان اور انہی جیسی دیگر آیات کو اس خیال کی تائید میں پیش کیا جاتا ھے کہ جب رزق کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ھے تو پھر اس خیال سے، کہ اگر آبادی زیادہ ھو گئی تو انہیں کھانے کو نہیں ملے گا، پیدائش پر تحدید خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ھے۔ ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ھے، اسکی بابت میں تمہیں شرح و بسط سے متعدد بار لکھ چکا ھوں۔ اس لئے اس کا بار بار دھرانا ضروری نہیں۔ تم اس مقام پر صرف یہ دیکھو کہ جو مطلب ھمارا مذھب پرست طبقہ لیتا ھے، اس کا عملی نتیجہ کیا ھے۔ مثلاً

(۱) یہ حقیقت ھے کہ دنیا کی (کم از کم) آدھی آبادی ایسی ھے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اور جب قحط پڑتا ھے تو لاکھوں افراد بھوک سے مرجاتے ھیں۔ سوال یہ ھے کہ جب تمام مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے لے رکھی ھے تو اس قدر مخلوق خالی پیٹ کیوں سوتی ھے اور اتنی آبادی بھوک سے کیوں مرجاتی ھے؟

(۲) کہا جائے گا کہ یہ لوگ حصولِ رزق کے لئے کوشش نہیں کرتے۔ لیکن یہ بھی غلط ھے۔ قحط کے زمانے میں ھزار کوشش کے باوجود کچھ نہیں ملتا۔ اور عام حالات میں بھی کیفیت یہ ھے کہ (مثلاً) ایک مزدور دن بھر محنت کرتا ھے۔ شام کو اسے دو روپے ملتے ھیں۔ اس کی ایک بیوی اور آٹھ بچے ھیں۔ دو روپے میں اتنا آٹا نہیں ملتا جس سے ان افراد خاندان کا دو وقت پیٹ بھر سکے۔ اس لئے انہیں ایک وقت فاقہ کرنا پڑتا ھے۔

(۳) اس پر یہ لوگ کہدیں گے کہ یہ ملک کا غلط معاشی نظام ھے جس کی وجہ سے اس مزدور کو اتنا نہیں ملتا جس سے اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ اسے اجرت اتنی ملنی چاھیئے جس میں اس کا گذارہ ھو جائے۔

لیکن یہ کہنے سے یہ حضرات نہیں سوچتے کہ اس سے یہ خود ’’خدا کی رزاقیت‘‘ سے نیچے اتر کر، انسانوں کے معاشی نظام کی طرف آجاتے ھیں۔ سوال یہ ھے کہ کیا یہ چیز خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی نہیں؟ ان حضرات کے

مسلک کی رو سے یه چیز یقیناً خدا کی رزاقیت پر ایمان کے منافی ھے ۔ لیکن تم جب ان آیات کے صحیح مفہوم کو سامنے لاؤ گے تو اس نتیجه پر پہنچ جاؤ گے که یه چیز خدا کی رزاقیت کے منافی نہیں ۔ ان آیات سے مفہوم ھی یه ھے که ملک کا معاشی نظام ایسا ھونا چاھیئے جو خدا کی اس ذمه داری کو اپنے اوپر لے لے اور افراد مملکت کو اطمینان دلا دے که ان کے رزق کی ذمه داری مملکت کے سر ھے ۔

اب ایک قدم آگے بڑھو! اگر صورت حالات ایسی ھو که ، مملکت کی تمام کوششوں کے باوجود ، ملک میں اتنی پیداوار نه ھو سکے جس سے تمام آبادی کو ضرورت کے مطابق رزق مل سکے اور مملکت کے پاس اتنے ذرائع بھی نه ھوں که باقی مانده ضرورت پوری کرنے کے لئے باھر سے غله منگا سکے ، اور اس کے ساتھ ھی ملک کی آبادی میں بے محابا اضافه ھوتا جارھا ھو تو ایسی صورت میں وه مملکت کیا کرے ؟ کیا ایسی صورت میں یه بہتر ھوگا که آبادی بے حد و نہایت بڑھتی اور بھوک سے مرتی جائے یا یه که آبادی کے بڑھنے کی حد بندی کر دی جائے تا که لوگوں کو بافراط رزق مل جائے؟ ھمارا مذھب پرست طبقه کہتا ھے که پہلی صورت اسلام کی تعلیم اور منشائے خداوندی کے مطابق ھے اور دوسری شکل شریعت کی رو سے ناجائز۔ اس میں کلام نہیں که بہترین شکل یه ھوگی که ملک کی آبادی کی نسبت سے پیداوار بڑھائی جائے ، لیکن میں اسے پھر دھرانا چاھتا ھوں که اگر صورت ایسی پیدا ھو جائے که پوری کوشش کے باوجود ، ملک کی پیداوار ، آبادی کی بڑھتی ھوئی رفتار کا ساتھ نه دے سکے ، تو اُس وقت کیا کیا جائے ؟

ممکن ھے یه کہه دیا جائے که اگر تمام دنیا کی پیداوار اور آبادی کو سامنے رکھا جائے تو پیداوار ضرورت سے کم نہیں ھوگی۔ سو اول تو یه گفتگو محض قیاسی ھے ۔ اعداد و شمار پر مبنی نہیں ۔ (بلکه جس قدر اعداد و شمار مہیا ھو سکتے ھیں وه اس مفروضه کے خلاف جاتے ھیں) لیکن دنیا آجکل جسطرح اقوام کے دائروں میں بٹی ھوئی ھے ، اس کے پیش نظر ، ھر قوم کی اپنی اپنی ضرورت اور اسے پورا

کرنے کے اپنے اپنے ذرائع ہیں۔ جن اقوام کے پاس فاضلہ پیداوار ہوتی ہے وہ، اس کی قیمت وصول کئے بغیر، دوسری اقوام کو نہیں دیتیں — اور اس کی قیمت میں جو کچھ دینا پڑتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے — اس لئے سردست ساری دنیا کی پیداوار اور آبادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب، قرآنی تصور کے مطابق، تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کر لے گی اور ”مافی السمٰوٰت والارض“ انسان کے زیر تسخیر آجائے گا، اُس وقت رزق کی کمی کا مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ بحالات موجودہ اس کا کیا حل ہے؟

آؤ اب دیکھیں کہ ”ضبط ولادت“ کے معاملہ میں قرآن کریم سے ہمیں کیا راہ نمائی ملتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لو سلیم! کہ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ تم ساری عمر بچے پیدا کرتے رہو اور اگر کسی نے اس میں کوتاہی کی، یا ایک حد تک پہنچ کر رک گیا، تو قیامت میں اس سے باز پرس کی جائے گی۔ انسان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے لیکن جس طرح دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کو بہرحال عندالضرورت استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح اسے بھی ضرورت کے مطابق استعمال کیا جائے گا۔ اگر کسی کے بازوؤں میں قوت ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ ہر وقت ضرورةً یا بلا ضرورت اس قوت کو استعمال کرتا رہے۔ اسے بہرحال عندالضرورت ہی استعمال کیا جائے گا۔ یہی کیفیت دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کی ہے۔ ان کا بلاضرورت استعمال اسراف و تبذیر ہے جس کی قرآن کریم میں سخت ممانعت آئی ہے۔ لہذا اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو اس وقت بروئے کار لانا چاہیئے جس وقت اولاد پیدا کرنے کی ضرورت ہو۔ اب رہا اولاد کی ضرورت کا سوال! سو اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے بیوی بچوں کی محبت کو وجہٴ جاذبیت بتایا ہے (وہ رہبانیت کی زندگی بسر بسر کرنا نہیں سکھاتا)۔ لیکن اس نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اولاد پیدا کرنے کا سلسلہ متواتر جاری رکھو۔ یعنی جب ایک بچہ پیدا ہو جائے تو دوسرے بچے کی

پیدائش کی بنیاد فوراً رکھ دو۔ بچوں کو عندالضرورت پیدا کرنا ہی اس صلاحیت کا صحیح استعمال ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مفہوم ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) ”تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتی (کے بمنزلہ) ہیں۔ سو تم اپنی کھیتی میں جب چاہے آؤ“۔ کھیتی کی تشبیہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ عورتیں اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہیں۔ اور ”جب چاہو“ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کھیت میں عندالضرورت فصل اگائی جاتی ہے اسی طرح اولاد بھی عندالضرورت پیدا کی جائے گی۔ مثلاً کھانے پینے کے معاملہ میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (۲/۵۸) ”تم اس سے جب جی چاہے بافراغت کھاؤ“۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ”عندالضرورت کھانا“ ہی ہے نہ کہ ہر وقت کھاتے رہنا۔ (اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر آئے گی)۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ تم مسلسل بچے پیدا کرتے رہو۔ نہ ہی فطرت نے انسان کو حیوانوں کی طرح مجبور کیا ہے کہ ایک وقت کے بعد اسے ضرور بچہ پیدا کرنا ہوگا۔ انسان کے ہاں بچے عندالضرورت پیدا کئے جائیں گے۔ اسی کو خاندانی منصوبہ بندی یا (Family Planning) کہتے ہیں۔ اگر بیوی کی صحت خراب ہے تو آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ ضرور بچہ پیدا کریں۔ اگر (موجودہ معاشی نظام میں) آپ کی آمدنی اتنی نہیں کہ آپ زیادہ بچوں کی کفالت کر سکیں تو آپ بچوں کی تعداد پر خود حد بندی عاید کر سکتے ہیں۔ یہ انفرادی مثالیں ہیں۔ اگر اجتماعی مصالح کا تقاضہ ہے کہ ملک میں زیادہ بچے پیدا نہ ہوں تو افزائش نسل کی تحدید کی جا سکتی ہے۔ اگر اجتماعی مصالح کی خاطر، خوراک کا راشن کیا جا سکتا ہے (اور راشن اس کے سوا اور کیا ہے کہ خوراک کی حد بندی کر دی جاتی ہے) اگر جانوروں کی کمی کی وجہ سے ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کیا جا سکتا ہے تو اسی قسم کے ہنگامی حالات میں بچوں کی تعداد پر حد بندی کیوں نہیں عائد کی جا سکتی؟ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ایک شخص کے انفرادی ذوق کو ٹھیس

لگتی ھے (یعنی اس کا جی چاھتا ھے کہ اس کے ھاں زیادہ بچے ھوں)۔ لیکن اجتماعی مصالح کی خاطر، انفرادی ذوق کا کسی حد تک ایثار کرنا ھی پڑتا ھے۔ کتنے لوگ ھیں کہ ھفتہ بھر کے راشن کی شکر، ان کے ایک دن کے ذوق کی تسکین بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن اجتماعی ضرورت کے لئے انھیں راشن قبول کرنا پڑتا ھے۔ البتہ مستثنیات کی ھر قانون اور قاعدے میں رعایت رکھی جاتی ھے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں ضبط ولادت (یا خاندانی منصوبہ بندی) کی اسکیم بالضرور نافذ ھونی چاھیئے۔ مطلب یہ ھے کہ اگر تمام حالات کا جائزہ لینے اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے پوری پوری کوشش کے بعد بھی حالات ایسے ھوں جن میں آبادی کی تحدید ناگزیر ھو جائے، تو اس صورت میں اس قسم کا اقدام، قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ھوگا۔

اب میں اس سوال کی طرف آتا ھوں کہ اس کے لئے (عندالضرورت) ذرائع کیا اختیار کئے جائیں۔ یہ سوال بڑا اھم ھے اور گہری توجہ کا محتاج۔ اس لئے کہ اس میں بنیادی نقطہ ایسا ھے جو شاید تمھارے سامنے پہلی مرتبہ آئے اور چونکہ وہ ھمارے عام تصور اور دنیا و جہان کی روش کے خلاف دکھائی دے گا، اس لئے اگر تم نے اسے سطحی نظر سے دیکھا تو بات کی تہہ تک پہنچنا مشکل ھوگا۔

ھمارے ھاں ازدواجی زندگی کا بنیادی مقصد، جنسی اختلاط ھوتا ھے*۔ باقی مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ھیں۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اس کا بنیادی مقصد، رفاقت (Companionship) ھے (زوج کا مفہوم ھی یہ ھے)۔ وہ واضح الفاظ میں بتاتا ھے کہ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۳۰/۲۱)۔ ”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ھے کہ اس نے خود تم میں سے تمھاری ازواج پیدا کیں

---

* یہی وجہ ھے کہ رخصتی کے بعد اس جوڑے کی پہلی ملاقات، جنسی اختلاط پر منتج ھوتی ھے۔

تاکہ تمہیں ان سے سکون حاصل ہو۔ اور اس نے تم میں محبت اور رحمت پیدا کی۔ یقیناً اس حقیقت میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں''۔ یعنی محض جذباتی نگاہ سے دیکھو تو سلسلۂ ازدواج جنسی جذبات کی تسکین اور افزائش نسل کا ذریعہ دکھائی دے گا۔ لیکن ذرا فکر کی آنکھ سے دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ اس سے مقصود رفاقت باہمی، سکون، محبت اور رحمت ہے۔ جنسی جذبات کی تسکین یا افزائش نسل ثانوی چیز ہے۔

اس کے بعد جنسی جذبہ کی طرف آؤ۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ابن آدم کے کان میں یہ افسوں کچھ اس طرح پھونکا کہ اس کی ساری تاریخ اس سے متاثر چلی آرہی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے میں تمہیں ایک خط میں تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ کہ ''انسانی فطرت'' کا تصور فریب سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت، مجبور اشیاء کی روش زندگی کا نام ہے۔ جو صاحب اختیار ہو اس کی فطرت کیا؟ البتہ اس کی طبعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں، اور اس کے بعد بلند انسانی زندگی کے مقاصد۔ جہاں تک طبعی تقاضوں کا تعلق ہے وہ حیوانات اور انسان میں مشترک ہیں۔ بھوک اور پیاس انسان کے طبعی تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) تم کسی گہری سوچ میں منہمک ہو۔ تمہیں پیاس لگتی ہے۔ اس تقاضے کی ابتدائی منازل میں تم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تقاضا آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تاآنکہ یہ تمہارے انہماک پر غالب آجاتا ہے۔ اگر تم اس پر بھی اس کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہنچاتے (پانی نہیں پیتے) تو تم بیمار ہو جاتے ہو۔ اس پر بھی پانی نہیں پیتے تو تمہاری موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی حالت بھوک کے تقاضے کی ہے، اگرچہ اس میں موت نسبتاً زیادہ وقت کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اس سے تم نے دیکھا کہ طبعی تقاضے، جسم کی ضرورت کے ماتحت، از خود ابھرتے ہیں اور اگر ان کی تسکین نہ کی جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اور آخر الامر مر جاتا ہے۔ تم سوچو سلیم! کہ کیا جنسی تقاضا بھی اسی قسم کا ہے؟ بادنیٰ تعمق تم اس نتیجہ پر پہنچ

جاؤ گے کہ یہ تقاضا اس قسم کا نہیں ۔ یہ کبھی نہیں ہوتا ——— ساری عمر میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا ——— کہ تم اپنے کام یا خیالات میں منہمک ہو اور جنسی تقاضا (پیاس کی طرح) از خود ابھر آیا ہو۔ یہ تقاضا کبھی نہیں ابھرتا جب تک تم اسے خود نہ ابھارو۔ یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جب تک تمہارے خیالات اسے بیدار نہ کریں ۔

حیوانات میں یہ تقاضا از خود بیدار ہوتا ہے لیکن صرف اس وقت جب ان سے فطرت نے افزائش نسل کا کام لینا ہوتا ہے ۔ تم سانڈ کو دیکھو۔ وہ سال بھر گایوں کے گلے میں پھرتا رہے گا لیکن نہ کبھی کوئی گائے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گی ، نہ وہ خود اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ لیکن جب ان کے اختلاط کا موسم (Mating Season) یا وقت آئے گا تو یہ جذبہ ازخود بیدار ہو جائے گا اور اختلاط کے بعد ازخود سو جائے گا۔ تم نے دیکھا کہ وہاں بھی یہ جذبہ بھوک اور پیاس کے جذبات کی طرح نہیں ۔ یہ صرف اس وقت بیدار ہوتا ہے جب اس سے افزائش نسل مقصود ہو۔

لیکن انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان ان تقاضوں کو اپنے اختیار سے ابھار سکتا ہے ۔ تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ فطرت نے حیوان اور انسان میں یہ فرق کیوں رکھا ہے ؟ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ فطرت اولاد پیدا کرنے کے معاملہ میں انسان کو ، حیوانات کی طرح ، مجبور نہیں رکھنا چاہتی ۔ حیوانات کو جب ”اُدھر کا اشارہ *“ ہوتا ہے تو وہ اولاد پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ لیکن انسان کے معاملہ میں فطرت ایسا نہیں کرنا چاہتی ۔ وہ اس معاملہ کو انسان کے اختیار میں دیدیتی ہے کہ وہ جب اولاد پیدا کرنا چاہے ، اپنی مرضی سے اس جذبہ کو ابھارے اور افزائش نسل کی صلاحیت کو بروئے کار لے آئے ۔

---

* چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے (غالب)

لیکن انسان، جس طرح دیگر معاملات میں اپنے اختیار کو ناجائز استعمال کرتا ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی کرتا ہے۔ فطرت نے اس کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں یہ التزام بھی رکھا ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے ساتھ کچھ لذت بھی مل جائے۔ مثلاً غذا سے مقصود، جسم کی پرورش ہے لیکن فطرت نے غذاؤں میں لذت بھی رکھ دی ہے۔ اب دیکھو کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا ہے؟ اس نے ضرورت کے پہلو کو محض بامر مجبوری ساتھ رکھا ہے اور لذت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے (کھاتے پیتے گھرانوں میں) کھانوں میں ایک فیصد ”ضرورت“ کا پہلو ہوتا ہے تو ننانوے فیصد لذت کا۔ حصول لذت ممنوع نہیں، بشرطیکہ لذت ضرورت کے تابع رہے۔ نہ کہ مقصود بالذات بن جائے۔ جس طرح انسان نے، اپنے اختیار و ارادہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، کھانے پینے کے معاملہ میں لذت کو مقدم قرار دے لیا اور ضرورت کو مؤخر اسی طرح اس نے جنسی صلاحیت کے ساتھ کیا۔ وہ صلاحیت ملی تھی افزائش نسل کی خاطر (جس کے ساتھ فطرت نے لذت بھی شامل کر دی تھی) لیکن اس نے جنسی لذت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور ضرورت کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس نے ضرورت کے عنصر کو خارج ہی کر دینا چاہا اور لذت ہی لذت کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ (بعینہٖ جس طرح تم نے بعض لوگوں کے متعلق سنا ہوگا کہ وہ لذیذ ترین غذائیں کھاتے ہیں۔ اور جب پیٹ بھر جاتا ہے تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتے ہیں۔ اور پھر کھانے لگ جاتے ہیں)۔ ضرورت کے عنصر کو خارج کرکے، محض لذت کو مقصود بنا لینا ایسی ”جنسی بد نہاد“ (Sex Perversion) پیدا کر دیتا ہے جس کی آخری حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ عام زناکاری اس کی ابتدائی شکل ہے جس میں ضرورت (یعنی اولاد پیدا کرنے کے مقصد) کو خارج کرکے خالص لذت کو مقصود بنا لیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد حصولِ لذت کے سینکڑوں طرق و اطوار ایجاد و اختیار کئے جاتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ جنسی صلاحیت کا مقصد افزائش نسل ہے۔ اس مقصد کو چھوڑ کر اسے محض حصول لذت کے لئے استعمال کرنا مقصد فطرت کے خلاف ہے قرآن کریم نے جنسی اختلاط کے جائز و ناجائز ہونے کے لئے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں جو اس حقیقت کو نکھار کر سامنے لے آتی ہیں۔ وہ ان رشتوں کی فہرست دے کر جن سے نکاح حرام ہے، کہتا ہے کہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ ان سے اختلاط ”مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ“ ہو ($\frac{۴}{۲۴}$) ”محصنین“ کے معنی ہیں حفاظت سے رکھنا۔ قلعہ بند کر لینا۔ اور ”مسافحین“ کے معنی ہیں محض بہا دینے کی خاطر جنسی اختلاط کرنا۔ چونکہ نکاح اور زنا میں ابتدائی فرق یہ ہے کہ نکاح میں جنسی اختلاط سے مقصد، نطفہ کو رحم میں محفوظ کر دینا ہوتا ہے تاکہ اس سے افزائش نسل ہو، اور زنا میں کوشش کی جاتی ہے کہ لذت تو ملے لیکن نطفہ نہ ٹھہرے (وہ بہہ جائے) اس لئے قرآن کریم کی ان اصطلاحات کا اولیں مفہوم بالترتیب نکاح اور زنا ہے۔ لیکن اس سے قرآن کریم نے خود جنسی اختلاط کی نوعیت اور غایت کو بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی

(i) اگر جنسی اختلاط بلا نکاح ہے تو وہ ہر حال میں ناجائز ہے۔ اس سے مقصد محض حصولِ لذت ہوتا ہے۔

(ii) نکاح کے ساتھ، جنسی اختلاط سے مقصد افزائش نسل ہے۔ اگر یہ مقصد پیش نظر نہیں، اور اختلاط محض حصول لذت کے لئے ہے تو یہ فطرت کی عطا کردہ صلاحیت کا غلط استعمال ہے۔ اس صورت میں بیوی ”حرث“ (کھیتی) نہیں رہتی۔ عیاشی کا سامان بن جاتی ہے۔

(iii) اس صلاحیت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ نکاح کے بعد، جنسی اختلاط افزائش نسل کے لئے ہو۔ بیوی ”حرث“ (کھیتی) رہے۔ لذت کی خاطر جنسی صلاحیت ضائع کرنے کا آلہ بن کر نہ رہ جائے۔

اس سے ضبطِ ولادت کا سارا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ:۔

(الف) اولاد عندالضرورت پیدا کرنی چاہیئے۔ انسان کو اس باب میں اختیار ملا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ اور یہ تم نے اب دیکھ لیا ہے کہ

(ب) غیر منکوحہ عورت کے ساتھ جنسی اختلاط حرام ہے۔ اور

(ج) منکوحہ بیوی کے ساتھ اختلاط اس وقت مطابقِ مقصدِ فطرت ہے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو۔

لہذا جب اولاد پیدا کرنا مقصود نہ ہو، تو بیوی کے ساتھ جنسی اختلاط کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے، خاندانی منصوبہ بندی کے لئے نہ مانع حمل ادویات و تدابیر کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی مرد یا عورت کو بانجھ بنا دینے کی حاجت۔ وہ خود عائد، کردہ پابندی کے ماتحت، باہمی اختلاط سے مجتنب رہتے ہیں اور اس وقت تک مجتنب رہتے ہیں جب تک انہیں بچہ پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ اس میں نہ ''عزل'' کی ضرورت پڑتی ہے* اور نہ ہی مانع حمل تدابیر کے عام ہونے سے، حرامکاری کے بڑھ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔

مجھے اندازہ ہے کہ تم جھٹ سے کہہ دو گے کہ یہ ناممکن ہے۔ بیوی بھلی چنگی موجود ہو اور مرد برسوں تک اس کے پاس نہ جائے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی وہ مقام تھا جس کے متعلق میں نے شروع میں (Warning) دی تھی کہ چونکہ یہ بات تمہارے سامنے (غالباً) پہلی دفعہ آئے گی اور انوکھی سی معلوم ہوگی اس لئے تم نے سطحی طور پر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ جانا۔ گہرے غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔

---

* عزل افزائش نسل کے مقصد سے گریز اور لذت کے حصول کا اس زمانے کا وضع کردہ ذریعہ تھا جب ہنوز مانع حمل آلات وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب میں نے کہا تھا کہ عزل سے متعلق روایات کبھی نبی اکرمؐ کی احادیث نہیں ہو سکتیں تو اس کی وجہ کیا تھی۔ کیا تم اسے تصور میں بھی لاسکتے ہو کہ صحابہ کبار عزل کی اجازت مانگتے ہوں گے اور رسول اللہؐ اسکی اجازت دیتے ہوں گے؟ اور وہ بھی اس مقصد کے لئے کہ اگر لونڈیوں کو حمل قرار پاگیا تو ان کی قیمت کم ہوجائے گی۔ استغفراللہ!

یہ ناممکن نہیں سلیم ! ممکن ہے۔ اور ایسا ممکن کہ اس کے لئے تمہیں کسی کاوش و تردد کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ جنسی جذبات انسان کے اپنے خیال سے بیدار ہوتے ہیں۔ ازخود کبھی نہیں ابھرتے۔ اور انسان کے خیالات، اس کی تعلیم و تربیت اور عقائد و نظریات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ تم سوچو کہ بیوی کے ''ایام'' کے دوران ہمارا خیال تک بھی مقاربت کی طرف نہیں جاتا۔ لیکن ایک غیر مسلم اس میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ یہ کیوں ہے ؟ اس کے لئے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ان دنوں مقاربت جائز نہیں۔ اس لئے ہمارا خیال بھی اس طرف نہیں جاتا۔ یا مثلاً ایک غلط کار نوجوان جو غیر عورتوں تک پہنچنے میں اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے، راتوں کی تنہائی میں، اپنی جوان ہمشیرہ کے پاس سویا رہتا ہے حالانکہ اس وقت کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی طرف وہ نگاہ بد سے دیکھتا تک نہیں۔ یہ سب خیالات کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے* ؟ غالباً پچھلے سال کا ذکر ہے۔ اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا حال شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم رہتے تھے۔ (تم نے بھی شاید یہ واقعہ پڑھا ہو) ان کے ہاں نہایت خوبصورت دو تین بچے بھی تھے کہ ایک دن اتفاقاً ان کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔ ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ انگلینڈ میں ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ساتھ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ بھائی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس کی کوئی بہن ہے۔ اور بہن یہ نہیں جانتی تھی کہ اسکا کوئی بھائی ہے۔ اتفاق سے لڑائی کے بعد، وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا۔ اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو

---

* بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جن میں لوگ بہنوں بیٹیوں تک پر بھی دست درازی کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی حالات انتہائی درجہ کی مریض ذہنیت کے مظاہر ہوتے ہیں انسان کی عمومی کیفیت وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ''انتہائی درجہ کے مجرم'' تو مستثنیات میں سے ہوتے ہیں۔

گئی (جو اب جوان ہو چکی تھی) اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور برسوں تک انہیں اپنی سابقہ رشتہ داری کا علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہیں تھا۔

جس دن انہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان کی شادی کو آٹھ دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن اس بات کا علم ہونے کے بعد ان پر جو قیامت گزری ہے اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا تھا جو انہوں نے اخبارات کو دیئے تھے۔ ان کے کتنے دن رونے میں کٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟ بہرحال پادریوں نے ان کی تسلی تشفی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے!

یہ کیا تھا؟ صرف اس خیال کا اثر کہ بھائی بہن، ازدواجی رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ ایران کے شہنشاہ، کھلے بندوں اپنی بہنوں سے شادی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ہے خیالات کا اثر!

لہذا اگر ہم قرآن کریم کے اس تصور کو اپنے عقیدہ کا جزو بنا لیں کہ بیوی سے جنسی اختلاط صرف افزائش نسل کے لئے کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس مقصد کے علاوہ جنسی مقاربت کا خیال تک بھی نہیں آئے گا۔ اور ہم اس کے تصور سے اسی طرح دور بھاگیں گے جس طرح ’’ایام‘‘ کے دوران میں مقاربت کے خیال سے۔ ہمارے ہاں بیس پچیس برس ادھر تک (گاؤں میں بالخصوص) یہ خیال عام تھا کہ جب تک بچہ دودھ پیتا رہے، مقاربت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس پر لوگ اس شدت سے پابند تھے کہ اگر کسی سے اس کی خلاف ورزی ہو جاتی تھی تو وہ منہ چھپائے پھرتا تھا۔ ان تصریحات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جنسی جذبہ، انسانی خیالات کے تابع رہتا ہے اس لئے اس پر کنٹرول کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم جنسی جذبہ کے لئے ’’اضطراری حالت‘‘ کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ جہاں تک خوراک کا تعلق ہے وہ اضطراری حالت کے امکان کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی لئے اس نے ایسی حالت میں حرام تک کھانے کی اجازت دیدی ہے۔

لیکن جنسی تقاضے کے لئے اس نے اس کی کہیں اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس اس نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ...... (۲۴/۳۳) ”جو لوگ شادی کا سامان نہیں پاتے، انہیں ضبط خویش سے کام لینا چاہیئے“۔ یعنی اس نے یہ نہیں کہا کہ جس طرح کھانے کے معاملے میں اضطراری حالت میں حرام کھا لینے کی اجازت ہے اسی طرح ایسے شخص کے لئے بھی، جسے جائز طریق سے جنسی تسکین کا سامان میسر نہ ہو، حرامکاری کی اجازت ہے۔

یہ تھا جنسیت کا وہ تصور جو قرآن کریم نے پیش کیا تھا ذرا غور کرو کہ اس تصور کی رو سے قرآن کریم، انسانیت کو کس مقام پر لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب ہمارے ہاتھوں سے قرآن کریم کا دامن چھوٹ گیا تو جنسیات کے متعلق ہمارا تصور پست تریں سطح پر پہنچ گیا۔ ذرا سوچو کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ان کے سلاطین کے محلات میں دو دو تین تین ہزار ممتوعہ لونڈیاں ہوں۔ جن کے بازاروں میں عورتیں بھیڑ بکری کی طرح فروخت اور نیلام ہوتی ہوں۔ جو چار بیویوں کے لئے وجۂ جواز یہ قرار دیں کہ اس سے ایسا پروگرام مرتب ہو جاتا ہے جس میں کوئی شب مقاربت سے خالی نہیں رہ سکتی —— اور قیامت یہ کہ وہ ان چیزوں کو ”شریعت حقہ“ کے عین مطابق قرار دیں —— ان کے جنسی تصور کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ ہماری قوم کس حد تک جنسیات میں ڈوبی ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو تم طب یونانی کی کوئی کتاب (بلکہ کسی یونانی دواخانہ کی فہرست ادویات) اٹھاؤ اور دیکھو کہ اس میں کتنے فیصد دوائیاں جنسیات کے ذیل میں آتی ہیں؟ اسی جنسیت زدہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس قسم کے فتاویٰ دیئے جاتے ہیں کہ (مثلاً) اگر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کسی ایسے جزیرہ میں پہنچ جائیں جہاں کوئی تیسرا نہ ہو تو وہ آبادی کی طرف واپسی تک ”عارضی نکاح“ کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ ایک نوجوان جوڑا، چند دنوں کے لئے بھی،

جنسی اختلاط کے بغیر گزارہ کر سکتا ہے۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جس کی آسمانی کتاب جنسیات میں اضطراری کیفیت کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ وہ جنسیات کو اس مقام پر رکھتی ہے جو مقام اسے فطرت کے پروگرام کے مطابق ملا ہے۔ ہم نے جنسیات کو اس مقام سے اتار کر اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہے۔ اور پھر اسی کو اس کا صحیح مقام قرار دے کر اس سے پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے نکلتے ہیں! نتیجہ ظاہر ہے۔

ہمارا اپنا جنسی تصور یہ تھا۔ اس پر مغربی خیالات کے جھکڑ نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ یہ وہ آتش ویرانہ ہے جس کے نرغے میں ہماری موجودہ نسل گھری ہوئی ہے۔ اسے اس عذاب سے نجات دلانے کی شکل اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ

(i) جنسیات کے متعلق ہمارے قدیم مذہبی تصور میں بنیادی تبدیلی کی جائے اور

(ii) مغربی خیالات کے طوفان کو روکنے کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس کے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو قرآنی خطوط پر متشکل کریں اور معاشرہ کی عمارت، قرآنی بنیادوں پر استوار کریں۔

جو کچھ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) ضبط ولادت کا سوال اس لئے اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ ہمارے ملک کی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

(۲) اس مشکل مسئلہ کے حل کے دو گوشے ہیں۔

(i) ملک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھانے کا انتظام کیا جائے۔ اور

(ii) اگر اس کے بعد بھی ضرورت رہے تو افزائش نسل پر حد بندی عائد کر دی جائے۔

(۳) جھاں تک (i) کا تعلق ھے، اس کے لئے ضروری ھے کہ ملک میں قرآنی نظامِ ربوبیت رائج کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ ذرائع پیداوار قوم کی تحویل میں رھیں تاکہ جو منافع اس وقت افراد کے ھاں جمع ھو جاتا ھے وہ پیداوار کے اضافہ کے لئے صرف کیا جاسکے۔ اور

(ب) رزق کی تقسیم ضرورت کے مطابق مملکت کی زیر نگرانی ھو۔

(۴) جھاں تک شق (ii) کا تعلق ھے قرآن کریم کی رُو سے یہ چیز قابل اعتراض نھیں کہ اس قسم کی اجتماعی اور ھنگامی ضرورت کے لئے افزائش نسل پر پابندی عاید کر دی جائے۔ فطرت نے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کو انسان کی مرضی کے تابع رکھا ھی اس لئے ھے کہ اسے افزائش نسل پر کنٹرول رھے۔ یہ اس معاملہ میں حیوانات کی طرح بے بس اور مجبور نھیں۔

(۵) لیکن برتھ کنٹرول (ضبط ولادت) کا طریقہ سیلف کنٹرول (ضبط خویش) ھے۔ آلات و ادویات کے ذریعہ ایسی شکل پیدا کرنا، جس سے لذت حاصل ھو جائے لیکن استقرار حمل نہ ھو، جنسی اختلاط کے فطری مقصد کے خلاف ھے۔ جنسی اختلاط افزائش نسل کے لئے ھے نہ کہ حصول لذت کے لئے۔ اگر افزائش نسل مقصود نہ ھو تو اختلاط بے محل ھوجاتا ھے۔

(۶) اس قسم کا ضبط خویش، ناممکن تو ایک طرف، ذرا بھی مشکل نھیں۔ جنسی جذبہ انسانی خیالات کے تابع رکھا گیا ھے۔ اگر اس طرح خیال نہ کیا جائے تو یہ جذبہ بیدار ھی نھیں ھوتا۔

(۷) اس کے لئے ضروری ھے کہ

(i) جنسیات کے متعلق صحیح قرآنی تصور عام کیا جائے۔

(ii) معاشرہ میں عورت کو وہ عزت کا مقام دیا جائے جس سے وہ جنسی جذبہ کی تسکین کا ذریعہ متصور ھونے کے بجائے وجہ تکریم انسانیت سمجھی جائے۔

(iii) ان تمام اسباب و ذرائع کو سختی سے روکا جائے جو جنسی جذبہ کی بیداری کو عام کر رہے ہیں—جنسی اشتعال پیدا کرنے والی فلمیں، تصاویر، لٹریچر، آرٹ، نمود حسن اور عریانیت کے مظاہر، وغیرہ وغیرہ—اور

(vi) تعلیمی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کیا جائے۔

اس طرح نہ صرف یہ کہ ضبط ولادت کا مسئلہ ہی آسان ہو جائے گا بلکہ قوم کے پاس اس قدر عظیم توانائیاں محفوظ ہو جائیں گی جن سے ہر تعمیری پروگرام بطریق احسن تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کی بتائی ہوئی یہ وہ حقیقت ہے جس کی شہادت مغرب کے محققین بھی دے رہے ہیں۔ میں تمہیں اس سے پہلے ایک خط میں تفصیلاً بتا چکا ہوں کہ جنسیات کے مشہور محقق۔ ڈاکٹر (J. D. Unwin) نے اپنی کتاب (Sex and Culture) میں اپنی تحقیقات کے نتائج کس وضاحت سے پیش کئے ہیں۔ اس مقام پر اس کے دو اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔ تم دیکھو کہ وہ جنسی توانائی کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے

> کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کردیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دئیے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ (صفحہ ۳۱۳)

وہ اپنی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک، قائم اور آگے بڑھتی رہیں، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نَو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے

> اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن میں معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع، ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کم از کم حد تک محدود رہیں ۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائیگا ۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہونگی ۔ وہ تہذیب و تمدن کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی معاشرہ نہیں پہنچ سکا ۔ اور انسان کی توانائیاں ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں نہیں آ سکتا ۔ (صفحہ ۴۳۲)

لیکن یہ بات سلیم! ابھی انسان کی سمجھ میں شاید ہی آسکے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ابھی تک بالعموم انسانی قامت نصیب ہی نہیں ہوسکا ۔ یہ ابھی تک (بہ ہیئت مجموعی) حیوانیت کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے ۔ بلکہ اس کی سطح حیوانوں سے بھی پست ہے ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(۱) فطرت نے حیوانات کے جنسی جذبہ پر خود (Safety Valve) لگا دیا ہے وہ اسے اس وقت بیدار کرتی ہے جب ان سے اولاد پیدا کرانا مقصود ہوتا ہے ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ حیوانات خاندانی منصوبہ بندی (Family Planning) نہیں کر سکتے ۔ انہیں اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا ۔ لیکن اس عدم اختیار کا انہیں فائدہ یہ ہے کہ ان کی اس قدر قیمتی توانائی ضائع نہیں ہوتی ۔ کیونکہ وہ محض لذت کی خاطر جنسی اختلاط پر قادر ہی نہیں ۔

(۲) انسان کو فطرت نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ (Family Planning) کر سکے ۔ یعنی وہ اس باب میں حیوان کی طرح مجبور نہیں کہ جب فطرت چاہے اس سے اولاد پیدا کرالے ۔ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے (Planning) کے مطابق اولاد پیدا کرے ۔ یہ فطرت کی بہت بڑی بخشائش تھی جس سے اس نے انسان کو نوازا تھا ۔

(۳) لیکن انسان کیا کرتا ہے؟ یہ (Family Planning) نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے یہ اپنے آپ کو حیوانات کے درجے تک رکھتا ہے۔ یعنی وہ فیملی پلاننگ کر نہیں سکتے۔ یہ کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ لیکن یہ اس کے ساتھ ہی اپنی اس قدر قیمتی توانائی کو محض حصول لذت کے لئے ضائع کرتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ حیوانات سے بھی پست درجہ پر ہے۔ وہ فیملی پلاننگ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی توانائی کو تو محفوظ رکھ سکتے ہیں! یہ اپنے اختیار کے غلط استعمال سے دھرے نقصان میں رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایسے انسانوں کے متعلق جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے کہا ہے کہ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) یہ حیوانات کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ دوسری جگہ ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ...... (۹۵/۴-۵) ہم نے انسان کو بہترین توازن کے ساتھ حسین ترین ہیئت سے پیدا کیا تھا۔ لیکن (یہ جو کچھ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہم اسے پست سے پست ترین سطح تک لے جاتے ہیں ــــ کیا یہ انسان کی پست ترین سطح نہیں کہ فیملی پلاننگ کی جو امکانی صلاحیت اسے خصوصیت سے عطا ہوئی تھی، یہ اس سے تو فائدہ نہ اٹھائے اور اپنے اختیار کے بیجا استعمال سے اپنی توانائیوں کو ضائع کرکے حیوانات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نقصان میں رہے؟ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳/۱-۲) زمانہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنا نقصان کیا ہے۔

کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فیملی پلاننگ کا تعلق عقل و فکر (Reason) سے ہے اور جنسی لذت کے حصول کا تعلق جذبات سے۔ جب بھی انسان عقل و فکر کو جذبات کے تابع رکھے گا، نقصان اٹھائے گا۔ لیکن جب جذبات سے عقل و فکر کی راہ نمائی میں کام لے گا، کامیاب ہوگا۔ قرآن کریم یہی سکھانے کے لئے آیا تھا کہ جذبات کو کس طرح عقل و فکر

کے تابع رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کی ساری (Problems) تین ہیں — زر، زمین، زن — انسان نے ان تینوں معاملات میں، جذبات کو عقل و فکر (یا یوں سمجھو کہ حصول لذت کو ضرورت) پر غالب رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے معاشرہ میں فساد ہی فساد رونما ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے ان تینوں (اہم ترین اور مشکل ترین) مسائل کا حل ایک ایک فقرہ میں کر دیا۔ اس نے کہا کہ زر (دولت) مبادلۂ اشیاء کا آسان ذریعہ ہے اس سے یہی کام لینا چاہیئے۔ اسے ہوس زر اندوزی یا لذت اقتدار کی خاطر جمع کرتے رہنا اس کا بڑا غلط استعمال ہے اس نے کہہ دیا کہ صحیح معاشی نظام وہ ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔ اس سے اس نے "زر" سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد کا علاج کر دیا۔ یعنی اس نے زر کو ضرورت کی شے قرار دیا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

زمین کے متعلق اس نے کہا کہ یہ نوع انسان کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتی ہے اسلئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھنا چاہیئے۔ اس (ذریعۂ رزق) کو ذاتی ملکیت میں لے لینا، تاکہ دوسرے انسان تمہارے دست نگر ہو جائیں اور یوں تم حکومت کرنے کے جذبہ کی تسکین کر سکو، بہت بڑا ظلم ہے ("ظلم" کے معنی ہیں کسی شے کو اس مقام پر رکھنا جس کے لئے اسے بنایا نہیں گیا)۔ اس نے زمین کو بھی ضرورت کے لئے استعمال کرنا سکھایا۔ جذبات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

اسی طرح اس نے "زن" کے متعلق کہہ دیا کہ جنسی اختلاط سے مقصد اولاد پیدا کرنا ہے، نہ کہ محض لذت حاصل کرنا۔ یہاں بھی اس نے جذبات کو ضرورت کے تابع رکھا ہے۔ اس نے اس طرح اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔

زر اور زمین کے متعلق انسان رفتہ رفتہ قرآنی تصور کی طرف آرہا ہے لیکن زن کے متعلق ابھی اس نے اپنے نظریہ میں تبدیلی کا احساس نہیں کیا۔ اگرچہ یہ مسئلہ اس کے لئے وبال جان بن رہا ہے۔

جس دن انسان نے فطرت کا یہ راز پا لیا کہ انسان کو جنسی جذبہ پر اختیار و ارادہ اس لئے دیا گیا ھے کہ وہ افزائش نسل کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکے اور جنسی اختلاط سے مقصود افزائش نسل ھے ، نہ کہ محض حصول لذت ، وہ دن انسانیت کی تاریخ میں عظیم انقلاب کے آغاز کا دن ھوگا — دیکھیں یہ سعادت سب سے پھلے کس قوم کے حصے میں آتی ھے ؟

جی چاھتا ھے کہ یہ سعادت پاکستان ھی کے حصے میں آئے ۔

لیکن ظاھر ھے کہ اس پروگرام کی تکمیل میں وقت لگے گا ۔ اس لئے اگر ھمارے حالات کا تقاضا یہ ھو کہ ملک کی بڑھتی ھوئی آبادی کی فوری روک تھام کی جائے تو بامر مجبوری کچھ وقت کے لئے ضبط ولادت کی ایسی تدابیر اختیار کی جاسکتی ھیں جو مضر صحت نہ ھوں ۔ لیکن اس صورت میں اس پر کڑی نگرانی کی جانی ضروری ھے کہ یہ چیزیں ان ھاتھوں تک نہ پہنچنے پائیں جو ان کا ناجائز استعمال کریں ۔ اگر ھمارے ھاں اسلامی آئین نافذ ھوگیا تو اس وقت انسداد فحش کاری کے لئے محکم تدابیر اختیار کی جانی ضروری ھوں گی ۔ یہ چیز بھی اسی ذیل میں آئے گی ۔

لیکن یہ محض ھنگامی تدبیر ھوگی ۔ مستقل اور مطابق منشائے فطرت وھی تدبیر ھوگی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ھے ۔ یعنی جنسی اختلاط کو صرف اولاد پیدا کرنے کے لئے صحیح سمجھنا ۔ جیسا کہ کہا جا چکا ھے یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ھو سکے گی ۔

یہ ھے سلیم ! ضبط ولادت کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل ۔

اچھا خدا حافظ ! اس کے بعد دیکھئے کب ملاقات کا موقعہ ملتا ھے ۔ طاھرہ بیٹی سے بہت بہت دعا کہنا اور جاوید میاں کو دیدہ بوسی ۔ اللہ اس قرآنی گھرانے پر اپنے سحاب کرم کی بارش کرے ۔

والسلام

پرویز

جولائی ۱۹۶۰ء

پرویز صاحب کا ایک اور بے مثال شاھکار

انسان نے کیا سوچا؟

کائنات ۔ سیاسیات ۔ معاشیات ۔ اخلاقیات ۔ تہذیب و تمدن ۔ مذھب وغیرہ کے متعلق سقراط سے لیکر عصرحاضر کے مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں کی تحقیق کا مجموعہ ۔

پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراج تحسین!

فاضل مصنف چوھدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ھی کے لئے قابل مطالعہ نہیں بلکہ اس کا انداز تحریر اس قدر سلجھا ھوا ھے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیش نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ھونا چاھئیے ۔ اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دین حق سے قرب پیدا ھوگا ۔

——— روزنامہ ‘‘نوائے وقت’’ لاھور

مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرین عالم کے خیالات کو ترتیب دیکر ایک واضح تصویر پیش کی ھے ۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ھے اور انہیں اس گمراھی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ھے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذھان میں پیدا ھو رھی ھے ۔ چارسو صفحات کی یہ کتاب ھزاروں کتابوں کا نچوڑ ھے اور فاضل مصنف کے تبحر علمی کا ثبوت ۔

——— ‘‘قندیل’’ ویکلی لاھور

ٹائپ کی حسین طباعت—عمدہ سفید کاغذ—مضبوط جلد اور دیدہ زیب گرد پوش سے مزین
قیمت—بارہ روپے (علاوہ محصولڈاک)

شائع کردہ:— ادارۂ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۔ لاھور
ملنے کا پتہ:— مکتبہ طلوع اسلام ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ لاھور

پرویز صاحب کا ایک اور بے مثال شاہکار

انسان نے کیا سوچا؟

کائنات، مابعدالطبیعات، نفسیات، اخلاقیات، تہذیب و تمدن، معاشیات وغیرہ کے متعلق سقراط سے لیکر عصر حاضر کے مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں کی تحقیق کا مجموعہ۔

(پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراج تحسین)

فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف طلباء و اساتذہ ہی کے لئے قابل مطالعہ نہیں بلکہ اس کا انداز تحریر اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیش نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہئیے۔ اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دین حق سے قرب پیدا ہوگا۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

مصنف نے نہایت جامع اور پر زور انداز میں مفکرین عالم کے خیالات [illegible] کی واضح تصویر پیش کی ہے۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں اس گمراہی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب عمدہ کتابت کا نمونہ ہے اور فاضل مصنف کے تبحر علمی کا ثبوت۔

"[illegible]" ویکلی لاہور

[illegible] مضبوط جلد اور دیدہ زیب گرد پوش سے مزین [illegible] (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ۔ لاہور

[illegible] مکتبہ طلوع اسلام [illegible] لاہور

Author Parv
Title S
MH1 P

تصنیفات علامہ پرویز

		صفحات	
اسباب زوال امت	عام کتابی سائز	۱۷۶	2 0 0
اسلامی نظام	” ”	۱۸۱	2 0 0
اسلامی معاشرت	” ”	۱۹۲	2 0 0
اقبال اور قرآن	” ”	۲۵۶	2 0 0
طاہرہ کے نام حصہ اول	” ”	۲۲۴	2 0 0
طاہرہ کے نام حصہ دوم	” ”	۲۶۴	2 8 0
اسلام میں قانون سازی کا اصول	” ”	۲۳۰	2 8 0
نظام ربوبیت	سائز ۱۸ × ۲۳ / ۸	۲۹۶	4 0 0
شعلۂ مستور	” ۲۲ × ۲۹ / ۸	۲۷۲	6 0 0
جوئے نور	” ”	۳۰۴	6 0 0
برق طور	” ”	۳۲۰	6 0 0
سلیم کے نام حصہ اول	” ۱۷ × ۲۷ / ۸	۴۰۸	8 0 0
” ” حصہ دوم	” ”	۳۳۰	6 0 0
” ” حصہ سوم	” ”	۴۰۰	6 0 0
ابلیس و آدم	سائز ۲۲ × ۲۹ / ۸	۳۷۶	8 0 0
من و یزداں	” ”	۴۳۸	10 0 0
انسان نے کیا سوچا	” ”	۴۳۹	12 0 0
معراج انسانیت	” ”	۸۳۲	20 0 0
لغات القرآن جلد اول	سائز ۲۰ × ۲۶ / ۸	۵۰۰	15 0 0

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷ - بی – شاہ عالم مارکیٹ – لاہور

Title Printed at All-Meezan Printing Press, Lahore.